ہندستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ماہنامہ

نیا ادب

خاص نمبر

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

جلد ۱۱ نمبر ۱-۲

ادارہ

سردار جعفری

کرشن چندر

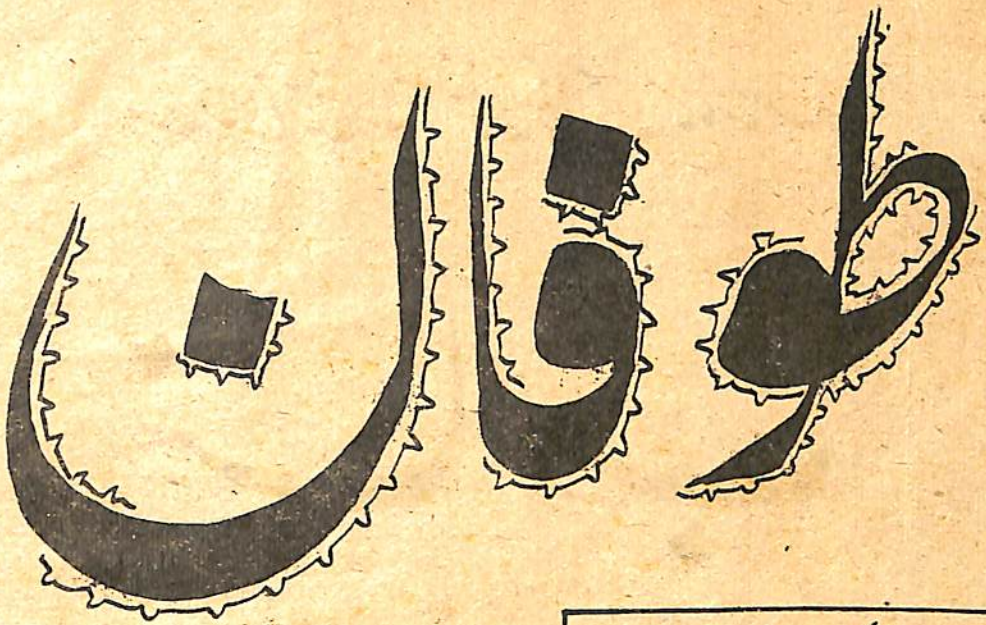
احمد عباس

کتب پبلشرز لمیٹڈ

ریگل بلڈنگ اپالو بندر بمبئی ۱

سالانہ چندہ آٹھ روپے قیمت فی پرچہ بارہ آنے

ششماہی ساڑھے چار روپے قیمت خاص نمبر ڈھائی روپے



جسے عصمت چغتائی نے لکھا ہے

اور

شاہد لطیف ڈائرکٹ کر رہے ہیں

اداکار

دلیپ کمار اور کامنی کوشل

میوزک

انیل بسواس

انڈین نیشنل پکچرس لمیٹڈ

نیشنل ہاؤس ۔ اپالو بندر ۔ بمبئی

نیا ادب

خاص نمبر ۱۹۴۹ء

آزادی کی منزلیں

مرتبہ

کیفی اعظمی
سردار جعفری
کرشن چندر
احمد عباس

فہرست

حرفِ آغاز

نیا ادب کا یہ خاص نمبر جس کا نام "آزادی کی منزلیں" ہے آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ آپ کے ہاتھ میں ایک کتاب نہیں ہے
بلکہ ایک تحریک ہے، ایک انقلاب ہے۔ جس کے سینے میں کروڑوں دل دھڑک رہے ہیں۔ جب آپ اس کتاب کو پڑھیں گے تو یہ کروڑوں دل اس کے
اوراق سے اچھل کر آپ کے پہلو میں آجائیں گے، اور آپ اس خون کی حرارت کو محسوس کریں گے۔ جس نے ایک صدی تک ہماری تاریخ کی رگوں میں گردش
کی ہے۔ جو آج بھی گردش کر رہا ہے۔ جس کے شعلے آج بھی تابناک ہیں۔

یہ نوّے برس کے اردو ادب کا انتخاب ہے۔ جس کے صفحات پر آپ کو ہماری تحریک آزادی کی ہر منزل اور ہر موڑ کی تصویر نظر
آئے گی۔ یہ ہماری سیاسی اور سماجی تاریخ کی جذباتی ترجمانی ہے۔ یہ انتخاب ان فرقہ پرستوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ جو اردو زبان کو غیر ملکی، غیر قومی
اور غیر ہندوستانی کہہ کر صرف بدنام ہی نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اس کا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں۔ یہ ان رجعت پرستوں کے لئے ایک تازیانہ ہے جو ادب اور سیاست
کے گہرے رشتے کو توڑ کر ہمارے ادب کی رگوں سے خون نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ جدید اردو ادب ابتدا سے ہندوستان کی سیاسی تحریک کا ہم سفر ہی نہیں بلکہ
بہت سی منزلوں پر اس کا راہبر بھی رہا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے ادیب حالی، شبلی، آزاد، اور اقبال کی طرح اپنے اپنے زمانے کی سیاسی تحریکوں سے
وابستہ رہے ہیں۔ ہم بھی آج وہی فرض انجام دے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اردو زبان کا گلا گھونٹنے کے معنی صرف تہذیب کشی ہی نہیں بلکہ سیاسی
روایات کا قتل ہے۔ یہ اپنی تحریک آزادی سے غداری ہے۔ جمہور دشمنی ہے اور شہیدوں کے خون کی توہین ہے۔ اسی لئے ہمیں یقین ہے کہ دنیا
کی کوئی طاقت ہماری زبان کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہ انتخاب اس کا ثبوت ہے کہ اردو زندہ اور جاندار زبان ہے اور ایک دن وہ انگلیاں ٹوٹ جائیں گی
جو اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

یہ انتخاب ایک ہزار صفحوں کا تھا جس میں سے صرف ڈھائی سو صفحے آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے بہت سی اہم چیزیں چھوٹ
گئی ہیں۔ کئی ممتاز ادیبوں کی نمائندگی نہیں ہو سکی ہے۔ جس کی ہم معذرت چاہتے ہیں۔ ان میں خاص طور سے قابل ذکر سجاد ظہیر، سبط حسن، جذبی
علی عباس حسینی۔ عبادت بریلوی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ اختر رائے پوری۔ وشوامتر عادل، ہنسراج رہبر، اوپندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ اور اختر الایمان
ہیں۔ جو چیزیں ہم اس مجموعے میں شامل کر سکتے تھے جگہ کی تنگی یا وقت نہ ملنے کی وجہ سے رہ گئیں۔ ان میں خاص طور سے سجاد ظہیر کا رپورتاژ "
منشی پریم چند کا خطبۂ صدارت۔ "ادب کی غرض و غایت" سبط حسن کے مضامین "سنہری آزادی" اور "جنگ اور ادیب" سردار جعفری کا مقالہ
"سرخ ستارہ" نظم "شاہراہ حیات" "جشن آزادی" احمد ندیم قاسمی کی کہانی "ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد" ممتاز حسین کی کہانی
"سپاہی کی واپسی" پریم دھون کے گیت "اب نہ گاڑی چلے" اور "آئے تین مداری" کیفی اعظمی کی نظم "خانہ جنگی" اور "مارشل پلان" اوپندر
ناتھ اشک کا ڈرامہ "طوفان سے پہلے" مجاز، احمد ندیم قاسمی اور جذبی کی پندرہ اگست سے متعلق نظمیں، احمد عباس کا افسانہ "میں کون ہوں" سعادت
حسن منٹو کا افسانہ "کھول دو" اور مضمون "مجبوس عورتیں" ساحر لدھیانوی کا مضمون "مجبوس عورتیں" مجاز اور دانش کی گاندھی جی کی شہادت پر
نظمیں۔ نیاز حیدر کی نظم "من و تو" سردار جعفری، مخدوم محی الدین اور وشوامتر عادل کی تلنگانہ پر نظمیں اور کرشن چندر، ہنسراج رہبر اور مہندر ناتھ
کی چند کہانیاں ہیں۔ ہم نے اس انتخاب کے لئے خاص طور سے ایک مقالہ ممتاز حسین سے لکھوایا تھا۔ وہ بھی جگہ کی تنگی کی وجہ سے رہ گیا۔ ہم ان تمام احباب
سے معذرت چاہتے ہیں۔ جن کی چیزیں اس میں شامل نہیں ہو سکی ہیں۔ یا جن کی بعض چیزیں رہ گئی ہیں۔ ہم ان تمام احباب کے شکر گذار ہیں جن کے مضامین

نثر و نظم اس پرچے میں شائع ہو رہے ہیں۔

جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہم ڈراموں، ناولوں اور تنقیدی مقالوں، کو بھی شامل نہیں کر سکے اور یہ اس پرچے کی بہت بڑی کمی ہے۔ اس پرچے میں ہماری تحریک آزادی پر ایک سیاسی مضمون کی بھی کمی ہے جو دیباچے کی شکل میں آنا چاہیے تھا۔ ہم نے ڈاکٹر اشرف سے یہ مقالہ لکھوانے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن اسی دوران میں وہ بیمار ہو گئے۔ پھر پاکستان کی حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا۔ اور اب وہ انگلستان میں ہیں۔ پھر بھی جب آپ اسے شروع سے آخر تک پڑھیں گے تو آپ کو جذبات اور احساسات کا ایک بڑھتا ہوا سیلاب نظر آئے گا۔ جس کی گونج اور گرج میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور آپ یہ محسوس کریں گے کہ اردو ادب صحیح سمت میں ترقی کر رہا ہے۔ اور اس ترقی کی رفتار بہت تیز ہے۔ صرف موضوع ہی نہیں بلکہ ٹکنیک کے اعتبار سے بھی ہمارا ادب آگے بڑھا ہے۔

ترتیب میں ہم نے نظموں، افسانوں اور مضامین کی تاریخ اشاعت سے زیادہ سیاسی ادوار کو اہمیت دی ہے اس لئے ہم نے ایک ایک عنوان کے تحت وہ تمام چیزیں شامل کر لی ہیں جو مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ اس کی وجہ سے بعض جگہ تاریخ وار ترتیب میں فرق آگیا ہے جو ناگزیر تھا۔

آخر میں ہم کیفی اعظمی کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اس مجموعے کے انتخاب اور ترتیب میں سب سے زیادہ کام کیا ہے ان کی محنت اور جانفشانی کے بغیر نیا ادب کا یہ شاندار نمبر شائع نہیں ہو سکتا تھا۔

ادارہ

دیباچہ

احتشام حسین
جوشؔ ملیح آبادی
ساغرؔ نظامی
کرشن چندر
عصمت چغتائی
اسرار الحق مجازؔ
مخدوم محی الدین
وغیرہ

سید احتشام حسین

اردو ادب میں آزادی کا تخیّل

تمام فنونِ لطیفہ کی تہہ میں قیود کو توڑنے، پابندیوں کو ٹھکرانے، رسم پرستیوں سے چھٹکارا پانے اور ایک مخصوص قسم کی فنی آزادی سے کام لینے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ باتیں فنکار کے شعور میں اسکی ہیجان اور اس کے احساس میں اس شدت کی سطح میں جو تقلید، غلامی اور محکومیت کے خلاف اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ فن کے ذریعہ سے زندۂ جاوید بن جانے کی جو خواہش ہے وہ بھی اسے محدود سے نکال کر لامحدود میں مل جانے ہی کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ لامحدودیت مواد اور ہیئت دونوں میں رونما ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔ ایک مفکرانہ اور فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھنے والے فنکار کے فن میں اس خواہش کا ظہور زیادہ تر خیالات کی تنظیم، ترتیب اور تشکیل میں یا زندگی کی گتھیوں کا حل تلاش کرنے میں ہوتا ہے اس کے برعکس جمالیاتی اور صرف جمالیاتی یا فنی احساس رکھنے والے فنکار کے یہاں یہ جذبۂ آزادی اور لامحدودیت عام طور سے ہیئت کے تجربوں اور اسالیبی جدتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے ادب میں آزادی کے تصور پر بحث لازمی طور پر ایک فلسفیانہ شکل اختیار کرے گی جس میں آزادی کے مفہوم اور عناصر کا تجزیہ کر کے ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ افراد کی آزادی کے مطلق تصور سے لے کر جماعت کی آزادی تک کے بہت سے مدارج ہیں جن کے متعلق فلسفیوں کے یہاں اچھی خاصی آویزش، اختلاف اور تضاد کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی کے یہاں آزادی کا مطلب ایسی آزادی ہے جس میں ہر شخص ہر بات اور ہر خیال کو عملی جامہ پہنانے کا خیال رکھتا ہو، کسی کے یہاں جبر سے آزادی پیدا ہوتی ہے کوئی جبلی قوتوں کے اظہار کو آزادی کہتا ہے، کسی کے نزدیک یہ محض ایک تصور ہے اور عمل کی زندگی میں آزادی ممکن ہی نہیں ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ فرد کی آزادی کو جماعت کی آزادی میں ضم ہو جانا چاہئے یوں اس مسئلے کے متعلق لاتعداد فلسفیانہ اور نیم فلسفیانہ تصورات پیش کئے گئے ہیں جن میں سے اکثر محض خیالی اور مابعد الطبیعیاتی حیثیت رکھتے ہیں کشمکشِ حیات کے عملی پہلوؤں کو متوازن رکھنے میں ان سے مدد نہیں ملتی۔

ادبیات میں جب آزادی کا ذکر آتا ہے تو اس کی نوعیت بھی فلسفیانہ ہو جاتی ہے کیونکہ ہر ادیب ایسے اہم تصورات کا تذکرہ کرتے وقت کسی نہ کسی فلسفہ کی پناہ لیتا ہے اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ ادیب کا تعلق جس طبقہ سے جس زمانے اور ماحول سے ہوتا ہے اسی کی آواز ادیب کے لفظوں میں گونجتی اور اسی کا دل ادیب کے جملوں میں دھڑکتا ہے۔ آزادی کا صحیح ادراک اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک نفسیات تاریخ اور معاشیات کا ٹھیک ٹھیک علم کسی شخص کو نہ ہو خیال کی آزادی کا تصور ہمیں نفسیات، مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کے مباحث میں الجھاتا ہے اور عمل کی آزادی کا تصور ہم سے مادہ کی نشو ونما، حرکت، ارتقاء اور تغیرات کے سمجھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ چونکہ یہ باتیں پیچیدہ ہیں اس لئے ایسے ادیب اور شاعر دنیا میں کم ملتے ہیں جو آزادی کے صحیح منطقی تصور کو ادبی اور فنکارانہ انداز میں پیش کر سکیں، ہوتا یہ ہے کہ ایک طرف ان کی انسان دوستی اور ترقی کی طرف بڑھنے کی خواہش انھیں آزادی کا گیت گانے پر مجبور کرتی ہے تو دوسری طرف ان کی طبقاتی زندگی اور دوسرے فلسفیانہ روابط ان کی خواہش کی راہ متعین کرتے ہیں۔

اردو ادب کی عمر بہت بڑی نہیں، لیکن اس میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی کمی نہیں جن کا نقطۂ نظر فلسفیانہ تھا اور کسی نہ کسی حیثیت سے وہ نفسیات اور اخلاقیات کے باریک اور دقیق نکات کی نقاب کشائی کرتے تھے، کبھی ان کی نظر اپنے ہی سے الجھ کر رہ جاتی تھی۔ اور کبھی سارے جہاں کا درد ان کے دل میں ہوتا تھا اور اپنی خوشی میں کائنات کی خوشی اور اپنے غم میں کائنات کا غم دیکھتے تھے، اس سے ہر شخص واقف ہے کہ اردو ادب کی ابتدا اور ابتدائی ترقی اس جاگیردارانہ تمدن کے دور میں ہوئی جب ایک طرف شہنشاہیت اور بادشاہت، مطلق العنانی اور تقدیر پرستی کے تصورات مستقل قدروں

کی حیثیت رکھتے تھے، دوسری جانب صوفیانہ اثرات، بڑے چھوٹے، امیر غریب یہاں تک کہ نیک و بد کی تفریق ختم کر کے انسانی نگاہ کو ایک خاص گہرائی اور قلب کو ایک خاص وسعت عطا کر رہے تھے۔ یہ دورنگی بار بار اپنا رنگ دکھلاتی رہتی ہے۔ غزل میں سب کچھ ملتا ہے لیکن قصیدے میں شعرائے تصوف کے ان اثرات کا عکس بھی پیدا نہیں ہونے دیتے۔

تاریخی تسلسل کے اعتبار سے تو بعض قدریں اس دور اور عہد جدید میں مشترک ہیں لیکن اگر اردو ادب کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو آزادی کے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ہندوستان کی تاریخ فطری طور پر غدر کے قریب آکر تغیر و انقلاب کا زبردست منظر پیش کرتی ہے اور ان قدروں کو جنم دیتی ہے جو ماضی سے رشتہ رکھنے کے باوجود تقریباً بالکل نئی ہیں۔ تاریخ یا ادب میں میکانکی نقطۂ نظر اپنے بنائے راستہ کا تصور ہمیشہ غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے۔ جس طرح کوئی تاریخی دور کو دہرا نہیں سکتا اسی طرح کوئی ادبی دور دوبارہ جنم نہیں لے سکتا۔ بعض ظاہری مشابہتیں۔ بعض باطنی روابط اور قدیم زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی اور ادب کے تسلسل کے باوجود ہر موڑ ایک نئی شاہراہ کی جانب لے جاتا ہے جہاں سے پھر واپسی نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر اردو ادب کے ایک حصے کا مطالعہ غدر کے قبل کے ادب کی حیثیت سے اور دوسرے حصے کا مطالعہ عہد جدید کے ادب کی حیثیت سے کیا جائے تو آزادی کے بدلے ہوئے تصورات کے آئینہ میں بحث کے سارے خط و خال واضح ہو سکتے ہیں۔

اردو ادب مغلوں کے زوال کے زمانے میں پروان چڑھا اس لئے اس میں زوال کے نشانات کے ساتھ ساتھ ایرانی تمدن اور شاعری کی روایات اور تصوف کے اشارات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ ثنویت یا ذہن کی دہری کیفیت اس دور کی ایسی خصوصیت ہے جسے زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کی غلامی کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی کے وہ تصورات بھی ملتے ہیں جن کے ڈانڈے نراج اور بے آئینی سے مل جاتے ہیں شعرائے تصوف کے زیر اثر مادی زندگی کے تمام تعینات کو توڑ کر حقیقت کبریٰ سے مل جانا چاہتے ہیں۔ جو ہر قید و بند سے آزاد اور لامحدود ہے۔ وہ شریعت کی پابندیوں کو ایک معمولی طلسم سمجھ کر پاش پاش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کی راہ میں کوئی اخلاقی قدر حائل نہ ہو تاکہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے مقصود حیات کو ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑے ہوں، وہ مسجدوں اور عبادت گاہوں کو شراب خانوں اور میکدوں میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ مذہب اور خدا سے بیزاری کا اظہار کر کے اپنی انفرادیت کو اہمیت دینا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں کبھی کبھی وہ خدا بننا چاہتے ہیں اور کبھی انھیں خدا بنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ عجیب وغریب انفرادیت چونکہ محض خیالی ہوتی ہے اس لئے اہم ہونے کے باوجود اہم نہیں رہ جاتی اور آخری منزل تک پہونچتے پہونچتے اس کا ٹوٹ جانا بھی لازمی ہو جاتا ہے۔

آزادی کے اس انوکھے تصور کو سمجھنے کے لئے اس ذہن اور نفسیات کا سمجھنا ضروری ہے۔ جسے جاگیرداری تمدن کے زوال نے پیدا کیا تھا اور جس کو صوفیانہ روایات نے سہارا دے کر زندہ رکھا تھا۔ یہ انفرادیت جس کا ذکر ہمیں اس دور میں ملتا ہے اس انفرادیت سے مختلف ہے جسے سرمایہ داری پیدا کرتی ہے جہاں شخصی آزادی کا تصور مقابلہ اور مسابقت کی صورت اختیار کر کے سارے ذرائع پیداوار چند افراد کے ہاتھوں میں پہونچا دیتا ہے اور وہ چند افراد کروڑوں انسانوں کی زندگی سے کھیلنا آزادی کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہ انفرادی آزادی کا تصور اس سے بھی مختلف ہے۔ جس کا تصور ہم جمہوری نظام میں کرتے ہیں جہاں انفرادی آزادی اور اجتماعی آزادی میں ایک خاص قسم کا توازن قائم کیا جاتا ہے۔

اس دور کے شعر و ادب میں جماعتی یا ملکی آزادی کا تصور تقریباً مفقود ہے کیونکہ ایشیائی ممالک میں قومی زندگی، سیاسی وطن پرستی یا ملکی آزادی کے خیالات بہت دیر میں پیدا ہوئے۔ اس کے تاریخی اسباب ہیں جن کے تذکرے کا موقع نہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ کبھی کبھی آزادی کی بھی ترنگ، جو عام طور سے انفرادی آزادی کے تصور پر مبنی ہوتی تھی۔ انسانیت دوستی کی شکل اختیار کر کے انسانوں کی پابندیوں، مجبوریوں اور تکلیفوں پر آنسو بہاتی تھی لیکن نہ تو اس کا حل سوچ سکتی تھی۔ اور نہ بغاوت و انقلاب کے وہ جذبات ابھارتی تھی جن کی مدد سے انسان اپنی تقدیر بدل دیتے

ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کا تعلق محض خیال سے نہیں بلکہ مادی زندگی سے ہے۔ زندگی بسر کرنے کے ان طریقوں سے ہے جن میں ایک انسان دوسرے انسان کے مقابل آتا ہے، ایک جماعت دوسری جماعت سے ٹکر لیتی ہے اور کبھی کبھی مقاصد اور مذاہب کے تصادم کی شکل اختیار کر لیتی ہے جب غور سے دیکھا جائے تو عام طور سے اس کی تہہ میں اقتصادی غلامی اور معاشی استحصال کی کارفرمائی ہوتی ہے جس کے خلاف آزادی کی آواز بلند کی جاتی ہے، مادی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے، آسودگی حاصل کرنے اور بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے جو جدوجہد ہوتی ہے وہ آزادی کی جدوجہد کہی جاسکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ جدوجہد غیر ملکی حکومت کے خلاف ہو بلکہ اپنے ہم قوموں ہی کے خلاف ہو سکتی ہے۔ کیونکہ طبقاتی تقسیم ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کی معاشی غلامی پر مجبور کرتی ہے اس طرح آزادی کی اس جدوجہد کی دو شکلیں ہو جاتی ہیں۔ —— سیاسی آزادی اور معاشی آزادی —— لیکن یہ دونوں ایک ہی جدوجہد کے دو رخ ہیں ایک غلام ملک میں اس کی نوعیت سیاسی طور پر زیادہ نمایاں ہوتی ہے گویا سیاسی آزادی کے ساتھ معاشی آزادی کا تصور اس طرح گتھا ہوا ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے، غلام ملکوں میں یہ جدوجہد ساتھ چلتی ہے کیونکہ معاشی آزادی کی خواہش ہی سیاسی آزادی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد خلا میں نہیں ہو سکتی۔

ہندستان کی غلامی کی ابتدا اٹھارہویں صدی میں ہوئی۔ اور انیسویں صدی کے وسط تک اس کی تکمیل ہو گئی۔ معاشی استحصال نے معاشی اور سیاسی غلامی کی شکل اختیار کر لی اور ہندستانی زندگی کے وہ سارے سوتے ہندستانیوں کے لئے خشک ہو گئے۔ جن سے ملک کے دل و دماغ کی آبیاری ہوتی تھی۔

اب یہاں کی محنت کا پھل غیر ملکی کھانے لگے، حکومت کے تخت و دربار پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ دماغ میں غلامی کی خو اور دل میں خوف پیدا ہو گیا۔ لیکن غلامی ہی غلامی کا احساس پیدا کرتی ہے اور یہ احساس آزادی کی پہلی منزل اور آزادی کی جدوجہد کا سنگ بنیاد بن جاتا ہے چنانچہ انگریزوں کا تسلط شروع ہوتے ہی آزادی کا جذبہ بھی دلوں میں آہستہ آہستہ کسمسانے لگا۔ وفادار غلام بننے۔ انگریزوں کے سایہ میں امن و سکون سے زندگی بسر کرنے۔ نئی زندگی کی برکتوں سے مستفیض ہونے کی خواہش کی تہہ میں اپنے حقوق حاصل کرنے اور اگر کچھ نہیں تو وفاداری کا صلہ پانے کی خواہش نے جنم لیا پھر یہی نہیں بلکہ ہندستانی صنعت اور تجارت کی تباہی نے آنکھیں کھول دیں اور پرانے جاگیردار طبقہ نے دیکھا کہ اب ان کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی چنانچہ انھوں نے آخری دفعہ اپنا وقار حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ غدر کا انقلاب کوئی عوامی انقلاب نہ تھا بلکہ قدیم جاگیرداری تمدن نے آخری مرتبہ سنبھالا لیا تھا۔ تاریخی طاقتیں اس کے ساتھ نہ تھیں۔ کوئی نصب العین نہ تھا۔ خود علم بغاوت بلند کرنے والوں کے قلعہ میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ اس لئے اس کوشش کا ناکام ہونا ضروری تھا۔ مگر ہندستانی زندگی میں یہ ایک ایسا موڑ تھا۔ جس پر سے آزادی کی راہ صاف نظر آنے لگی اور چونکہ غدر کے بعد سیاسی غلامی کی نوعیت اور شدید ہو گئی۔ اس لئے آزادی کی خواہش بھی بڑے شد و مد سے پیدا ہوئی۔

غدر کے بعد اردو ادب کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ہر ادیب اور شاعر یا ہر مفکر کے یہاں ایک ہی طرح کا شعور ایک ہی طرح کا احساس آزادی نہیں ہو سکتا۔ اس کی سوجھ بوجھ یکساں نہیں ہو سکتی، ان کے طبقاتی اور ذہنی روابط ان کے طرز فکر کو بالکل الگ الگ کر سکتے ہیں اس لیے ادب میں آزادی کے لئے فلسفیانہ تصورات کے متعلق کوئی خط مستقیم تلاش کرنا صحیح نہ ہوگا۔ تاہم اس کے شعور کی جھلک اردو ادب میں اسی وقت سے دیکھی جاسکتی ہے جس نے تہہ در تہہ طبقاتی اور معاشی پیچیدگیوں کی وجہ سے مختلف اخلاقی یا مذہبی شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ کوئی انگلستان کے ہر منصوبہ کو "فعال لما یرید" سمجھ کر قسمت پر قانع تھا۔ کوئی مغربی تمدن کے سیلاب کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دیتا تھا، کوئی سمجھوتہ کرنے پر آمادہ تھا۔ کوئی اس کی خوبیوں کو قبول کرنے اور اس کی بخشی ہوئی آزادی سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتا تھا۔ غدر کے بعد بہت دنوں تک کہیں سے باقاعدہ

بغاوت کرنے، انگریزی حکومت سے چھٹکارا پانے، غلامی کی زنجیریں توڑنے، معاشی آزادی حاصل کرنے کی آواز ادب میں بلند ہوتی نہیں دکھائی دیتی۔ یہی حال سیاست کا بھی تھا۔ آزاد۔ حالی۔ سرسید۔ ذکاء الملک سب اسی دور کی پیداوار ہیں اور شعور کے مختلف زینوں پر ہیں۔ ان لوگوں نے کچھ نہ کیا تو اتنا ضرور ہی کیا کہ غدر کے بعد کی مادی غلامی کی وجہ سے جو نفسیاتی شکست خوردگی پیدا ہوئی تھی اس کو مٹانے کی کوشش کی اور ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمان متوسط طبقہ کے دل میں امید کی نئی کرنیں پیدا کیں، انھیں خودی کا سبق سکھا دیا اور اپنی حالت سنبھالنے، آگے بڑھنے، زندگی کو حقیقت سمجھ کر قبول کرنے پر زور دیا۔ یہ تمام باتیں احساس غلامی سے براہ راست تعلق نہیں رکھتیں۔ لیکن ان کی جڑیں اسی تصور سے پیوست ہیں۔

۱۸۸۵ء میں کانگرس وجود میں آچکی تھی۔ ایک معمولی سی ٹھنڈی چنگاری۔ ایک بے ضرر شعلہ لیکن چنگاری پھر چنگاری ہے اور شعلہ پھر شعلہ۔ جب غلامی کے احساس نے آزادی کا سبق دیا تو دلوں میں طوفان اٹھے۔ آندھیاں اٹھیں اور چنگاری دہکتا ہوا انگارہ بن گئی۔ شعلہ بھڑک کر ہوئی آگ بن گیا۔ اور وہ دبی اور سہمی ہوئی خواہش جو کہیں پردوں میں چھپی بیٹھی تھی بے نقاب ہو کر سامنے آگئی۔ ہندوستان کے باہر دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا جاپان کی ترقی، چین کا انقلاب، ایران کی انقلابی جدوجہد، افغانستان کی بیداری، ترکی کے تغیرات، یورپ کی ریشہ دوانیاں، سب میں ہندوستان کے لئے سبق پوشیدہ تھا۔ کوئی سمجھتا تھا اور کوئی نہ سمجھتا تھا مگر شبلی اور اکبر الہ آبادی کے کلام میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اردو صحافت میں یہ اثرات زیادہ نمایاں تھے لیکن ادب کا دامن بھی خالی نہ تھا، اودھ پنچ، الہلال اور دوسرے اخبارات سیاسی آزادی کے جذبات بھڑکا رہے تھے۔ شبلی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی۔ اقبال، چکبست اور دوسرے ادیب ذہنوں کو آزادی کی خواہش سے بھر رہے تھے۔ یہاں پھر اس بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ ان میں سے ہر شخص آزادی کا تصور ایک مخصوص انداز میں رکھتا تھا۔ یہ آزادی سیاست میں تو ایک خاص شکل رکھتی تھی اور پارٹی میں منظم ہو جانے کی وجہ سے کسی قدر واضح بھی تھی۔ لیکن ادب و شعر میں کوئی خاص شکل نہ رکھتی تھی۔ پھر بھی جس طرح سیاسی دنیا انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں بٹ گئی تھی۔ اسی طرح شعرا بھی سیاسی شعور رکھنے والے آزادی پسندوں اور وجدانی طور پر آزادی چاہنے والوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ بہت سے ملکوں میں انقلاب کی ہوائیں چلی تھیں اور کم از کم ایک ملک میں تو ایسی آندھی اٹھی تھی۔ جس نے قدیم نظام حیات کے تار و پود بکھیر کر حکومت کا تاج عوام کے سر پر رکھ دیا تھا اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کا ذکر ٹیگور کی زبان پر آیا۔ اس کا تذکرہ اقبال نے کیا۔ اس کے متعلق انگریزی حکومت نے غلط فہمیاں پھیلائیں۔ اس کا نام لینے والوں کو سزائیں دیں۔ اس لئے ہندوستانی نوجوانوں کو اس سے کہیں حقیقی اور کہیں روحانی وابستگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ دن گذرتے گئے اور آزادی کی لے تیز ہوتی گئی۔ رجعت پسند اعتدال پسند بن گئے، اعتدال پسند انتہا پسند بنے۔ گڑگڑا کر حق مانگنے والوں کی جبینوں پر شکنیں پڑ گئیں۔ سمندر چاہنے والوں کو قطرے ملے۔ آزادی کے خواہشمندوں کو قید کی دولت دی گئی۔ ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ مضبوط اور منظم ہونے لگا۔ مزدوروں اور کسانوں کی تباہ حالیاں بڑھیں، قحط پڑے، بیماریاں پھیلیں اور سب نے مل کر خواب زندگی کی تعبیر اتنی بھیانک کر دی کہ جینا دو بھر معلوم ہونے لگا۔ اس لئے سیاست اور خیال میں انتہا پسندی بڑھنے لگی۔ عوام میدان میں آنے لگے اور حملہ اور مقابلہ دونوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" سامراجی غصہ کا شکار ہو گیا۔ بنگال کے دہشت پسندوں نے سفید فاموں کا خون بہا کر اپنی پیاس بجھائی۔ زبانوں پر قفل لگے اور عمل میں ترقی ہوئی۔

جو لوگ ہندوستان کی جنگ آزادی سے واقف ہیں وہ ۱۹۱۸ء کے بعد سے یہاں کی زندگی میں ایک لمحے کا تعطل بھی نہیں دیکھتے جلیانوالہ باغ کے سرخ خون کی تازگی اب تک کم نہیں ہوئی ہے۔ ترک موالات کی تحریک، ہندو مسلم اتحاد کے جاں پرور نظارے۔ عوام کی بیداری حکام کی بدحواسی، قید و بند کا خیر مقدم، قربانیاں، زمیندار کسان کی کشمکش۔ مزدور اور مل مالکوں کا تصادم، سائمن کمیشن، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

سول نافرمانی کی تحریک، قانون شکنی کی مختلف شکلیں، ان سب کے ساتھ ساتھ موت، بھوک، قحط، خون، آئینی جدوجہد کے ساتھ ساتھ انقلابی جدوجہد اشتراکی طاقتوں کا عروج، ۱۹۴۲ء کی تحریک، آزاد ہند فوج، جہازیوں کے مظاہرے، ہڑتالیں ـــ یہی ہزاروں، لاکھوں عناصر مل کر جنگ آزادی کو اس منزل پر لا رہے تھے جسے جوش کے دو مصرعوں میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

لیلائے آب و رنگ کا ڈیرا قریب ہے

تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے

دوسری جنگ عظیم نے ہندستان کے سامنے آزادی کے سوال کی نوعیت بالکل ہی بدل دی تھی۔ دنیا میں جمہوریت کا تصور اس طرح جڑ پکڑ گیا تھا کہ فاشزم سامراج اور اس کے ملتی جلتی تمام قوتوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے، خارجی حالت اور اندرونی جدوجہد نے ہندستان کو بھی آزادی کے دروازے پر پہونچا دیا۔ یقیناً یہ آزادی مکمل نہیں ہے جو ملی ہے۔ آزادی اس وقت ہوگی جب یہاں خوشی اور امن کا راج ہوگا۔ جب دلوں میں نفرت کی آگ بجھ چکی ہوگی جب غریب کے دل میں بھی مسرت کی لہریں اٹھیں گی۔ جب اقتصادی مساوات کی تکمیل ہوگی۔ جب اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی طاقت ہاتھوں میں پیدا ہوگی، اور جب اتحاد کا پرچم لہرائے گا۔ جس طرح یہاں تک قدم پہونچے ہیں۔ یقین ہے کہ اسی طرح آگے بھی بڑھیں گے اور وہ سب کچھ مل جائے گا، موجودہ آزادی جس کی پہلی منزل ہے۔

اس منزل تک پہونچنے میں اردو ادب نے کیا کیا، اس کی کہانی طویل ہے اور اس عظیم الشان محل کی تعمیر میں اتنے ادبی معماروں کا ہاتھ ہے جن کی فہرست بھی شاندار منظر پیش کرے گی۔ ان کی ہندستان سے محبت، ہندستان کے ذرے ذرے سے محبت، ہندو مسلمانوں سے محبت، قومی احساس سے محبت، جذبہ آزادی سے محبت، رنگا رنگ، آہستہ اور تیز، ہلکی اور شدید ہونے کے باوجود کسی طرح مشکوک نہیں ہے، انھوں نے کبھی سیاسی رہنماؤں کے قدم بقدم رکھ کر، کبھی ان کے دوش بدوش چل کر، کبھی ان کی آواز میں آواز ملا کر، کبھی تنقید کر کے اور کبھی رہنمائی کر کے آزادی کے تخیل کو سنوارا ہے بلکہ ان کے دل میں اکثر سیاسی رہنماؤں کے قلب سے زیادہ وسعت رہی ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے گروہ، اپنے جتھے وغیرہ کے متعلق نہیں، بلکہ عام انسانوں کے لئے آزادی کا تصور پیش کیا ہے۔ تحریک ترک موالات کے بعد سے آزادی کا بت بے نقاب ہو گیا اور ۱۹۳۶ء سے سیاسی آزادی کے معنی معاشی آزادی کے ہو گئے۔ گو برابر رجعت پسند طاقتیں بھی بھیس بدل بدل کر ابھرتی رہیں لیکن یہاں ان کا تذکرہ مقصود نہیں، اس دور میں پریم چند کے افسانوں، جوش ملیح آبادی کی نظموں اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں میں اس جذبہ کا سیلاب پھوٹ بہا، شاعروں میں، ساغر، احمد ندیم قاسمی، روش، وامق، مجاز، سردار، جواد، ملا، مخدوم، فراق، شور، کیفی، شمیم، فیض، احسان وغیرہ، افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، حسینی، بیدی، منٹو، عصمت، رشید جہاں، احمد علی، اختر انصاری، اختر رائے پوری، احمد ندیم وغیرہ دوسرے ادیبوں میں نیاز، فراق، مجنوں، سجاد ظہیر، احمد عباس، غلام السیدین وغیرہ نے نہ صرف آزادی کے گیت گائے بلکہ اس کے تخیل کو واضح اور جاندار بنایا اور اپنے ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو لئے ہوئے دشوار گزار راہوں پر بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آزادی کی منزل سامنے آگئی۔ انھوں نے دشواریوں کا مقابلہ کیا رجعت پسندوں کے طعنے سنے، حکومت کے ظلم سہے، لیکن ان کی آواز میں لرزش یا ان کے قدموں میں لغزش پیدا نہ ہو سکی۔ وہ بھی اپنی جگہ پر اسی طرح آزادی کے عقیدے پر پہاڑ کی طرح جمے رہے، جس طرح بہت سے سیاسی رہنما۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ جس میں آزادی کے تخیل کے محض خط و خال پیش کئے جا سکے ہیں اور صرف ان ادیبوں اور شاعروں کے نام گنائے گئے ہیں جو اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک خاص نوعیت کی آزادی حاصل ہو گئی لیکن وراثت میں اسے بہت سی پابندیاں اور خرابیاں بھی ملی ہیں، اس کے علاوہ آزادی حاصل کرنے سے زیادہ مشکل آزادی کا تحفظ اور اس کا استعمال ہے۔ ابھی تو آزادی کی جوئے رواں میں، آب حیات کے اس چشمہ میں اس زہر کی ایک

وہ ابھی بہتی چلی آرہی ہے۔ جس نے فرقہ واریت اور تنگ نظری کے خونیں دیوتا کی پیاس بھڑکا دی ہے۔ کون کہے گا کہ آزادی کا یہی مقصد ہے یا یہی انجام ہونا چاہئے؟ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے شعراء اور ادیب اس سیلاب کو روکنے کے لئے کس طرح سینہ سپر ہوتے ہیں۔ آزادی کو کس طرح حقیقی آزادی بناتے ہیں۔ جس میں انصاف اور ترقی کا راج ہو اور جس میں ان کے خوابوں کی تعبیر نکلے۔

اردو زبان اور تحریک آزادی

ستمبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں الہ آباد میں ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس موقع پر اردو کے ترقی پسند ادیبوں نے اردو ہندی مسئلے کے متعلق حسب ذیل پیام بھیجا تھا جس پر جوش ملیح آبادی ساغر نظامی، کرشن چندر، مہندر ناتھ، مدھوسودن۔ وشوامتر عادل، عصمت چغتائی، احمد عباس، کیفی اعظمی اختر الایمان، ممتاز حسین، اسرار الحق مجاز۔ مخدوم محی الدین اور سردار جعفری کے دستخط تھے:

ہم اردو ادب کے ترقی پسند ادیب، ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کو ان کی پہلی آل انڈیا کانفرنس پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کانفرنس، غلام ہندستان میں آزاد آرٹ اور ادب کی ترقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ آپس کے سیاسی جھگڑوں نے ہندو مسلم فساد پیدا کرنے کے ساتھ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہیں، جس کی بدولت اردو اور ہندی کا سوال سیاسی اکھاڑے میں پہنچ گیا ہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے کہ آج پورے ہندستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کے اندر کسی قسم کے جھگڑے اور فساد نہیں ہیں اور مختلف زبانوں کے ادیب ایک ساتھ مل کر جنتا کے لئے ادب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ ہندی کے ترقی پسند ادیب اپنی کانفرنس میں ہندستان کی قومی اور سرکاری زبان کے الجھے ہوئے سوال کو سلجھانے کی کوشش ٹھنڈے دل سے کریں گے۔ اور اس تعصب اور کٹر پن کا شکار نہ ہوں گے۔ جس کا اظہار اردو اور ہندی کی بعض جماعتوں اور ادیبوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔

ہم سب سے پہلے اپنے ساتھی ہندی ادیبوں کے ذریعے سے اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتے ہیں جو جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی ہے۔ کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی صرف ہندوؤں کی۔ اور اب جب کہ مسلمانوں کا پاکستان بن گیا ہے تو ہندستانی یونین میں قومی اور سرکاری زبان کے سلسلے میں کوئی جگہ نہیں دی جا سکتی اور اس کے ساتھ ایک فرقے کی زبان کا سا سلوک کیا جائے گا۔

اردو، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے جس کے بنانے میں ان دونوں کا مشترکہ حصہ ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ پنڈت برج نرائن چکبست اور منشی پریم چندر کا درجہ اردو ادب میں کسی طرح، میر۔ غالب، حالی۔ اور اقبال سے کم نہیں ہے اور آج اردو میں ہندو ادیبوں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہے بلکہ بہت سے سکھ ادیب بھی اردو میں لکھ رہے ہیں۔ کرشن چندر، رگھوپتی سہائے فراق، اوپندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، فکر تونسوی، وشوامتر عادل، مدھوسودن، دیوندر ستیارتھی، کنھیا لال کپور اردو کے چوٹی کے ادیبوں اور شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے بغیر اردو کا ترقی پسند ادب نامکمل رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے سب سے بڑے پبلشر منشی نولکشور کا نام خاص طور سے اہم ہے کہ اردو کا پورا کلاسیکل لٹریچر [illegible] چھپا

بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی بھی پھیلی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی لٹریچر اردو میں ہے اور ہندوؤں کا ہندی میں۔ اردو میں اگر ایک طرف مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر کا کچھ حصہ موجود ہے، حالانکہ وہ بہت تھوڑا ہے اور فارسی اور عربی کے بغیر کام نہیں چلتا۔ تو دوسری طرف ہندوؤں کا مذہبی ادب بھی اردو زبان میں پایا جاتا ہے۔ جسے بہت سے ہندو گھرانے پڑھتے ہیں۔ صرف قرآن اور حدیث ہی کے ترجمے نہیں بلکہ ویدوں کا بہت بڑا حصہ، مکمل رامائن۔ منوسمرتی اور بھگوت گیتا کے متعدد ترجمہ اردو نثر اور نظم میں موجود ہیں۔ ایسے بہت سے ہندو ہیں جنھوں نے اپنی مذہبی تعلیم صرف اردو میں حاصل کی ہے۔ اور وہ ہندی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔

یہ داستان صرف ترجموں تک ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ اردو ادب میں اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی مذہبی روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ اس رامائن کے علاوہ جو چکبست نے نامکمل چھوڑ دی۔ نظیر۔ اکبر الہ آبادی، اقبال، منشی پریم چند، جوش ملیح آبادی اور دوسرے اردو ادیبوں اور شاعروں نے بہت سی ایسی چیزیں لکھی ہیں جو خالص ہندو مذہبی مذاق کی ہیں یا جن کا اپدیش ہندو روایات اور دیومالا سے حاصل کیا گیا ہے۔ مثلاً رام، کنھیا جی کا جنم۔ کرشن کا بالپن۔ کنھیا کی شادی، بلدیو جی کا میلا۔ درگا جی کے درشن۔ مہادیو جی کا بیاہ، تلسی داس اور ایک بیوہ کا واقعہ، ان مضامین کی چند مثالیں ہیں۔ جن پر اردو شاعر اور ادیب لکھتے رہے ہیں۔ فراق گورکھپوری کی نئی رباعیوں کے ذریعے سے اردو شاعری میں ہندی کے سنگاروں نے نئی تازگی پیدا کر دی ہے۔ جس میں ہندو اور مسلم تہذیبوں کا وہ امتزاج اور حسن ہے جو فتح پور سیکری اور تاج محل میں پایا جاتا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندوؤں کی بہت سی مذہبی تہذیبی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کرتی رہی ہے۔

ہمیں جس چیز پر سب سے زیادہ فخر ہے وہ یہ ہے کہ اردو ادب حب الوطنی، دیش بھگتی اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہے ہندستان کے حسن اور دولت یہاں کے پہاڑوں اور دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں کی خوبصورتی پر اردو میں بے شمار چیزیں لکھی گئی ہیں۔ جدید اردو ادب اور زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہندستان کی آزادی کی قومی تحریک کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی ہے۔ اور اس کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر آزادی کی لڑائی میں خود حصہ لیتے رہے ہیں۔ وہ صرف ادیب ہی نہیں بلکہ آزادی کے سپاہی بھی ہیں۔

صرف اردو کی نظموں، افسانوں اور مضامین کے انتخاب سے پچھلے نوّے برس کی قومی لڑائی کی پوری تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے ہندستان کی شاید ہی کسی زبان میں اتنا سرمایہ ہو۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک قومی آزادی کی لڑائی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس پر اردو ادیبوں اور شاعروں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ جدید اردو ادب کے پودے کو ہمارے شہیدوں کے خون نے اسی طرح سینچا ہے۔ جس طرح آزادی کے اس درخت کو جس کے سائے میں آج ہم اور آپ بیٹھے ہیں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی، کانگریس، تقسیم بنگال، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، دنیا کی پہلی لڑائی۔ جمسفورڈ فارم، رولٹ ایکٹ، جلیان والا باغ، خلافت تحریک، پہلی سول نافرمانی، دوسری سول نافرمانی، بھگت سنگھ ۱۹۳۵ء کا قانون، دوسری بڑی لڑائی، سوویت جرمن جنگ، ۱۹۴۲ء کی تحریک۔ لیڈروں کی گرفتاری، بنگال کا قحط، کرپس مشن وزارتی مشن، ہندستانی ملاحوں کی بغاوت۔ کشمیر، ٹراونکور، اور حیدر آباد کی ریاستی پرجا کی جنگ، بنگال کے کسانوں کی تبھاگا تحریک ہندو مسلم فساد، ۱۵ اگست کی آزادی، مسلم لیگ اور پاکستان، انقلاب روس، کسان، مزدور، سرمایہ داری، فاشزم، ان سب سے ہر ہر موضوع پر اور ہر واقعہ پر اردو کے ادیبوں نے کہانیاں اور نظمیں لکھی ہیں اور یہ لکھنے والے ہماری زبان کے چوٹی کے ادیب اور شاعر ہیں۔ غالب، حالی۔ سرسید۔ شبلی، اقبال۔ مولانا ابوالکلام آزاد، چکبست، اکبر، پریم چند، اور جوش ملیح آبادی سے لے کر کرشن چندر اور کیفی اعظمی تک اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو ہماری قوم کے خون کے ہر قطرے کا

حساب لکھ رہا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ادب کی زبان میں قومی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی تو اس کا دامن ایسے ادب سے مالا مال نہ ہوتا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی اب تک یہ پالیسی رہی ہے کہ اس نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی الگ الگ حیثیت کو تسلیم کیا ہے جن کی اپنی اپنی روایات اور اپنا اپنا ادب ہے۔ لیکن ان دونوں زبانوں کو بہتر بنانے کی کوشش کے ساتھ انجمن یہ کوشش بھی کرتی رہی ہے کہ ان دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لایا جائے۔ دونوں زبانوں کو قریب لانے کا طریقہ یہ نہیں رہا ہے کہ ایک انمل بے جوڑ قسم کی زبان لکھ کر یہ ثابت کیا جائے کہ دونوں زبانیں گھل مل گئیں بلکہ انجمن کے ممبر ادیبوں نے ہندی اور اردو میں ایسا ادب پیدا کرنے کی کوشش کی جو جنتا کے لئے ہو اور عام انسانوں کے لئے ہو اور عام انسانوں کے لئے ہو اور عام انسانوں کی بولی میں لکھا جائے ہم ہوائی قلعوں سے نیچے اتر آئے۔ شیش محلوں سے باہر نکل آئے اور کٹھن ہندی اور مشکل اردو کے بجائے سیدھی سادی زبان استعمال کرنا چاہی۔ ہم نے دونوں زبانوں کے فرق کو محسوس کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ان میں جو مشترک چیزیں ہیں ان کو بھی پرکھا اور ان پر زور دیا اس سلسلے میں انجمن کے سابق سکریٹری ڈاکٹر عبدالعلیم اور انجمن کے موجودہ سکریٹری سید سجاد ظہیر کے مقالے "اردو ہندی ہندستانی" پر خاص طور سے اہم ہیں۔

ہم بھی انجمن کی اس پالیسی پر قائم ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان دونوں زبانوں کی ترقی ایک دوسرے کے لئے مفید ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تک ان دونوں زبانوں نے ایک دوسرے کی ترقی سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔

یہ مانتے ہوئے بھی کہ اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں زبانوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ ان دونوں کی آل انڈیا حیثیت ہے اور اپنے علاقے کے علاوہ ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں ایک ہی ماں یعنی کھڑی بولی کی بیٹیاں ہیں۔ دونوں ایک ساتھ بڑھی اور پلی ہیں اور ان کے پروان چڑھانے میں ہندو، مسلمان دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔ منشی پریم چند کی طرح بعض ادیب ایسے بھی ہیں جو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں، دونوں زبانوں میں بولنے والے ایک ہی علاقے میں آباد ہیں جن کی روزمرہ بول چال کی زبان میں فرق نہیں ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کی بنیادی گرامر ایک ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں ان دونوں زبانوں کے فرق پر زور دینا چاہئے یا یکسانیت پر۔ ہم ان کی یکسانیت پر زور دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ اتحاد اور ترقی کی نشانی ہے، ہم دونوں زبانوں کے سرمائے کو اپنانا چاہتے ہیں۔ غالب اور میر کی طرح تلسی داس اور سور داس کو بھی اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ اب تک ان دونوں زبانوں کے دھارے گنگا اور جمنا کی طرح ایک ہی پہاڑ کے سینے سے نکل کر ایک ہی زمین کی گود میں الگ الگ بہتے رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر الہ آباد میں ان کا سنگم ہو جائے۔

ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ اردو یا ہندی، کوئی ایک زبان اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں فلسفہ، سائنس اور علم کی دوسری شاخوں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ ہمیں اس قابل بننے کے لئے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بہت کچھ لینا پڑے گا۔ ہمیں اس سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی زبان خالص نہیں ہے۔ ہندستان نے اب تک باہر سے آنے والی کتنی ہی قوموں اور تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کیا ہے اس سے ہماری روح کا پھیلاؤ اور وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ ہم نے لفظوں کو بھی اسی طرح جذب کر سکتے ہیں کہ وہ ہماری زبان کا زیور بن جائیں ایسی حالت میں اردو اور ہندی کا ایک ساتھ رہنا اور بھی ضروری ہے۔ اگر اردو یا ہندی کسی ایک کو بھی نقصان پہونچا تو دوسری زبان غریب اور کمزور ہو جائے گی

ان دونوں زبانوں کو ایک ساتھ رکھنے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے اور ان علاقوں کے باشندوں کے

لئے جہاں یہ زبانیں بولی جاتی ہیں دونوں کی تعلیم ضروری۔ اور لازمی قرار دے دی جائے۔ اتری ہندستان اور خصوصیت کے ساتھ یو۔پی کے اسکول میں آٹھویں درجے تک اردو کے ساتھ ہندی اور ہندی کے ساتھ اردو لازمی طور سے پڑھائی جاتی ہے اور اسے باقی رکھا جائے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں زبانوں کو سرکاری طور سے تسلیم کر لینے کے بعد عام لوگوں کو اس کا حق دے دیا جائے کہ وہ جس زبان اور جس رسم الخط میں چاہیں تعلیم حاصل کریں۔ اس کے لئے ہمیں یونیورسٹیوں اور کالجوں کو زیادہ بہتر بنانا پڑے گا۔

ایک تیسری صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ اردو اور ہندی کو ایک مشترکہ زبان کی جس کو ہندستانی کہا جائے دو ادبی شکلیں یا اسٹائل سمجھا جائے جو دو مختلف رسم الخط یا لپیوں میں لکھی جا سکیں۔ فی الحال دونوں رسم الخط باقی رکھے جائیں اور آہستہ آہستہ ایک رسم الخط بنانے کی کوشش کی جائے۔ مشترک رسم الخط رومن بھی ہو سکتا ہے اور دیو ناگری بھی۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہوگا۔ کہ جو رسم الخط اختیار کیا جائے، اس میں حکومت اب تک کے سارے ادب کو منتقل کر دے۔ یہ کئی کروڑ روپے اور کئی برس کا کام ہے اور جب تک سارا ادب نئے رسم الخط میں منتقل نہ ہو جائے تب تک دونوں لپیوں کو باقی رکھنا پڑے گا۔ اس تجربے میں ہم ترکی اور سویت یونین کی ایشیائی ریپبلکوں سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔

رسم الخط اور لپی کے سلسلے میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ انڈین یونین کے مختلف صوبوں میں جو لپیاں رائج ہیں وہ دیو ناگری سے ملتی جلتی ہیں اس لئے دیو ناگری لپی کو رواج دینا چاہئے اور اردو رسم الخط کو سرکاری زبان کے لئے باقی رکھنا ضروری نہیں ہے۔

یہ دلیل سیاسی تنگ نظری سے پیدا ہوتی ہے۔ اوّل تو انڈین یونین میں چار پانچ کروڑ مسلمانوں کے علاوہ، ڈیڑھ کروڑ اور بھی ایسے آدمی ہیں جو اردو میں لکھتے پڑھتے ہیں اور وہ پورے ہندستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دوسرے ہم یہ نہیں سمجھتے کہ اگر ہمارا ملک آج دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے تو یہ ہمیشہ ایسی ہی دو آپس میں لڑنے والی ریاستوں میں بٹا رہے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آنے والے زمانے میں ہندستان بہت سی آزاد اور خود مختار قوموں کا وطن ہوگا۔ اور یہ سب قومیں اپنی خوشی اور مرضی سے ایک مرکز میں متحد ہوں گی۔ اس وقت مرکز کی سرکاری زبان اور لپی کا سوال پھر اٹھے گا اور یہ سوچنا پڑے گا کہ اگر گجراتی، مرہٹی، بنگالی، اور اڑیہ کی لپیاں دیو ناگری سے ملتی جلتی ہیں تو موپلوں، سندھیوں، بلوچیوں، پٹھانوں، کشمیریوں اور پنجابیوں کا رسم الخط اردو سے ملتا جلتا ہے۔ ہم ہندی اور اردو کے ترقی پسند ادیب جو اتحاد کے علم بردار ہیں۔ ہندی اور اردو کو ہندستان اور پاکستان کی طرح الگ الگ کر کے اپنے زخموں پر نمک نہیں چھڑکنا چاہتے۔ ہم اپنی تہذیب، تمدن اور زبان کو تقسیم نہیں کر سکتے۔ اگر ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہماری زبان اور تہذیب بھی تقسیم ہو گئی۔ تو ہمارے دکھ بڑھ جائیں گے۔ اور ہمارے ادب تہذیب اور زندگی کو بے انتہا نقصان پہونچے گا۔

ہم نے اس سوال کو حل کرنے کے لئے جو تین صورتیں آپ کے سامنے پیش کی ہیں ان پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ان تینوں میں سے کون سی صورت مناسب ہوگی۔ اس کے لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ ستمبر کے آخر میں یا اکتوبر کے شروع میں ہندی اور اردو کے ترقی پسند ادیبوں کا ایک ملا جلا جلسہ کیا جائے۔ جس میں ہم سب مل کر اس سوال پر غور کریں اور کوئی راہ نکالنے کی کوشش کریں۔

صرف اسی طرح ہم اور آپ ہندی اور اردو کے سوال کو حل کر سکتے ہیں اور اپنی زبان اور ادب کو ترقی دے سکتے ہیں سارے ملک میں پھوٹ لڑائی جھگڑے کی ہوائیں چل رہی ہیں اور آپس کی نفرت کا زہر پھیل رہا ہے۔ اس وقت اتحاد اور یکتا کا راستہ دکھانے کا بہت بڑا فرض ہم ادیبوں پر ہے، زبان کا سوال سب سے بڑا سوال ہے۔ زبان، تہذیب اور تمدن کی روح ہے اور ہم ادیبوں سے بہتر اس سوال کو کوئی نہیں نپٹا سکتا۔

۲۸ اگست ۴۷ء دفتر ترقی پسند مصنفین (اردو) بمبئی

پہلا حصّہ

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک

۱۔ غدر اور دہلی کی تاراجی

۲۔ حب الوطنی کا احساس

۳۔ انگریزی راج اور احساس غلامی

۴۔ سیاسی بیداری کی پہلی لہر

۱۔ غدر اور دہلی کی تاراجی

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلال عہد وصال بتاں نہ پوچھ

غالب

غالب

دہلی کی بربادی

ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا، لاکھوں مر گئے جو زندہ ہیں ان میں سیکڑوں گرفتار بند بلا ہیں اور زندہ ہیں ان میں مقدور زندگی نہیں۔

مسلمان امیروں میں تین آدمی، نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سو ان کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ لہٰذا میاں کی اقامت میں تذبذب ہے، خدا جانے کہاں جائیں۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر میں ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا عذر دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضہ کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ایک بڑا لڑکا، ایک داروغہ، خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب مسلمانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس آیا۔ میں نے کہا بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا۔ نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنیل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا، اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ بہرحال یہ عبارت جمعدار نے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا ہے کہ لوگ شہر سے باہر مکان و دکان کیوں بناتے ہیں جو مکان بن چکے انھیں ڈھا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ مقرر کرنا حاکم کی رائے پر ہے۔ ورنہ روپے اور ٹکٹ سے۔ گھر برباد ہو جائے آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے دیکھئے شہر کے بسنے کی کونسی صورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں، جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔

شہر میں یوں ٹوٹ ڈبنگی) کوئی چیز ہے وہ جاری ہوگئی ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس گز گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جاویں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار، اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ سونے کے مول اناج بکتا ہے ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر۔ گیہوں تیرہ سیر چنے سولہ سیر گھی ڈیڑھ سیر

پنشن کا حال کچھ معلوم نہیں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملہ میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا، کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہرحال اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں۔ اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم نہ کسی کو خبر، میں کتابیں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں لحاف تو شک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا۔

(متعدد خطوط سے)

قطعہ

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۱۸۵۷ء

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلح شور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک | آدمی واں نہ جا سکے بہاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا | وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ | سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم | ماجرا دیدۂ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

حالی

دہلی کا مرثیہ

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ | نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل | ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب | دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی | کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
سوجز ن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم | دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح | دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک | دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں | نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ | ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی | ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو! | یاد کر کے اسے اب جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیّرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ | اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومنؔ و علوی و صہبائی و ممنونؔ کے بعد | شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو | ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں | نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر | اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

۲۔ حب الوطنی کا احساس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اقبال

الطاف حسین حالی

حُبّ وطن

اے وطن، اے مری بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان وزمین

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

پیچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار — یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں ؟ — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو — مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کا نمو تجھ سے — رُوکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب وہوا

تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! — اٹھو اہل وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہوں مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی تم پہ پڑنے نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی دُرّانیوں نے زر لوٹا

کبھی نادر نے قتل عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا

سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے

چین کس کو ملا ہے غیروں سے

قوم سے جو تمہارے ہیں برتاؤ — سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ

اہل دولت کو ہے یہ استغنا — کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا

شہر میں قحط کی دوہائی ہے — جان عالم لبوں پہ آئی ہے

بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا — موت کی مانگتا ہے کوئی دعا

بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں — رو کے ماں باپ کو رلاتے ہیں

کوئی پھرتا ہے مانگتا در در — ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر

عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات — عید ہے دن تو شب برات ہے رات

قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے — کام انھیں اپنے حلوے مانڈے سے

ان کو اب تک خبر نہیں اصلا! — شہر میں بھاؤ کیا ہے غلے کا

غلّے ارزاں ہیں ان دنوں کہ گراں — کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں

کال کیا شے ہے کس کو کہتے ہیں بھوک — بھوک میں کیونکہ مرتے ہیں مفلوک

سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے

اس کے نزدیک سب ہی پیٹ بھرے

چھوڑ دو افسردگی کو جوش میں آؤ — بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں — رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں

قافلوں سے اگر ملا چاہو — ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے

قوم کا مبتذل ہے جو انساں — بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں

قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز — ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

عزت قوم چاہتے ہو اگر — جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر

[illegible] — اٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور

اب نہ سید کا افتخار صحیح	نہ برہمن کو شدر پہ ترجیح
ہوئی ترکی تمام خانوں کی	کٹ گئی جڑ سبھی خاندانوں کی
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے	علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا	بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات	یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

اقبال

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں	چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں	تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو	پاسباں اپنا ہے تو دیوار ہندستاں ہے تو
مطلع اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو	سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن	وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن	تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامن موج ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے	تازیانہ دے دیا برق سر کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے	دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے

ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی	جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی	دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

اقبال

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — داماں آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

قومی زندگی

قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑا نازک وقت ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجودہ حالت پر غور کرے۔ بلکہ اگر اسے اقوام عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا منظور ہے تو اپنی آئندہ نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرے اور ایسا طریق عمل اختیار کرے جس کے احاطۂ اثر میں اس کے اخلاق کا تمدن بھی شامل ہو۔ ایک زمانہ تھا جب کہ اقوام دنیا کی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا۔ اور یہ فولادی حربہ دنیائے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوت تھی مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقا ان کے افراد کی تعداد ان کے زور بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ ان کی زندگی کا دار و مدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ آجکل کی جنگوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قومیں ہتھیار بند ہوں اور ایک خاص میدان میں آراستہ ہو کر جدال و قتال کا بازار گرم کریں۔ نہ آج کل یہ ضروری ہے کہ کوئی قوم کسی ہمسایہ قوم پر فتح پانے کے لئے اس ملک پر چڑھائی کرے۔ یہ تمام سامان زمانہ قدیم کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہمارے زمانے میں ایک اور خاموش قوت ہے۔ جس پر قوموں کی بقا و فنا انحصار رکھتی ہے اور جس کے بل پر ایک قوم گھر بیٹھے دوسری قوم کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹا سکتی ہے۔ ہاتھیوں کی لڑائی کا زمانہ گذر چکا۔ اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہے جس کے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔ ظاہری فاصلہ جو قوموں کے خلا و ملا میں بمنزلہ ایک سد سکندری کے تھا۔ اب ریل اور پیام برقی کی حیرت انگیز ایجادوں سے گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے اور وہ ممالک جو کبھی ناپید اکنار سمندروں کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر دور تھے کہ ایک دوسرے کی ہستی کا بھی علم نہ تھا۔ موجودہ صدی میں فن جہازرانی کی تعجب خیز ترقی سے ایک شہر کے دو محلوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ جس سے دنیا کی تمام قومیں [illegible] اضطرارانہ جنگ، تہذیب کے

ابتدائی مراحل میں انسان کے دل میں مذہبی تاثرات کا ایک ہجوم پیدا کر دیا کرتی تھی۔ اب اس کی پیام رسانی کا کام دیتی ہے۔ اسٹیم اس کی سواری ہے اور ہوا اس کے پنکھے جھلا کرتی ہے۔ آفتاب جس کی عظمت و جلال نے نہ صرف ابراہیم کی باریک بین نگاہوں کو دھوکے میں ڈال دیا تھا بلکہ ایک مہذب قوم کے دل و دماغ کو بھی متاثر کر دیا۔ اب اپنی حرارت اور روشنی کو حضرت انسان کے اشارے پر صرف کرتا ہے۔ غرضیکہ نظام قدرت کے وہ تمام قوی جن کے ناقابل تشریح عمل سے مرعوب ہو کر قدیم قومیں انہیں ربوبیت کے لباس سے مزین کر کے ان کے لئے عظیم الشان معابد تعمیر کیا کرتی تھیں۔ موجودہ علوم کی وساطت سے انسان کے دست بستہ غلام ہیں اور یہ ظلوم و جہول اس عظیم الشان امانت کا بار اٹھائے جس کے اٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر بجا ناز کر رہا ہے اس کی مستفسرانہ نگاہیں قدرت کے سربستہ رازوں کو کھول رہی ہیں اور اس کا دماغ اپنی علمی فتوحات کے سہارے پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں حتیٰ کہ چاند سورج اور ستاروں پر بھی حکومت کر رہا ہے۔ یہ ہے وہ حیرت انگیز تغیر جو زمانہ حال کو زمانہ ماضی سے متمیز کرتا ہے۔

لیکن شرائط زندگی کے متعلق ایک اور غور طلب بات ہے کیا وہ تمام حالات جن پر کسی قوم کی زندگی کا دار و مدار ہے انسانی کوشش سے ایک خاص ترتیب میں جمع ہو سکتے ہیں؟ بالفاظ دیگر قوم کی زندگی قوم کے اختیار میں ہے یا پودوں اور حیوانوں کی طرح افراد انسانی کی زندگی بھی قوائے فطرت کے غیر اختیاری عمل پر منحصر ہے؟ اگرچہ زندگی کی اصلیت مخلوقات کی صورت میں وہی ہے تاہم انسان اپنی عقل خداداد کی وجہ سے آفرینش کی ہر صورت سے متمیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ایسی قوت دی ہے جس کی وساطت سے یہ شرائط زندگی کو سمجھ سکتا ہے۔ اور ہر انقلاب کے لوازم پر غور کر سکتا ہے۔ اس کی گرفت ایسی زبردست ہے کہ یہ قدرت کے مخفی قوی کو معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اپنی ارتقاء کے رخ کو متعین کر سکتا ہے۔ جب یہ دیکھتا ہے کہ آبادی کی افزائش کے ساتھ زمین کی پیداوار قدرتی اسباب سے کم ہو رہی ہے تو وہ ان اسباب کا مقابلہ کرتا ہے اور مختلف اقسام کی ایجادوں سے ان کی مخالفت کو روک کر اپنی زندگی کے سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اگر انسان عقل کے زیور سے معرا ہوتا تو ترقی، تہذیب اور تمدن کے لئے کوشش کرنا بالکل بے سود ہوتا۔ ہماری زندگی حیوانوں اور درختوں کی طرح ہوتی۔

ان واقعات کی روشنی میں اگر ہندوستان کی حالت کو دیکھا جائے تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے۔ کیا ہمارا ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہے؟ اپنے مکان کے اسباب آرائش ہی کو دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ذرا ذرا سی بات کے لئے ہم اقوام غیر کے محتاج ہیں اور روز بروز ہوتے جا رہے ہیں، آپ کا لمپ جرمنی میں بنا ہے۔ اس کی چمنی آسٹریلیا میں تیار ہوئی ہے اس کا تیل روس سے آیا ہے اور گندھک کی سلائی جس سے یہ لمپ روشن کیا جاتا ہے سویڈن یا جاپان سے پہنچی ہے۔ کلاک جو آپ کی نشست گاہ کی دیوار پر آویزاں ہے، امریکہ کے کارخانوں میں تیار ہوا تھا۔ اور وہ چھوٹی سی گھڑی جو آپ کی جیب میں ٹک ٹک کر رہی ہے جنیوا کے کاریگروں کی صنعت کا نمونہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پہننے کا کپڑا، ہاتھوں کی چھڑی، چاقو قینچی، دروازوں کی چلمنیں اور روزمرہ کے استعمال کی صدہا چیزیں غیر ملکوں کے کارخانوں میں تیار ہو کر آپ کے پاس پہنچی ہیں۔ ایسے حالات میں جب مصنوعات و تجارت کی طرف سے ہمارا ملک غافل ہو۔ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم مصاف زندگی میں جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے کامیاب ہوں گے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے ملک سے کپاس، چائے، کوئلہ، اور مصالح خام کی اور صورتیں ممالک غیر کو جاتی ہیں مگر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ بدقسمت وہ ملک ہے جو ممالک غیر کے لئے مصالح خام کا ایک ذخیرہ ہو اور مصنوعات کے لئے ان کا محتاج ہو۔ وہ ملک جس کا دار و مدار صرف زراعت پر ہو۔ جیسا کہ ہندوستان کا ہے، ترقی کی دوڑ میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی آبادی کی ضروریات پورا کرنے کی کوئی اور راہ نہ اختیار کرے۔ جب تک ہندوستان صنعتی ملک نہ ہوگا اور ہم جاپانیوں کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہوں گے۔ اس وقت تک قدرت ہمیں قحط کے تازیانے لگاتی رہے گی۔ طرح طرح کی وبائیں ہمیں ستاتی رہیں گی جس سے ہم جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ضعیف و ناتواں ہوتے جائیں گے۔

وہ مصاف زندگی جو آج کل اقوام عالم میں شروع ہے، اس کے نتائج بعض اقوام کی صورت میں یقیناً خطرناک ہوں گے۔ ایک ایسی جنگ ہے جس کو مسلح سپاہیوں کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے سپاہی وہ ہنرمند دستکار ہیں جو خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے ملک کے کارخانوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں اگر کسی قوم کی قوت کا اندازہ کرنا مطلوب ہو تو اس قوم کی توپوں اور بندوقوں کا معائنہ نہ کرو بلکہ اس کے کارخانوں میں جاؤ اور دیکھو کہ وہ قوم کہاں تک غیر قوموں کی محتاج ہے اور کہاں تک اپنی ضروریات آپ [illegible] پہنچا ہوں کہ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو

تعلیم کی تمام شاخوں سے زیادہ صنعت کی تعلیم پر زور دینا چاہیئے۔ واقفان کے روسے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو قوم تعلیم کی نہایت ضروری شاخ کی طرف توجہ نہ کرے گی۔ وہ یقیناً ذلیل و خوار ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ صفحہ ہستی پر اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمان بالخصوص اس سے خالی ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنی غفلت کا خمیازہ نہ اٹھائیں۔ میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتے ہوں اور اگر میرے دل کی پوچھو تو میں سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس بڑھئی کے ہاتھ جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے ہو گئے ہیں۔ ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوبصورت ہیں اور مفید ہیں جنھوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا۔

سرور جہاں آبادی

بھارت

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں

خون جگر سے سینچیں ہر نخل آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں

ایک ایک گل میں پھونکیں روح شمیم وحدت
ایک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں

فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنج دلکش
سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں

چھایا ہو ابر رحمت کا شانۂ چمن میں
رم جھم برس رہی ہوں چاروں طرف گھٹائیں

مرغان باغ بن کر اڑتے پھریں ہوا میں
نغمے ہوں روح افزا اور دلربا صدائیں

حب وطن کے لب پہ ہوں جانفزا ترانے
شاخوں پہ گیت گائیں پھولوں پہ چہچہائیں

چھائی ہوئی گھٹا ہو، موسم طرب فزا ہو
جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

اس کنج دلنشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا
جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا

بلبل کو ہو چمن میں صیاد کا نہ کھٹکا
خوش خوش ہو شاخ گل پر غم ہو نہ آشیاں کا

حب وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں
لہجہ جدا ہو گرچہ مرغان نغمہ خواں کا

ایک ایک لفظ میں ہو تاثیر بوئے الفت
انداز دلنشیں ہو ایک ایک داستاں کا

موسم ہو جوش گل کا اور دن بہار کے ہوں
عالم عجیب دلکش ہو اپنے گلستاں کا

مل مل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

برج نرائن چکبست

خاک ہند

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے

تیری جبیں [illegible] ہے
اللہ رے [illegible] کیا اوج عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ قدرت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاک دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری   چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری   چشم و چراغ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو   سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو   سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیرا اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے   اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے   فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں   کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں   پستی سی آگئی ہے پیروں کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبّ وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا   دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا   اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں!
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے   بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے   اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک   رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک   ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے

اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا

تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا ہے رشک مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو

مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

۳۔ انگریزی راج اور احساسِ غلامی

حضور آئے نوابی کے انتشار کے بعد
ہزار حیف کہ فالج گرا بخار کے بعد
(اکبر)

حالی

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں — قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں — قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا — بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دنیا و درم
تعرف الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم — دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سن کے اک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا
ہے سفر موری کے کیڑے کے لئے باغِ ارم

اکبر الہ آبادی

دلّی دربار

سر میں شوق کا سودا دیکھا — دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا — کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

خیموں کا اک جنگل دیکھا — اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور وزنگل دیکھا — عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

کچھ چہروں پر مردی دیکھی — کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی — دل نے جو حالت کر دی دیکھی

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا — بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا

منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا   دل دربار سے اٹکا دیکھا

سرخی سڑک پہ کٹتی دیکھی   سانس بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی   مفت کی دولت لٹتی دیکھی

اک کا حصہ من وسلوا   ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا   میرا حصہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا   پرتو تخت وتاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا   رخ کرزن مہاراج کا دیکھا

پہونچے پھاند کے سات سمندر   تحت ہیں ان کے بیسوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر   اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوج بخت ملاقی ان کا   چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی، ساقی ان کا   آنکھیں میری، باقی ان کا

برٹش راج

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج   کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو   کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے   تمہاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی   جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
طرح طرح کے بنالو لباس رنگا رنگ   علاوہ روئی کے ریشم بھی ہے اور اول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی   کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہے عیاں انجن   کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے
شگفتہ پارک ہیں ہر طرف رہرو ان کے لئے   نظر نواز ہے پتی حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

تصویر درد

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
الہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیات جاوداں میری نہ مرگ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں کہ ہر اک گل کی ہے گویا خزاں میری

(۲)

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں ہم کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(۳)

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

(۴)

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو
شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
بھرا کرتے نہیں مجروح الفت فکر درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

(۵)

بیاباں محبت دشت غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے
مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا اس میں علاج گردش چرخ کہن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو

غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سفینۂ برگ گل بنالے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

۴۔ سیاسی بیداری کی پہلی لہر

چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
شبلی

شبلی نعمانی

شہر آشوب اسلام

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خونچکاں کب تک

یہ مانا گرمئ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑ کر یہ دامان حرم کو بھی نہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں　　تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب وامان شام و نجد و قیرواں کب تک

ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں

کل مجھکو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے　　دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر　　بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر　　نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں، بے خبر نشۂ شباب　　ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ　　مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار　　از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر　　لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا　　جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں

علمائے زندانی

پہنائی جا رہی ہیں علمائے دیں کو زنجیریں　　یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی　　تو مجھ کو سستیٔ بازوئے قاتل سے شکایت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے　　عروسِ مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نو خیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں　　کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

ابوالکلام آزاد

مشہد اکبر

ادرنہ کا دردناک نظارہ کانپور میں

زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہئے۔ لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے۔ مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے۔ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے کس کا؟ مسلمانوں کا؟ آخرکار سرزمین کانپور پہ خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش وخروش میں ہے۔ اپنی قربانگاہ کے لئے نذر مانگتی ہے۔ کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے؟ صوبہ متحدہ کا بادشاہ (مسر جیمس مسٹن) بالآخر بادشاہ آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا۔ جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا۔ وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی۔ وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے۔ لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے۔ وہ تیری محبت ووفاداری کا امتحان لیتی ہے۔

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہمالیہ! تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تند وتیز ہوا کو روک دیتا ہے تو ہر غیظ وغضب کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے کیا تو ہمارے شدائد ومصائب کا طوفان نہیں روک سکتا۔ کیا تو ہمارے حزن وغم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا؟

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذہب کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا وہ احترام اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا، برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا اس سے بھی کم جتنا ایک راستے کی زینت وآرائش کا؟

اگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے۔ بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف وناتواں وغیر مسلح مجمع پہ گولی برسا رہے تھے، انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانی عدل وانصاف کو زخمی کر رہی ہیں؟ انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پہ حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے؟ وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کرتے ہیں، نادانو تم تو اس سے عداوت کر رہے ہو جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔ وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست وپا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، با چشم نم وبا دل پر غم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی وبیکسی کا نشان تھا۔ کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ اور اس کی زبان پہ وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم واسمٰعیل کی زبان پہ جاری تھی۔

یہ پراثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوتی ہے اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر ایک گولیوں کی چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے۔ پردہ جب چاک ہوتا ہے میدان میں خاک وخون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں۔ جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں جو افسوس دم توڑ چکیں۔
گورنمنٹ کا فرشتۂ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں چودہ لاشیں تھیں۔ پھر بتاتا ہے اٹھارہ لاشیں تھیں بعقیدت مند

دل اس کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن عقل حجت طلب کو کیونکر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں دس پندرہ ہزار آدمیوں کا مجمع ہے۔ پولس نے بے محابا دس منٹ تک بے پروائی سے ان پر گولیاں برسائی ہے۔ ہر گولی ایک دور کے فاصلے تک پھیلتی ہے اور صرف ۱۰ لاشیں ان کے صدمے سے گر پڑتی ہیں۔ مسلمان اپنی روئیں تنی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کو مسرور ہونا چاہئے کہ گورنمنٹ پریس بھی ان کے اس اعجاز کو تسلیم کرتا ہے۔

حکومت قانون کے ماتحت ہے لیکن افسوس ہم زبان کے ماتحت ہیں۔ ہم پر گورنمنٹ کا قانون حکومت نہیں کرتا۔ ہم پر حکام کی زبان حکومت کرتی ہے۔ ایک ضعیف و کمزور مجمع جس کے ہاتھ میں کوئی آلۂ ضرر نہیں۔ جو کسی انسان کا محترم خون نہیں گراتا جو کسی کی جائداد و عزت پر حملہ نہیں کرتا تھا لیکن اس کی تادیب کے لئے عدالت کے کمرے اور قید خانوں کی کوٹھریاں نہیں بلکہ سنگین کی نوکیں اور بندوقوں کی گولیاں تھیں۔ برٹش مورخ ہم کو بتا سکتا ہے کہ برسٹل اور مانچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں ان آتش بار ہتھیاروں سے کام لیا گیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو حوالہ دے گا کہ برسٹل اور کانپور میں کتنی مسافت ہے؟ لیکن اے معصوم مورخ! برائے خدا ہمیں بتا کہ برسٹل اور کانپور کی ذی روح حقیقتوں میں کتنا فصل ہے؟

نصرانی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عورتوں میں روح نہیں، لیکن اے مقدس نصرانی! پیغمبر ناصرہ کے لئے بتا کہ تیرا یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں روح نہیں۔ ہاں روح ہے لیکن تو نے ان کو بے جان کر دیا۔ کیا تجھکو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ " تو خون مت کر"

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کہتی ہے کہ معاملہ انہدام مسجد کے لئے مسلمانان کانپور میں کوئی جوش نہیں۔ صرف بیرونی مسلمانوں کا جوش ہے ——— واقعہ قتل عام سے پہلے بھی یہ غلط تھا، کہ اگر یہ سچ تھا تو مسلح سپاہی وقت انہدام مسجد کو کیوں گھیرے تھے؟ سنگینوں اور بندوقوں کے ہیبتناک نظاروں سے کن کن کو ڈرایا جا رہا تھا؟ اور اب تو حکومت متحدہ کو خود نظر آرہا ہوگا کہ لوازم تدبر و سیاست سے اس کا خزینہ حکمت کس قدر تہی تھا۔

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کی شہادت ہے کہ مسلمانان کانپور کا جوش جرائد اسلامیہ کی برافروختگی اور طعن و تشنیع و ملامت کا نتیجہ ہے لیکن وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو طعنہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے جوش و غیرت کی حقیقت صرف چند الفاظ ہیں، صوبہ کا نیم سرکاری اخبار "پانیر" اور پھر وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو کہا تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کا جولانگاہ صرف قلم کا میدان ہے شہنشاہی انگلستان کی نیم سرکاری زبان ٹائمز۔

سر جیمس مسٹن نے قصداً مسلمانوں کو چھیڑا اور ان کے اس جوش اور ولولۂ اسلامی کو جھوٹا کہا جو تیرہ سو برس سے جھوٹا نہ ہوا تھا۔ انھوں نے ان زیر خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا جو تیرہ سو برس سے اسی طرح روشن ہے۔ سر جیمس مسٹن کے یقین کے لئے دلیل چاہئے تھی۔ فرزندان اسلام بڑھے اور انھوں نے مقتل عام میں جا کر جسمانی پردہ جو فرمانروائے صوبہ کے سامنے حائل تھا، الٹ دیا، اور دنیا کو نظر آگیا کہ درحقیقت اس پردے کے پیچھے سرخ انگارے تھے جو خود دوسروں کو نہ پھونک سکے پر خود کو پھونک دیا۔

سر جیمس مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لئے کسی اور دلیل کے طالب ہیں۔ اگر حقیقت میں ان کی طلب صادق ہے اور ان کی کوشش کامل ہے تو ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہے۔ جو اسیران بدافنت ملی کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں۔ انھیں خبردار رہنا چاہئے کہ زنجیروں کی آہنی جسمانیت دوسری آہنی جسمانیت سے ٹکرا کر شعلہ نہ پیدا کرے۔

صوبہ متحدہ کا طرز حکومت اسی وقت ایک خونیں منظر کا اشارہ کر رہا تھا۔ جب اس کا فرمانروا ایک طرف اسٹریچی ہال (علی گڈھ) میں اور دوسری طرف مقامی دربار (گورکھپور) میں ایک اسپیکر کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ "بزور اس جوش کو فرد کر دوں گا" آخر ۳ راگست کو اس وقت جب وہ بریلی میں تھا اور ایک مسلمان ریاست (رامپور) اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اس نے بزور اس جوش کو فرد کر دیا۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش میں مقتول و مجروح ہوئے کہ یہ ان کی خصوصیت ملی ہے۔ ایک ہزار

تین سو برس ہوئے کہ مسجد خلیل کی بقائے حرمت کے لئے سر بکف ہیں، لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی تھی۔ اس سے وہ خود تو مجروح نہیں ہو گئی؟

شہدائے کانپور کی یاد ہمارے دل میں ہر وقت تازہ رہے گی۔ ہم ان کی برسی منائیں گے۔ ہم ان کا مرثیہ پڑھیں گے۔ ہم ان کی مظلومی اور بیکسی کو ہر وقت یاد رکھیں گے، ہم ان کے جوش حمایت دینی، مدافعت ملی کو روئیں گے، ہم آئندہ سے ۳ اگست کی صبح کو، محرم کی دوپہر سمجھیں گے کہ یہ ہماری مظلومیت کی پہلی قسط تھی۔

۴ اگست کی صبح کو ہز آنر لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ اسپیشل ٹرین سے کانپور پہنچ کر پہلے قتل گاہ تشریف لائے۔ جہاں انھیں نے دیکھا ہوگا کہ صرف ایک انسانی ضد اور غلط کاری نے جو گورنمنٹ کے منشائے قانون کے بالکل غیر مطابق تھی۔ اس دیوار کے نیچے جہاں چند روز پہلے تینوں نے ایک معبد اسلام کی بے حرمتی کی تھی، پرستاران دین حنیف دیوار کی ایک ایک اینٹ کو اپنے خون کا سرخ کفن پہنا رہے تھے۔ کہ اس کی ہر اینٹ دین توحید کی سرو لاش تھی۔ انھوں نے اپنے گرم خون کے چھینٹے دئے کہ ان بے جان لاشوں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے تمام ہندستان کو لرزا دیا۔

ہندستان لرزتا ہے، کون ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقف فریاد ہے کون ہے جو اس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو؟

مقتولین کانپور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے۔ ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے؟ لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہ ملا، گولیوں اور بندوقوں کی قطع برید کے بعد تمہارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے۔ غزوہ نبی لحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھالی تھیں، ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اگر اخفائے راز کے لئے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھا لیا کہ رضوان الٰہی ان کا منتظر تھا۔

مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں۔ نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے؟ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں؟ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے؟ تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا۔ جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا،

معصوم بچو! اور ریاض اسلام کے نو دمیدہ غنچو! تمہیں کس نے مرجھا دیا؟ سر جیمس مسٹن کے الفاظ طعن نے تمہارے بے گناہ دنا آشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا۔ تم بڑھے کہ اپنے دہن زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو۔ اے طائران قدس! اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اقبال

حضور رسالت مآب میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا   جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا
قیود شام و سحر میں بسر تو کی لیکن   نظام کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھکو
حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھکو
کہا حضور نے اے عندلیب باغ حجاز   کلی کلی ہے تری گرمئ نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوش جام ولا ہے دل تیرا   فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز

اڑا جو بستیٔ دنیا سے تو سر گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز

نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا

ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ظفر علی خاں

دعوت عمل

اگر تم کو حق سے ہے کچھ بھی لگاؤ تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ

حکومت کو تم نے لیا آزما اب اپنے مقدر کو بھی آزماؤ

ہو تم جس کے ذرّے وہ ہے خاک ہند چھپے ہیں جو اس میں وہ جوہر دکھاؤ

فلک پر مہ و مہر پڑ جائیں ماند زمیں پر اس انداز سے جگمگاؤ

ہمالہ بھی آجائے گر راہ میں تو ٹھکرا کے آگے سے اس کو ہٹاؤ

کرے تم سے گنگا بھی گر بے رخی پلٹ کر الٹ دو تم اس کا بہاؤ

زمانے میں روشن کرو نام ہند ہر اقلیم میں اس کا سکّہ چلاؤ

ہر اک ملک کا ہاتھ میں لے کے دل ہر اک قوم سے اپنی عزت کراؤ

پسینہ گرے ہندوؤں کا جہاں وہاں تم مسلمان کا خون بہاؤ

زمیں ہو جب اس خون سے لالہ زار تو اس پر بساط اخوت بچھاؤ

پرانا ہوا دفتری اقتدار سمجھ لو اب اس کا بھی ہے چل چلاؤ

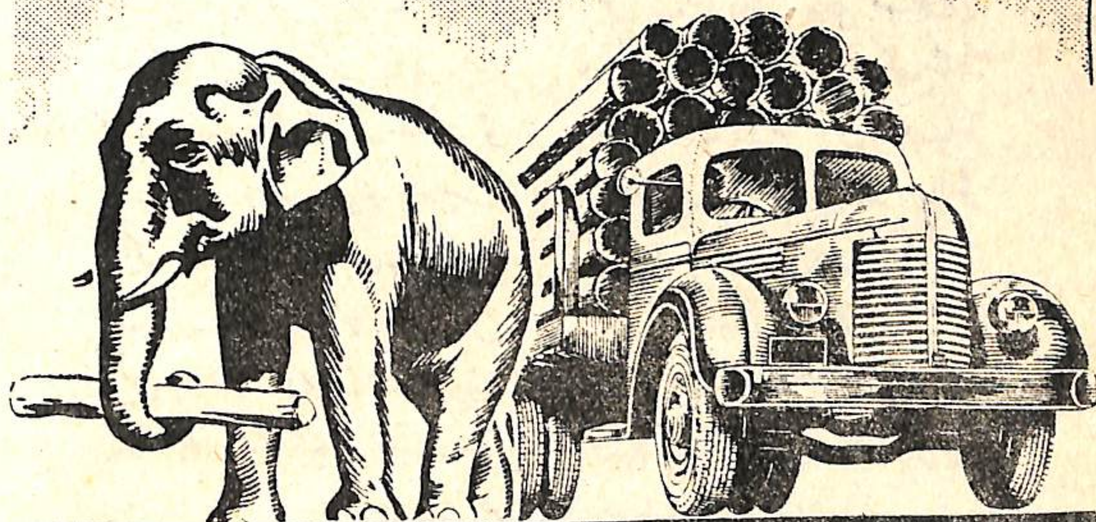
کسی روز خود غرق ہو جائے گی

بہت بہہ چکی ہے یہ کاغذ کی ناؤ

ڈنلپ

کی پچاسویں (۵۰) سالگرہ

۱۹۴۸ — ۱۸۹۸



پچاس سال کا کامیاب تجربہ

ہمیشہ آگے رہے ہیں — ہمیشہ رہنمائی کریں گے

DJX 1

دوسرا حصّہ

۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۹ء تک

۱۔ پہلی جنگ عظیم اور اس کے نتائج

۲۔ تحریک خلافت اور عدم تعاون

۳۔ انقلاب، مزدور، کسان

۴۔ سول نافرمانی کی تحریک اور اس کے بعد

پہلی جنگ عظیم اور اس کے نتائج

" زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدروں نے پھنکاریں ماریں مگر نہ تو ایسی درندگی آج تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے نگلنے، چیرنے، پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں"

ابوالکلام آزاد

ابوالکلام آزاد

جنگ عظیم

موت اور ہلاکت کے وہ اوقات المیہ جو خون کی رگوں اور گوشت کے ریشوں کے اندر سے انسان کی جانوں کو کھینچ لیتے ہیں اور آبادیاں اجاڑ اور زندگیاں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ وہ ارواح حروب و قتالی جو زندگی کے لئے موت کا اور آبادی کے لئے ویرانی کا دروازہ ایسی عجلت اور آسانی سے کھول دیتی ہیں، گویا کسی لپٹی ہوئی تہہ کو کھول دیا گیا۔ وہ ہلاکت اور موت کی عظیم الشان ہستیاں جن پر انسان پاش توپیں لدی ہوئی ہیں اور آگ اور خون کے خونخوار درندے سوار ہیں، اور جو سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی ہیں تاکہ اپنے اپنے شیون و امور کی تدبیر کریں، ان سب کی چھائی ہوئی ہیبت، دہشت اور پھیلی ہوئی وحشت کی قسم، اور ان سب کی پھیلائی ہوئی موت اور برسائی ہوئی ہلاکت کی گواہی، کہ ارض الٰہی کا امن ڈوب گیا۔ انسانیت کی بستی اجاڑ ہو گئی۔ نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا۔ اور دنیا مثل اس بیوہ کے ہو گئی جس کا شوہر زبردستی قتل کر دیا گیا ہو، اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے لٹے ہوئے سنگھار پر ماتم کرے گی۔ اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اتار دے گی۔ کیونکہ اس کا حسن زخمی ہو گیا۔ کیونکہ اس کا شباب پامال کر دیا گیا، اور اس لئے کہ اس کے فرزندوں نے اس پر تلوار اٹھائی اور اس لئے کہ اس کے دشمنوں نے اسے کچل دیا۔ اس زندگی کی جگہ موت، عیش و سلامتی کی جگہ اضطراب، نغمہ نشاط کی جگہ شور ماتم، زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی، آب زندگی کی جگہ بحر خونیں، بستیوں کی جگہ قبریں اور زندگی کے کاروبار اور بازاروں کی چہل پہل کی جگہ موت کے وہ جنگل ہیں جن پر لاشیں سڑیں گی اور ہولناک سمندروں کے وہ خونیں طوفان جن میں انسان کی لاشیں مچھلیاں بن کے چھپیں گی اور اے دنیا کے بڑے بڑے مغرور شہروں کے بسنے والو! کل تک تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا تھا تاکہ زندگی پر گھمنڈ اور طاقت پر مغرور رہو۔ پر آج تم کہ موت کے کھلونے ہو جنہیں بگاڑ دیا جائے گا۔ اور ہلاکت کی مورتیں ہو جنہیں مٹا دیا جائے گا اور پھر اے وہ کہ تمدن کی بہشت، علم کے مرغزار اور عیش و نشاط زندگی کے حیرت آباد اور اعجوبہ زار تھے! تم کل تک دوسروں کی موت و ہلاکت کی خبریں سنتے تھے۔ پر آج تمہاری ہلاکت کی خبر پڑھی جائے گی۔ کل تک تمہارے پاس کرۂ ارضی کی مصیبتوں کا قلم تھا۔ جو آج تمہاری مصیبتوں کی تاریخیں مدون ہوں گی۔ تم کل تک دوسروں پر ظلم و قہر کرتے تھے، پر آج تم پر ظلم کیا جائے گا۔ تم کل تک دوسروں کے لئے آگ سلگاتے تھے، پر آج تمہارے لئے جہنم بھڑک رہی ہے۔ تم کل تک ضعیفوں اور ناتوانوں کے لئے درندے تھے پر آج درندوں میں خود چل گئی ہے اور بھیڑیوں نے ایک دوسرے پر پنجہ مارا ہے۔ کل

مشرق کی بربادیوں کا تم نے تماشا دیکھا تھا، آج وہ تمہاری ہلاکت کو دیکھ رہا ہے۔

انسان کی سوئی ہوئی درندگی اور بہیمیت پھر جاگ اٹھی ہے۔ وہ اشرف المخلوقات کی صورت سے آدمی مگر خواہشوں میں بھیڑیا، محل سرائوں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ اب اپنی خوں ریزی کی انتہائی شکل اور اپنی مردم خواری کے سب سے زیادہ برے وقت میں آگیا ہے۔ وہ کل تک اپنے کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دار العلوموں میں انسان تھا۔ پر آج چیتے کی کھال اس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑئے کے پنجے اس کے دندان تبسم سے زیادہ نیک ہیں، درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے جنگلوں میں امن و راحت ملیں گی۔ مگر اب انسانوں کی بستیاں اور اولادِ آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہوگئی ہیں۔

شیر خونخوار ہے مگر غیروں کے لئے، سانپ زہریلا ہے مگر دوسروں کے لئے۔ چیتا درندہ ہے مگر اپنے سے کمتر جانوروں کے لئے۔ لیکن انسان، دنیا کی اعلیٰ ترین مخلوق، خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہاتا ہے اور اپنی ہی ابنائے نوع کے لئے درندہ و خونخوار ہے۔

یہ دنیا کی مغرور فتحمند طاقتوں کی ٹکر ہے، اور اتنی بڑی انسانی درندوں کی لڑائی جتنے بڑے خونخوار اسباع و بہائم آج تک کرۂ ارضی پر پیدا نہیں ہوئے۔ دنیا نے ٹیٹس کے قصے سنے ہوں گے جس نے یروشلم کو تباہ کردیا، دنیا نے بخت نصر کو دیکھا ہے جو بنی اسرائیل کو گرفتار کرکے بابل لے گیا دنیا میں ایرانیوں کے قہر و استیلا کے افسانے سنے گئے ہیں۔ جنھوں نے بابل کو مسمار کردیا تھا۔ اور رومیوں کے عہد تسلط و عروج کے ایسے بہت سے فاتح خوں ریزوں کی روائتیں محفوظ رکھی گئی ہیں۔ جنھوں نے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو بہت ستایا اور اس کی زمین پر بہت فساد کیا۔ لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آسے اور موت و ہلاکت پھیلانے کی ایسی اشد شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدروں نے پھنکاریں ماریں۔ مگر نہ تو ایسی درندگی آج تک کسی میں تھی جیسی موجودہ تمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے اور چیرنے پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں۔ پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے۔ اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرور طاقت سے جھوم رہی ہے اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں، اس بھیڑئے کو دیکھو جو مشرق یورپ کے بھٹ سے جھپٹا ہوا آتا ہے اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لامارک اور روسو کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لئے بلا ہے! یہ کیسے مہیب ہیں؟ یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں۔ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا، پھاڑنا کرۂ ارضی کا کیسا ہولناک بھونچال ہوگا۔ ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا۔ ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا۔ ایسی آتش فشانی جو کبھی بھی نہ ہوئی اور خداوند کا ایسا غصہ جو اب تک کبھی زمین پر نہ ہوا۔

شبلی نعمانی

جنگ یورپ اور ہندوستان

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہ غرور | آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم | اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل | آئیں شناس شیوہ بیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعوے غرور | دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے | تم کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جوش ملیح آبادی

زمانۂ جنگ

ہر چیز پر سکوت ہے ہر شئے پہ یاس ہے — غم حکمراں ہے دہر میں دنیا اداس ہے
جلوے ہیں شام غم میں نہاں صبح عید کے — دھندلے ہیں خط و خال عروس امید کے
کشتی رواں ہے زیست کی دریائے زہر میں — بجلی تڑپ رہی ہے مسرت کی لہر میں
عالم ہے شاخ گل میں عجب پیچ و تاب کا — کانٹے ہیں اور پھول نہیں ہے گلاب کا
لذت اڑی ہے خواب سے وسعت خیال سے — اب آئینہ سے قوت برقی جمال سے
صبحیں چھپی ہیں قہر کی پرہول رات میں — دوڑا ہے زہر چشمۂ آب حیات میں
تابندگی کے راز سے محرم نہیں رہے — وہ روئے گل پہ قطرۂ شبنم نہیں رہے
فطرت کو انتظام پہ قدرت نہیں رہی — پانی گھٹا میں، پھول میں رنگت نہیں رہی
سینوں میں قلب برف کے مانند سرد ہیں — بس حد ہوئی کہ چہرۂ خوباں بھی زرد ہیں
سلطاں بڑھے ہیں دہر کے لشکر لئے ہوئے — اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لئے ہوئے
یہ جنگ کیا ہے ایک مجسم جنون ہے — گلزار کائنات کے نقالوں میں خون ہے
خلقت تمام قحط سے بے آب و دانہ ہے — اس پہ وبا کا زور یہ کیسا زمانہ ہے
عالم کے بام و در میں مریضوں کی آہ ہے — دنیائے طب، ہجوم مرض کی گواہ ہے
نسخوں سے تھک گئی ہیں غریبوں کی انگلیاں — نبضوں نے کیں فگار طبیبوں کی انگلیاں
اب حد کے اختیار میں قیمت نہیں رہی — ڈاکہ رہا ہے رسم تجارت نہیں رہی
خنجر سے غم کے رشتۂ آرام کٹ گیا — شعلے سے آشتی کے اندھیرا لپٹ گیا
ہستی کی مملکت میں تباہی کا راج ہے — ہشیار ہو کہ فرق مصیبت پہ تاج ہے

چکبست

آوازۂ قوم

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار — ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار

لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار — ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

نگاہ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی — ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی — چلے ہیں بہر زیارت وفا کے سودائی
وطن سے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

ہے آجکل کی ہوائیں وفا کی بربادی — سے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی — اڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی
ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

جو آج کل ہے محبت وطن کی عالمگیر — یہی گناہ یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پہنائی ہے زنجیر — بیان درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر
ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

فدائیان حکومت نے ہم کو رنج دئے — مگر جو فرض وفا تھے ادا وہ ہم نے کئے
نثار جاں سے ہوئے داب سلطنت کے لئے — شراب عشق سمجھ کر لہو کے گھونٹ پئے
ڈگے نہ پاؤں محبت کے نوک خنجر پر
لہو کی مہر ہے اپنی وفا کے محضر پر

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی — نگاہ شوق کو ہے دور نو کی مشتاقی
نئی شراب نیا دور اور نیا ساقی — مئے سرور ہیں دیر و حرم کی ناچاقی
یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دیر رہے
یہ میکدہ رہے آباد خم کی خیر رہے

ظفر علی خاں

نوشتۂ تقدیر

تواناؤں کے بس میں ہے سراپائے حقارت ہے — کروڑوں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا
دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینے میں — کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا

ہے جن کے دل میں آزادی کی دھن ان نوجوانوں کو
وطن کے عشق کی پاداش میں سولی پہ لٹکانا
بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی خاک اٹک کے پار خاک وخوں میں تڑپانا
ملوکیت پرستوں کے لئے یہ سب کچھ آساں ہے
مگر دشوار ہے قانون قدرت کا بدل جانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہو جس کو ٹکرانا

شعلہ فانوس ہند

زندہ باد اے انقلاب اے شعلۂ فانوس ہند
گرمیاں جس کی فروغ مشعل جاں ہو گئیں
بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی تاریکیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں
جن بلاؤں سے گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم
تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہو گئیں
جتنی بوندیں تھیں شہیدان وطن کے خون کی
قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں
مرحبا اے نو گرفتاران بیداد فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں
زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں

مظالم پنجاب

میں نے امرت سر میں اک دن اپنے خواجہ سے کہا
پیٹ کے بل رینگ لیجے بندہ پرور آپ بھی
ایک تہہ آماس کی تا فربہی پر جائے چڑھ
کھائیے ہر روز صبح و شام ہنٹر آپ بھی
ناک سے کچھ دن زمیں پر کھینچتے رہئے لکیر
پھیرئے کونجی سفیدی کی بدن پر آپ بھی
بعد مغرب جائیے مسجد کو اور اس جرم میں
پیٹھ پر کھوائیے چابک سے مسطر آپ بھی
سجدہ ٹوپی کو نہ کیجئے اور اس کے ساتھ ساتھ
درس جبل فن میں کا پڑھئے فر فر آپ بھی
چلئے سولہ میل دن میں ہانپتے اور کانپتے
پاؤں میں کچھ روز ڈالے رہئے چکر آپ بھی
بسئے جا کر جیل میں اور کھائیے ارہر کی دال
میہماں رہئے ذرا سرکار کے گھر آپ بھی
پھر یہ کہئے مارشل لا حشر تک قائم رہے
ورنہ ہوں گے منکر جنرل او ڈائر آپ بھی

جلیان والا باغ

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنّ الملوک — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن — تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں! — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

۲۔ تحریک خلافت اور عدم تعاون

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

جوش ملیح آبادی

ابوالکلام آزاد

بیان

کلکتہ کورٹ میں

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیاروں کا کام دیا ہے، عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف و ناانصافی دونوں کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔

دنیا کے مقدس بانیان مذہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانہ کے انقلاب سے عہد قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنہ وسطیٰ (مڈل ایجز) کی پراسرار انکویزیشن وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے ہیں ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرادی گئیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے لیکن ان دلوں کو کون بدسکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں۔

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہوسکی، ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کئے گئے، ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لئے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فرانس کے فداکار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے جو اپنی معلومات و مشاہدات اس لئے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے سامنے ان کا اظہار جرم تھا۔ یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے برے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کئے جاتے ہیں۔ اتنی بڑی ہستی کے لئے بھی ناموزوں جگہ نہیں۔

میں بیان کیوں دیتا ہوں؟ میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا وہی متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے کے دکھلا نہیں سکتی اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں

میں جانتا ہوں کہ قانون عدالت کی رو سے یہ میرے فرائض میں داخل نہیں ہے میری جانب سے پراسیکیوشن کے لئے یہی بہت بڑی مدد ہے کہ میں نے ڈیفنس نہیں کیا۔ لیکن حقیقت کا عدالت کی حیلہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے۔ یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہوگا کہ ایک بات صرف اس لئے

پوشیدہ رہنے دی جائے کہ مخالف اپنی عاجزی کی وجہ سے ثابت نہ کرسکا۔

۲

ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ایسا ہی حاکمانہ اقتدار ملک وقوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ اقتدار قومی بیداری کے نشوونما اور آزادی و انصاف کی جدوجہد کو دشمن رکھتا ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اس کی غیر منصفانہ طاقت کا زوال ہے اور کوئی وجود اپنا زوال پسند نہیں کرتا۔

اگرچہ از روئے انصاف کتنا ہی ضروری ہے۔ یہ گویا تنازع للبقا کی ایک جنگ ہوتی ہے جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فوائد کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ قومی بیداری چاہتی ہے کہ اپنا حق حاصل کرے۔ قابض طاقت چاہتی ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے فریق کی طرح آخر الذکر بھی قابل ملامت نہیں کیونکہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا وجود انصاف کے خلاف واقع ہوا ہو۔

ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہو گیا ہے اس لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ فرشتے کی طرح معصوم ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے کیونکہ اس نے خطاؤں کے اقرار سے ہمیشہ انکار کیا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے مسیح ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ پھر میں کیوں امید کروں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی؟ وہ تو وہی کرے گی جو کر رہی ہے اور جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلے میں کیا ہے۔ پس یہ ایک قدرتی معاملہ ہے جس میں دونوں فریق کے لئے شکوہ و شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دونوں کو اپنا اپنا کام کئے جانا چاہئے۔

البتہ میں نہیں جانتا کہ ان دونوں فریقوں میں سے کس فریق کے اندر بڑے انسان کی تعلیم تلاش کی جائے جو برائی کے مقابلہ میں صبر و عفو کی تعلیم لے کر آیا تھا، گورنمنٹ میں یا ملک میں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ بیوروکریسی کے حکام اس کے نام سے واقف نہ ہوں گے اس کا نام مسیح تھا۔

فلسفۂ تاریخ ہمیں بتلاتا ہے کہ نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہمیشہ زوال پذیر طاقتوں کی رفیق ہوتی ہے۔ گورنمنٹ نے خیال کیا کہ وہ جبر و تشدد سے تحریک خلافت و سوراج کو پامال کر دے گی اور ۲۴ کی ہڑتال رک جائے گی لیکن جبر و تشدد جب قومی بیداری کے مقابلہ میں نمایاں ہو تو وہ مہلک چیز نہیں ہوتی، نہ تو ہڑتال رک سکی نہ خلافت اور کانگریس کمیٹیاں معطل ہو سکیں۔ میں نے ۸ ر دسمبر کو جو پیغام ملک کے نام لکھا تھا اس میں گورنمنٹ بنگال کے لئے بھی یہ پیغام تھا۔ "میری اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی گرفتاری کے بعد کام زیادہ مستعدی اور طاقت کے ساتھ جاری رہے گا۔ اور ۲۴ کو ہڑتال اس سے زیادہ مکمل ہوگی جس قدر ہماری موجودگی میں ہو سکتی تھی۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گورنمنٹ خود اپنے پسند کئے ہوئے میدان میں ہار گئی اب وہ اپنی شرم چھپانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور جن لوگوں کو گرفتار کر چکی ہے انھیں کسی نہ کسی طرح سزا دلانا چاہتی ہے لیکن یہ بالکل بے سود ہے۔ طاقتور آدمی کو شکست کے بعد زیادہ غصہ آتا ہے لیکن کوئی شکست اس لئے فتح نہیں بن جا سکتی کہ ہم بہت زیادہ جھنجھلا سکتے ہیں۔

نان کوآپریٹرس کے مقدمات آج کل جس طرح چکائے جا رہے ہیں اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لا اور آرڈر کے معنی بیوروکریسی کی اصطلاح میں کیا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نان کوآپریٹر کسی طرح کا ڈیفنس نہیں کرتے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے تاکہ شریف آدمی آنکھیں بند کرلیں۔ ... شریف آدمیوں نے تو سچ مچ آنکھیں بند کر لی ہیں۔ لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں۔

فی الحقیقت لا اور آڈر کا ایک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ جسے ہم کامیڈی اور ٹراجیڈی دونوں کہہ سکتے ہیں۔
وہ تماشہ کی طرح مضحک بھی ہے اور منظر کی طرح درد انگیز بھی لیکن میں ٹریجیڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ حسن اتفاق سے اس کا چیف ایکٹر انگلستان کا چیف جسٹس ہے۔

۳

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے گذشتہ ۲ سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ (گورنمنٹ کے خلاف) اور اسی مطلب کے لئے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لئے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴ الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔
یقیناً میں نے کہا ہے، موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے لیکن اگر میں نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔
میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں۔ یہی ہے۔ ایسی ملفوف صداقت جو اس سے کم ہو میرے علم میں کوئی نہیں۔

میں یقیناً کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔
گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے اور اگر باز نہیں آسکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہو جانا چاہیئے یا مٹ جانا چاہیئے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟ جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ درست کبھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔ میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس محکومی سے ملک اور قوم کو نجات دلاؤں۔

"اصلاحات" اور "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی نہیں پیدا کر سکتا آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہیئے بعینہٖ ایسی ہے جیسے کہا جائے کہ مالک کو اس کی جائیداد اور قرضدار کو اس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کر کے دینا چاہیئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکا تو قرضدار کو یہ ہی کرنا پڑے گا۔ کہ قسط کی صورت میں وصول کرے لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتہ ہوگا۔ اس سے یک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو سکتا۔

"ریفارم" کی نسبت روس کے عظیم الشان لیو ٹالسٹائی کے لفظوں میں کہوں گا "اگر قیدیوں کو اپنے ووٹ سے اپنا جیلر منتخب کر لینے کا اختیار مل جائے تو اس سے وہ آزاد نہیں ہو جائیں گے۔"
میرے لئے بیوروکریسی کے اچھے برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے۔ پہلا سوال خود اس کے وجود کا ہے میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز یقین کرتا ہوں اگرچہ وہ عام ناانصافیاں ظہور میں نہ آئیں جو اس کثرت سے واقع ہو چکی ہیں جب کبھی میرے اعتقاد میں، وہ ظلم تھا کیونکہ اس کی ہستی ہی سب سے بڑی ناانصافی ہے اور اس کی برائی کے لئے اس قدر کافی ہے کہ وہ موجود ہے
برائی میں کم و کیفیت کے اعتبار سے تقسیم کی جاتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھی چوری اور بری چوری؟ پس بیوروکریسی کی اچھائی

اور برائی کے جائز ہونے کا تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ فی نفسہ ناجائز عمل ہے۔ ہندوستان کی بیوروکریسی تو اتنا بھی نہ کرسکی کہ اپنی خلقی برائی ہی پر قائم رہتی ہے جب اس کی خلقی برائی پر اس کی بے شمار عملی برائیوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے تو پھر کیونکر اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کا اعلان نہ کیا جائے۔

غرضیکہ اس بارے میں میرا اقرار بالکل صاف اور واضح ہے موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کے لئے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لئے تازیانے کی ضرب سے بے ہوش ہوجانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بت کی طرح یونین جیک کو سلام نہیں کرتے وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی وہ اپنے تمام وعدوں کو توڑ دینے سے کوئی عیب نہیں سمجھتی۔

مجھ پر سڈیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے لیکن مجھے بغاوت کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا بغاوت آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابل احترام حب الوطنی بھی ہے۔

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہیں لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرہ آیا ہے۔ تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرہ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہوگی۔ وقت اس کا جج ہے وہ فیصلہ لکھے گا۔ اور اسی کا فیصلہ آخری ہوگا۔

ظفر علی خاں

اعلان جنگ

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کردیا ۔۔۔ باطل سے حق کو دست و گریبان کردیا

سر رکھدیا رضائے خدا کی حریم پر ۔۔۔ خنجر کو پھر حوالۂ شیطان کردیا

ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر ۔۔۔ آزادی حیات کا سامان کردیا

دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز ۔۔۔ کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کردیا

دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق ۔۔۔ ملت کی مشکلات کو آسان کردیا

شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد ۔۔۔ گویا انھیں دو قالب و یک جان کردیا

اوراق جبر و جور و جفا کو بکھیر کے ۔۔۔ شیرازہ سلطنت کا پریشان کردیا

ظلم و ستم کی ناؤ ڈبونے کے واسطے ۔۔۔ قطرے کو آنکھوالوں کی آنکھوں میں طوفان کردیا

تن من کیا نثار خلافت کے نام پر ۔۔۔ سب کچھ خدا کے نام پر قربان کردیا

پروردگار نے کہ وہ ہے آدمی شناس ۔۔۔ گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کردیا

جوش ملیح آبادی

شکست زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

زنداں کا گیت

لو آ گیا وہ کوئی گلستاں لئے ہوئے
چہرے پہ رنگ صبح درخشاں لئے ہوئے

کلیاں ہر اک روش پہ چٹکنے لگیں تمام
گوہر فشانیٔ لب خوباں لئے ہوئے

نکلا فضا پہ صبح کا وہ نقرئی جلوس
گلبانگ طائران خوش الحاں لئے ہوئے

یہ رنگ کیا ہے کشور ہندوستاں کا آج
ہر ذرۂ حقیر ہے بستاں لئے ہوئے

یعنی ہر ایک ذرہ ہے خون وفا سے سرخ
اور سرخیاں ہیں روضۂ رضواں لئے ہوئے

اس موج خوں سے دل میں نہ لانا کبھی ہراس
یہ موج خوں ہے لعل بدخشاں لئے ہوئے

اس ترک اشتداد سے ہونا نہ بدحواس
یہ ترک ہے خروش فراواں لئے ہوئے

ان کروٹوں کو اہل قفس کی سبک نہ جان
یہ کروٹیں ہیں موجۂ طوفاں لئے ہوئے

ظاہر ہیں بزدلی ہے یہ درماندگی مگر
یہ بزدلی ہے جنگ کا ساماں لئے ہوئے

آگاہ ہو ندیم! کہ یہ زہر یہ صبر
دل میں ہے عزم شعلۂ عریاں لئے ہوئے

آزادیوں کے دیکھ رہا ہے لطیف خواب
زندانیان عشق کو زنداں لئے ہوئے

جوش اہل دل کے پاؤں کی زنجیر پر نہ جا
یہ سلسلہ ہے زلف پریشاں لئے ہوئے

اسیری

(مولانا محمد علی کی گرفتاری پر)

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

گاندھی

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کمزور کی کمند ہے دنیا میں نارسا
نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
پس کر ملے گا گرد رہ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما
بولا یہ سن کے بانی کمال وقار سے
وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا

خارا حریف سعئ ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ است در بن دنداں خلال را

فتح سمرنا میں انگریزوں کی شکست پر

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خون شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے
غبار رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانان تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریان آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر تابندہ تر پائندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کا پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولا نگہ اطلس قبایان تتاری ہے

(طلوعِ اسلام)

۳- انقلاب مزدور اور کسان

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
اقبال

اقبال

سرمایہ محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پہ رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحر الموط نے تجھکو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداری جمہور ہے سامان عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی تھی بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات

محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالق اعصار و نگارندۂ آنات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندۂ فلزات

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بے کاری و عریانی، و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کی فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

فرشتوں کا گیت

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند.. بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام — عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق بے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

فرمان خدا

(فرشتوں سے)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنمارا بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بے زار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

سرمایہ دار اور مزدور

کارخانے کا ہے مالک مردک ناکردہ کار — عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
کہہ گئے ہیں لیس للانسان الا ما سعیٰ — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

جوشؔ ملیح آبادی

روس کا رجز

رواں ہے تیغ میری گردن غفلت شعاری پر
مرا دل خون ہے مزدور کی فریاد وزاری پر
جھکے ہیں کشت دہقاں پر مرے اڈے ہوئے بادل
تپاں ہے برق میری گردن سرمایہ داری پر
عرق ہے میری ہیبت سے جبین شہریاری پہ

زوال جہانبانی

تبسم کی ہوائیں چل رہی ہیں صحن عالم میں
بکھرنے پر ہے شیرازہ کتاب اشک باری کا
جھپکنے ہی پہ ہے اب آنکھ عفریت غلامی کا
فسانہ ختم ہے اب غیر کی خدمت گذاری کا
رکابیں تھام کر چلنے لگے تھے جو حریفوں کی
سبق دہرا رہے ہیں پھر سے مشق شہسواری کا
دھمک پیدا ہے پھر چھوٹی ہوئی نبضوں میں مشرق کی
کلیجہ خون ہے پھر مغربی تیمارداری کا
نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمار فطرت کی
تلاطم میں ہے قصر آہنی سرمایہ داری کا
شہان کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شان دارائی

ہزاروں تجربوں کے بعد اب انساں یہ سمجھا ہے
کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا
نہ ہو چین جفا جب تک جبین شہریاری پہ
نہیں ہوتا کلاہ خسروی سے بانکپن پیدا
امید اس سے نہ رکھ ناداں امرغان خوش الحاں کی
ہمیشہ جس بیاباں سے ہوئے زاغ و زغن پیدا
جہاں اگتے ہوں نیزے اس زمین قہر فطرت سے
سمجھتا ہے کہ ہوں گے سرو و شمشاد و سمن پیدا
اٹھائے گا کہاں تک جو نیاں سرمایہ داری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

نہ ہو مغرور اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی
گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی
گئے وہ دن کہ تو محرومیٔ قسمت پہ روتا تھا
ضرورت ہے تجھے اب آفتوں پہ مسکرانے کی

تڑپ پیہم تڑپ اتنا تڑپ برق تپاں بن جا
خدارا اے زمین بے حقیقت آسماں بن جا

ساغر نظامی

روس

چمن میں آج جو ہے پا بہ گل بہ مجبوری — وہ کل بہار کو دے گا پیام منصوری
بغور دیکھ عجب کاری حریف فرنگ — کہ خاک خشک سے پیدا ہے چشمۂ نوری
نصیب روس میں جاگا غریب دہقاں کا — بنا ہے نخل تمنا ستون دستوری
اٹھا دُ تیشۂ فرہاد مسند خسرو — چمک اٹھا ہے زمانے میں بخت مزدوری
اپج سہی مگر انسان سوزیاں تو مٹیں — وطن میں پھیل گئی موج روح جمہوری
رہا نہ خطرۂ سرمایہ داری افراد — رہی نہ کوئی امیر و غریب میں دوری

اک انقلاب مسلسل کا دور ہے جاری
قبائے نو کہ ہے جسم قدیم پہ بھاری

اسرار الحق مجاز

خواب سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پہ — رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پہ
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا — دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعی خام بھی ہوتی رہی — اہل دل پہ بارش الہام بھی ہوتی رہی
آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے — نیک بندے بھی خدا کے کام کرتے ہی رہے
ابن مریم بھی اٹھے موسیٰ عمراں بھی اٹھے — رام و گوتم بھی اٹھے فرعون و ہاماں بھی اٹھے
اہل سیف اٹھتے رہے اہل کتاب آتے رہے — ایں جناب اٹھتے رہے اور آنجناب آتے رہے
حکمراں دل پہ رہے صدیوں تلک اصنام بھی — ابر رحمت بن کے چھایا دہر پہ اسلام بھی
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے — مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا — درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی — دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی
اہل باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے — جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتل عام — آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

جوش

کسان

طفل باراں، تاجدار خاک، امیر بوستاں — ماہر آئین قدرت، ناظم بزم جہاں
ناظم گل، پاسبان رنگ و بو، گلشن پناہ — ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام — منکشف جس کی فراست پر مزاج صبح و شام
خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار — جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب — اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ — مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی — جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ — جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں — کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر — جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر نیش غم کھاتے ہوئے — دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکی حرماں سے راہ — فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار — گھر کی ناامید دیوی کا شباب سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا — بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا
سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں — گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے — یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے
بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات — کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی — بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
ادعائے پیروی دین و ایماں اور تو — دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو
ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں — کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بیتاب ہیں

مجاز

سرمایہ داری

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

قیامت اس کے غمزے جان لیوا ہیں ستم اس کے
ہمیشہ سینۂ مفلس پہ پڑتے ہیں قدم اس کے

کہیں یہ خون سے فرد مال و زر تحریر کرتی ہے
کہیں یہ ہڈیاں چن کر محل تعمیر کرتی ہے

بظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اس نے
مگر کل باغ عالم کو جہنم کر دیا اس نے

درندے سر جھکا دیتے ہیں لوہا مان کر اس کا
نظر سفاک تر اس کی، نفس مکروہ تر اس کا

جدھر چلتی ہے بربادی کے ساماں ساتھ چلتے ہیں
نحوست ہم سفر ہوتی ہے شیطاں ساتھ چلتے ہیں

یہ اکثر لوٹ کر معصوم انسانوں کو راہوں میں
خدا کے زمزمے گاتی ہے چھپ کر خانقاہوں میں

جواں مردوں کے ہاتھوں سے یہ نیزے چھین لیتی ہے
یہ ڈائن ہے بھری گودوں سے بچے چھین لیتی ہے

یہ عزت چھین لیتی ہے، حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے
زمانہ چیخ اٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہے

گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہے
مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پہ لڑکھڑاتی ہے

مبارک دوستو لبریز ہے اب اس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیاد کاشانہ

علی سردار جعفری

ایک سوال

معلوم نہیں عقل کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے

لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا
طوفان گرو کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے

سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے

وہ زیر افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے

پیشانی افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

ساحر لدھیانوی

طلوع اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں

جاگے ہیں افلاس کے مارے، اٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے

چوک چوک میں گلی گلی میں سرخ پھریرا لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت امڈے آتے ہیں

شاہی درباروں کے در سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں

شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے

رسوا بازاری خاتونیں حق نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں

روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے

جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکر بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر ایک بھبھکتا شعلہ ہو کر

کاندھوں پر سنگین کدالیں، ہونٹوں پر بیباک ترانے
دہقانوں کے دل نکلے ہیں، اپنی بگڑی آپ بنانے

آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
ابھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے

راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیل بے پایاں نہ رکے گا

کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جباروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِ الٰہی، منہ اترے ہیں غداروں کے

ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

کیفی اعظمی

حقیقتیں

آج ہر دن سے زیادہ ہے ہلاکت کا اثر
درد رگ رگ میں ہے دوہری ہوئی جاتی ہے کمر

یہ گرانی یہ مرا خرچ یہ کچھ سکۂ زر
قرض خواہوں کی یورش ہوگی ابھی سے گھر پر

اور گھر میں غم عسرت کے سوا کچھ بھی نہیں

اف یہ سکے یہ شب و روز کی محنت کا مآل
جن کا پانا بھی وبال اور نہ پانا بھی وبال

جن کو مٹھی میں ذرا دیر ٹھہرنا ہے محال
کھینچ لیتا ہے جنھیں سود ستانوں کا جلال

حق مرا ان پہ زیارت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ رفیقہ وہ مری مونس اخلاص پناہ
جس کی مدقوق جوانی ہے مصائب کی گواہ

دامنِ قصد تبسم میں سمیٹے ہوئے آہ دیر سے ہوگی مرے واسطے جو چشم براہ
نذر کو اس کی ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں

پنجۂ مرگ سے ہستی کو چھڑاؤں کیوں کر لوٹ کو رسم کے آئین سکھاؤں کیوں کر
فرقِ زر پائے مشقت پہ جھکاؤں کیوں کر گردِ افلاس کو اکسیر بناؤں کیوں کر
میرے قبضے میں تو محنت کے سوا کچھ بھی نہیں

بینک بہ بینک یہ فردوس ہوس جنت زر یہ لچکتی ہوئی لبریز خزانوں کی کمر
بحرِ بے آب وتلاطم کے یہ خوش آب گہر باغِ بے خار وخزاں کے یہ طلاپوش ثمر
ہاں مری فالتو محنت کے سوا کچھ بھی نہیں

راس آتا ہے جنہیں مشغلۂ جور وجفا جن کی آنکھوں میں شرارت ہے طبیعت میں دغا
خونِ مفلس سے کیا کرتے ہیں جو کسب حنا ان کی دنیا میں سبھی کچھ ہے مصیبت کے سوا
میری دنیا میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں

لوٹ کے منہ پہ یہ تقسیم ازل کا پردہ قالبِ عدل میں ڈھالی ہوئی یہ روح جفا
لوحِ افلاس پہ یہ کتبۂ منشائے خدا طاقِ ہستی میں یہ رکھا ہوا بت قسمت کا
اک عمل سوز سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں

گلشن جور کی سم ریز خزاں پاش بہار دوزخ زر کے اڑائے ہوئے جاں سوز شرار
نفع خوروں کی نگاہوں میں لچکتی تلوار بڑھتے جاتے ہیں شب وروز یہ سارے آثار
کہ علاج اس کا بغاوت کے سوا کچھ بھی نہیں

پریم چند

نیور

آسماں پر چاندی کے پہاڑ اڑ رہے تھے، ٹکرا رہے تھے۔ گلے مل رہے تھے۔ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کبھی سایہ ہو جاتا تھا کبھی تیز دھوپ چمک اٹھتی تھی۔ برسات کے سوکھے دن تھے امس ہو رہی تھی۔ ہوا بند ہو گئی تھی۔

گاؤں کے باہر کئی مزدور ایک کھیت کی مینڈھ باندھ رہے تھے۔ ننگے بدن پسینے میں تر کچھنی کسے ہوئے، سیاہ فام، سب کے سب پھاوڑے سے مٹی کھود کھود کر مینڈھ پر رکھتے جاتے تھے۔ کئی دن قبل بارش ہوئی تھی۔ اس سے مٹی نرم ہو گئی تھی۔

گوبر نے اپنی کانی آنکھ مٹکا کر کہا "اب تو ہاتھ نہیں چلتا بھائی، گولا بھی چھوٹ گیا ہوگا۔ چلو چبینہ کر لیں۔"

نیور نے ہنس کر کہا " یہ مینڈھ تو پوری کر لو پھر چبینہ کر لینا۔ میں تو تم سے پہلے آیا تھا۔"

دینو نے جھوا سر پر اٹھاتے ہوئے کہا "تم نے اپنی جوانی میں جتنا گھی کھایا ہوگا۔ نیور دادا، اس کا تو ہمیں پانی بھی میسر نہیں،"
نیور پستہ قد گٹھے بدن سیاہ۔ پھرتیلا آدمی تھا۔ عمر پچاس سے زائد تھی۔ مگر اچھے اچھے نوجوان محنت میں اس کا لوہا مانتے

تھے۔ ابھی دو تین سال پہلے تک کشتی لڑتا تھا۔ جب سے گھر کی گائے مری کشتی لڑنا چھوڑ دیا۔ مول کے دودھ میں گذارا کہاں؟

گوبر نے پھر نیور کو چھیڑا۔ "تم سے بے تمباکو پئے کیسے رہا جاتا ہے نیور دادا، یہاں تو چاہے روٹی نہ ملے۔ لیکن پاؤ بھر تمباکو ضرور چاہیئے۔"

نیور اپنے کام میں مصروف تھا۔ نوجوانوں کی گلکب میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دنیا نے اسے باتوں میں لگانے کی دوبارہ کوشش کی ــــ تو یہاں سے جاکر روٹی پکاؤ گے دادا، تمہاری بڑھیا کیوں کام نہیں کرتی۔ ہم سے تو دادا ایسی مہریا سے ایک دن نہ پٹے۔

یہ کوشش کارگر ہوئی۔ نیور کے پچکے ہوئے، کھچڑی مونچھوں سے ڈھکے چہرے پر تبسم کی نورانی لکیر کھنچ گئی۔ جس نے اس کے کریہہ منظر میں بھی ایک حسن پیدا کر دیا، بولا:۔ جوانی تو اسی کے ساتھ گئی ہے بیٹا ــــ اب اس سے کوئی کام نہیں ہوتا تو کیا کروں؟

گوبر نے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ نہیں، کام کیوں نہ کرتی۔ مجھے سے کھاٹ پر بیٹھی چلم پیا کرتی ہے اور سارے گاؤں سے لڑا کرتی ہے۔ تم بوڑھے ہو گئے لیکن وہ تو اب بھی جوان بنی ہوتی ہے۔

دینا نے اور رونا جمایا ــ جوان عورت کیا اس کی برابری کرے۔ سیندور، کاجل، مسی، مہندی، ان سنگاروں میں تو جیسے اس کا من بستا ہے۔ جب دیکھا کنار دار رنگین ساڑھی ہی پہنے دیکھا اس پر گہنے الگ۔ گہنوں سے تو اس کا جی نہیں بھرتا، تم گؤ ہو، اس سے نباہ ہو جاتا ہے نہیں تو اب تک گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

گوبر نے تھوڑے دن پہلے اپنی عورت کو اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ کام چور تھی اور کھانے میں حاتم۔

دینا بولا:۔ مجھے تو اس کے بناؤ سنگار پر گسہ آتا ہے، کچھ کام نہ کرے گی۔ کھانے پینے کو اچھا ہی چاہیے گی،

نیور نے جیسے اپنی صفائی دی ـــ تم کیا جانو بیٹا، تب تم لوگوں کا جنم بھی نہیں تھا۔ جب وہ آئی تھی۔ تو میرے گھر میں سات ہل چلتے تھے وہ رانی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ تھی بھی بڑے گھر کی بیٹی ــــ مجور لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ جمانہ بدل گیا، تو کیا ــــ اس کا دل تو وہی ہے۔ گھڑی بھر چولھے کے سامنے بیٹھ جاتی ہے تو آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور سر تھام کر پڑ رہتی ہے۔ مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا۔ اسی دن کے لئے تو آدمی سادی بیاہ کرتا ہے۔ نئی گرہستی میں جنجال کے سوا اور کیا رکھا ہے۔ یہاں سے جاکر روٹی پکاؤں گا پانی لاؤں گا۔ تب بڑی مشکل سے دو کور کھائے گی۔ نہیں مجھے اپنی کیا چنتا تھی۔ تمہاری طرح چار پھنکی مار کر ایک لوٹا پانی چڑھا لیتا، جب سے بٹیا مر گئی تب سے وہ اور بھی ٹوٹ گئی۔ یہ بڑا بھاری دھکا لگا۔ اس کو ماں کی ممتا ـــ ہم تم کیا سمجھیں گے بیٹا۔ پہلے تو میں کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا تھا، اب تو اس کو دیکھ کر درد آجاتا ہے۔

دینا نے پوچھا ــــ "تم کل ادھکہ پر کاہے کو چڑھ رہے تھے۔ ابھی تو گور نہیں لگی۔

نیور کے چہرے پر رقت جھلک اٹھی بولا ــ "اس بکری کے لئے پتیاں توڑ رہا تھا۔ بٹیا، بٹیا، اسی کا دودھ پیتی تھی ـــ اب بچاری بڑھیا ہو گئی ہے دودھ کیا دے گی۔ لیکن یہ کیسے بھول جاؤں کہ بٹیا اسی کا دودھ پیتی تھی ــــ

گھر پہنچ کر نیور نے لوٹا اور ڈول اٹھایا اور نہانے چلا کہ بیوی نے کھاٹ پر لیٹے لیٹے کہا۔ اتنی دیر کیوں کر دیتے ہو، آدمی کام کے پیچھے جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے، جب مجوری سب کو برابر ملتی ہے تو کام بھی برابر کرو، کوئی ایک دھیلا بیسی تو نہیں دے دیتا ــــ

نیور کے فضائے دل پر سنہرے بادلوں کی طرح ایک مستانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لفظوں کی مٹھاس نے جیسے اس کے وجود کے ایک ایک ذرے ذرے کو مٹھاس میں سرابور کر دیا۔ اس بے غرضانہ محبت میں کتنا درد، کتنی دل جوئی، کتنی خیر اندیشی بھری ہوئی تھی، اور دوسرا کون ہے، جسے اس کے آرام کی، اس کے مرنے جینے کی فکر ہو۔ پھر وہ کیوں نہ اپنی بڑھیا کے لئے مرے سرور میں آکر بولا۔ تم اس جنم میں کوئی

دبوچ رہی ہوگی ! بڑھیا ـــــ سچ ، بڑھیا نے میٹھی جھڑکی دی ـــ " اچھا رہنے دو یہ چاپلوسی ، ـــ ہمارے آگے اب کون بیٹھا ہوا ہے جس کے لئے اتنی ہائے ہائے کرتے ہو ، ۔

نیور دس گز کی چھاتی لئے نہانے چلا گیا ۔ لوٹ کر اس نے موٹی موٹی روٹیاں پکائیں ، آلو چولھے میں ڈال دئے تھے ان کا بھرتا بنایا تب دونوں ساتھ کھانے بیٹھے ،

بدھیا نے مسرت سے کہا ـــ " میری جات سے تمہیں کوئی آرام نہیں ملا ، پڑے پڑے کھاتی ہوں اور تمہاری چھاتی پر مونگ دلتی ہوں ۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا ، کہ بھگوان مجھے اٹھا لیتے "

" بھگوان آئیں گے تو میں کہوں گا ۔ پہلے مجھے لے چلو ، تب اس سونی جھونپڑی میں کون رہے گا "

" تم نہ رہوگے تو میری کون دسا ہوگی یہ سوچ کر میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ میں نے کوئی بڑا پُن کیا تھا کہ تمہیں پایا کسی اور کے ساتھ میرا کیا نباہ ہوتا "

اس انکسار میں کتنا نشہ تھا ۔ نیور کی ایک ایک رگ مخمور ہو اٹھی ، اس کے پہلے بھی کتنی ہی بار یہ مسئلہ چھڑا تھا ۔ اور یوں ہی چھوڑ دیا گیا تھا ۔ لیکن نہ جانے کیوں نیور نے اپنے حق میں فیصلہ کر لیا تھا ۔ کہ پہلے میں جاؤں گا ۔

اس کے بعد بھی بدھیا جب تک جئے آرام سے رہے ، کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے ۔ اس لئے وہ مرتا رہتا تھا کہ ہاتھ میں چار پیسے ہو جائیں ، سخت سے سخت کام جس کے لئے کوئی نہ کھڑا ہو ، وہ نیور کے ہاتھوں انجام پاتے ۔ دن بھر پھاوڑے ، کدال کا کام کرنے کے بعد رات کو وہ ایکھ کے دنوں میں کسی کی ایکھ پیلتا یا فصل کی رکھوالی کرتا ۔ لیکن دن نکلتے جاتے تھے ۔ اور جو کچھ کماتا تھا وہ بھی نکلتا جاتا تھا ۔ بدھیا کے لئے کوئی آسرا نہ تھا ۔

لیکن آج کی باتوں نے نیور کے دل میں ہیبت ڈال دی تھی ۔ سچ مچ کہیں بدھیا ہی نہ چلی جاوے ۔ پانی میں ایک بوند رنگ کی طرح خیال اس کے دل میں سما کر گھلنے لگا ۔

گاؤں میں نیور کے لئے کام کی کمی نہ تھی ۔ پر مزدوری تو وہی ۔ ملتی تھی ۔ جو اب تک ملتی آئی تھی ۔ اس کی دبا زاری کے زمانے میں وہ مزدوری بھی نہ رہ گئی تھی ۔ کہیں بدھیا پہلے چل بسی تو اس کے کریا کرم کے لئے تو ہاتھ میں ہونا چاہئے ۔ اس دھوم سے کام کرے گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں ۔

اسی دن اتفاق سے ایک مہاتما کہیں سے گھومتے گھامتے آ نکلے ۔ اور وہیں نیور کی جھونپڑی کے سامنے پیپل کے نیچے ان کی دھونی جل گئی ، گاؤں والوں نے سمجھا ۔ رہے نصیب ! باباجی کی خدمت اور ... کے سامان جمع ہونے لگے ۔ کہیں سے لکڑی آ گئی ۔ کہیں سے حال ۔ کہیں سے پوال ، کہیں سے بچھانے کو کمبل ۔ نیور غریب کے پاس کیا تھا ۔ باباجی کا بھوجن پکانے کی خدمت ، اس نے اپنے ذمے لے لی ۔ چرس آ گئی ، باباجی نے دم لگانا شروع کیا ۔ بھگتوں کی ایک جماعت نے بھجن گانے کی تیاریاں کیں ، ڈھول ، بھیرا ، کھڑتال آ گئے ۔

دو تین دن ہی میں باباجی کے کشف و کرامات کے چرچے ہونے لگے ۔ وہ روشن ضمیر ہیں ۔ ان کی نگاہ پر زمانے کی قید نہیں ۔ لوبھ تو چھو ہی نہیں گیا ۔ پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوتے اور بھوجن بھی کیا کرتے ہیں ۔ آٹھ پہر میں ایک لٹورا دودھ پی لیا ۔ یا ایک دو چمچہ کھچڑی کھالی ۔ لیکن چہرے پر کتنا جلال ہے ۔ جیسے شمع جل رہی ہو ، زبان کتنی میٹھی ہے ۔ سیدھا سادہ نیور باباجی کا خاص معتقد ہو گیا تھا ۔ اس پر کہیں باباجی کی دیا ہو گئی ، تو پارس ہی ہو جائے گا ۔ سارا دکھ دلدر دور ہو جائے گا ۔

آدھی رات ہو گئی تھی ۔ عقیدت مندوں کی جماعت رخصت ہو گئی تھی ۔ صرف نیور بیٹھا باباجی کے پاؤں دبا رہا تھا ۔
" باباجی نے فرمایا ـــ ، بچہ سنسار مایا ہے ، اس میں کیوں پھنسے ہو "

نیورنے فرط تعظیم جھکا کر کہا "—————— کیا کروں عورت ہے اسے کس پر چھوڑوں؟"

"تو سمجھتا ہے، تو ہی اس کا پالن کرتا ہے"

"اور دوسرا کون سہارا ہے، اسے باباجی"

"ایشور کچھ نہیں ہے تو ہی سب کچھ ہے"

نیور کا ضمیر جیسے نور عرفاں سے منور ہو گیا۔ میں اتنا مغرور ہوں، اتنا خود دماغ اتنا کور باطن، مزدوری کرتے کرتے جان نکلتی ہے اور میں سمجھتا ہوں میں ہی بدھیا کا سب کچھ ہوں، ایشور جو سارے سنسار کا پالن کرتے ہیں، تو ان کی مرضی میں دخل دینے والا کون ہے اس کے زود اعتقاد باطن سے ایک صدا سی نکل کر اس کی رگ رگ میں گونجنے لگی۔ تو اگیانی ہے۔ صرف اتنا بولا، آپ مجھے گیان دیجئے۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

باباجی نے حکمانہ انداز سے کہا۔ دیکھنا چاہتا ہے، ایشور کی لیلا ـ وہ چاہے تو تجھے چھن بھر میں لکھ پتی کر دے۔ چھن بھر میں تیری ساری چنتائیں مٹا دے، میں اس کا ادنیٰ غلام ہوں۔ کوّے کی بیٹ۔ لیکن مجھ میں اتنی کرامات ہیں کہ میں تجھے پارس بنا دوں، تو صاف دل، سچا، ایماندار آدمی ہے مجھے تجھ پر دیا آتی ہے میں نے اس گاؤں میں ایک ایک کو غور سے دیکھا ہے۔ کسی میں بھی اعتقاد نہیں۔ ایمان نہیں۔ تجھ میں میں نے بھگت کا دل پایا ——— بتا تیرے پاس کچھ چاندی ہے؟

نیور کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامنے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"دس پانچ روپے پڑے ہوں گے، مہاراج"

"چاندی کے ٹوٹے پھوٹے گہنے نہیں ہیں؟"

"گھروالی کے کچھ گہنے بھی ہیں"

کل رات کو جتنی چاندی مل سکے یہاں لا اور ایشور کی کرامات دیکھ۔ تیرے سامنے میں چاندی کو ایک ہانڈی میں کس کے بند کر کے اسی دھونی میں رکھ دوں گا۔ سویرے آ کر ہانڈی نکال لینا، مگر اتنا یاد رکھنا کہ ان اشرفیوں کو شراب جوا یا دوسرے کسی برے کام میں خرچ کیا تو کوڑھی ہو جائے گا۔ اب جا سو رہ ——— ہاں اتنا اور سن لے اس کا چرچا کسی سے مت کرنا، گھروالی سے بھی نہیں"

"نہیں"

نیور گھر چلا تو ایسا خوش تھا۔ گویا ایشور کا ہاتھ اس کے سر پر ——— رات بھر اسے نیند نہیں آئی۔ سویرے اس نے کئی آدمی سے دو دو چار چار روپے ادھار لے کر پچاس روپے جمع کر لئے، لوگ اس کا اعتبار کرتے تھے۔ کبھی کسی کا ایک پیسہ نہ دبایا تھا۔ وعدے کا پکا، نیت کا صاف، روپے ملنے میں دقت نہیں ہوئی پچیس روپے اس نے اپنی کمائی سے بٹور رکھے تھے۔ مگر بدھیا سے گہنے کیسے مانگے؟ ٹھگ کی طرح کے سوال پوچھنے لگیا کرو گے۔ کسی کو دے تو نہ دو گے۔ چکمہ دیا۔ تیرے گہنے بہت میلے ہو گئے ہیں بدھیا کھٹائی سے صاف کر لے۔ رات بھر کھٹائی میں رکھنے سے نئے ہو جائیں گے۔ تب میں ٹھٹیرے کے پاس لے جا کر نئے ڈورے میں گتھوا لاؤں گا۔ بدھیا جھکمے میں آ گئی۔ نیور کی جانب سے کسی قسم کا شبہ ہونا۔ کا امکان سے بعید تھا۔ ہانڈی میں کھٹائی ڈال کر گہنے بھگو دئے۔ جب رات وہ سو گئی تو نیور نے روپے بھی اس ہانڈی میں ڈال دئے۔ اور ہانڈی لئے باباجی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بھگت لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ مطلع صاف تھا۔ بابا نے بے اعتنائی کے

اندار سے ہانڈی لے لی۔ کچھ منتر پڑھ کر اس ہانڈی پر پھونکا اور ہانڈی کو دھونی کی راکھ میں رکھ کر نیور کو سورج نکلنے کے پہلے آنے کی تاکید کر کے رخصت کیا۔

رات بھر اشتیاق اور گدگدی کا مزہ لینے اور خوب خیالی پلاؤ پکانے کے بعد نیور منہ اندھیرے باباجی کے درشن کرنے گیا۔ سینہ بالسوں اچھل رہا تھا۔ کل یہ جھونپڑی جھونپڑی نہ رہے گی اور نہ یہ بدھیا اس حالت میں رہے گی۔ یہیں بدھیا کے نام پر ایک کنواں کھدے گا اور ایک مندر بنے گا۔ مگر نیور اسی طرح چار آنے روز کی مزدوری کرتا رہے گا۔ دولت پا کر آدمی اپنے کو نہ بھولے جب ہے، انزانے لگے تو کیا رہ گیا۔ ابھی آج باباجی دھونی کے پاس نہیں ہیں گئے ہوں گے ندی کی طرف، ان کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے کہہ دیا تھا۔ سورج نکلنے کے پہلے آکر ہانڈی نکال لینا ـــ چٹ دھونی میں ہاتھ ڈالا، ہانڈی ملی مگر بالکل خالی ـــ سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ پھر راکھ ٹٹولی۔ کچھ نہ ملا۔ کوئی ہانڈی سے نکال تو نہیں لے گیا۔ باباجی نے ہی تو کہیں احتیاطاً چھپا کر نہیں رکھ دیں۔ بدحواس ہو کر باباجی کی تلاش میں ندی کی طرف دوڑا، باغوں میں ڈھونڈا باباکی گرد بھی نہ ملی۔ مایوس ہو کر لوٹا۔ اور وہیں دھونی کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بھگت لوگ آنے لگے ـــ ارے باباکہاں گئے۔ کمبل بھی غائب یہ ماجرا کیا ہے؟"

ایک صاحب بولے، ایسے سادھوؤں کا کیا ٹھکانا۔ آج یہاں کل وہاں، ایک جگہ رہیں تو مایا جال میں نہ پھنس جائیں، لوگوں سے میل ومحبت ہو جائے۔"

دوسرے بھگت نے کہا ـــ پہونچے ہوئے تھے

"پورے سادھو"

"وہ تو چھو نہیں گیا تھا"

"نیور! ہاں، اس پر بڑی دیا کرتے تھے، اس سے کہہ گئے ہوں گے"

"نیور دفعتاً لاپتہ ہو گیا، اس کی تلاش ہونے لگی۔ اتنے میں بدھیا نیور کو پکارتی ہوئی گھر میں سے نکلی۔ پھر ہنگامہ برپا ہو گیا، بدھیا روتی تھی، اور نیور کو گالیاں دیتی تھی۔

نیور، کھیتوں کی مینڈوں پر بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ گویا دردھیاں سے نکل جائیگا۔ ادھر نیور کی بدنیتی کے قصے کھلنے لگے،

"کل ہم سے پانچ روپے لئے تھے، آج شام کو دینے کا وعدہ کیا تھا"

"ہم سے بھی دو روپے آج ہی کے وعدے پر لئے تھے"

"بدھیا روئی، وارھی جار، میرے سارے گہنے لے گیا۔ پچیس روپے جوڑ کر رکھے تھے۔ وہ بھی اٹھائے گیا"

ایک آدمی نے اسے ملامت کی، کیوں اسے گالی دیتی ہے، بدھیا تیرے لئے جان دیتا تھا۔ اور آج تو اسے گالیاں دے رہی ہے۔ اس کی نیت کبھی بدل ہی نہیں سکتی۔ اس بابا نے اسے چکمہ دیا ہوگا۔ بیچارہ سیدھا آدمی تھا۔ جھانسے میں آگیا۔ بڑا ٹھگ نکلا یہ بابا ـــ

قرائن اس شبہہ کی تصدیق کر رہے تھے

"نیور لاج کے مارے کہیں چھپا بیٹھا ہوگا؟"

" جو گنگا میں نہ کود پڑا ہو "،
" بابا ملے تو کچا ہی کھا جائیں "
تین مہینے گذر گئے ..

جھانسی ضلع میں دھسان ندی کے کنارے ایک بڑا گاؤں ہے، کاشی پور۔ ندی کے دوسرے کنارے ایک پہاڑی ہے، اس پر کئی دن سے ایک سادھو نے آسن جمایا ہے، ناٹے قد کا آدمی ہے۔ کالے توے کا سا رنگ۔ جسم گٹھا ہوا۔ یہ نیود ہے۔ جو سادھوؤں کے بھیس میں دنیا کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہی بھولا بھالا صاف دل، بے لوث نیود، جس نے کبھی پرائے مال کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی جو پسینے کی روٹی کھا کر مگن تھا۔ جو کبھی اپنے لئے نہیں ہمیشہ دوسروں کے لئے مرا، گھر کی اور گاؤں کی اور بدھیا کی یاد اس کے دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں اتری۔ اس زندگی میں کیا، پھر کوئی دن آئے گا کہ وہ اپنے گھر پہونچے گا۔ اور پھر اس دنیا میں ہنستا کھیلتا اپنی چھوٹی چھوٹی فکروں اور چھوٹی چھوٹی امیدوں کے ساتھ زندگی بسر کرے کتنی پر عافیت تھی وہ زندگی جتنے تھے ـــ سب اپنے تھے، سب ہی عزت کرتے تھے، ہمدردی کرتے تھے۔ دن بھر کی کڑی محنت کے بعد جب وہ تھوڑا سا اناج اور تھوڑے سے پیسے کر گھر آتا تھا۔ تو بدھیا اس سے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ وہ ساری محنت، ساری تھکاوٹ جیسے اس مٹھاس میں پک کر اور بھی میٹھی ہو جاتی تھی۔ آہ! وہ دن کب آئیں گے؟

نہ جانے، بدھیا کیسے رہتی ہوگی؟ کون اسے پان کی طرح پھیرتا ہوگا، کون اسے پکا کر کھلاتا ہوگا۔ گھر میں ایک پیسہ بھی تو نہیں چھوڑا گھیسے تک ڈبا دئے۔ اب اسے اس بابا پہ ایسا غصہ آیا کہ پا جائے تو خون ہی پی لے

اس کے خاص عقیدت مندوں میں ایک حسینہ بھی تھی۔ جسے اس کے شوہر نے کئی سال سے چھوڑ رکھا تھا، حسینہ کا باپ فوجی پنشنر تھا۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے لڑکی کی شادی کی۔ لیکن لڑکا اپنی ماں کا سعادت مند فرزند تھا۔ اور حسینہ اپنی ساس کو خوش نہ رکھ سکی وہ چاہتی تھی ساس سے علٰحدہ ہو کر شوہر کے ساتھ رہے۔ شوہر اپنی ماں سے الگ ہونے پر راضی نہ ہوا۔ ماں کی قربانیوں کو کیسے بھول جائے۔ بیوی روٹھ کر میکے چلی آئی تب سے تین سال ہو گئے تھے۔ اور سسرال سے ایک بار بھی بلاوا نہ آیا نہ شوہر ہی نے آنے کی تکلیف کی۔ نازنین کسی طرح اپنے شوہر کو اپنے بس میں کر لینا چاہتی تھی۔ مہاتماؤں کے لئے کسی کا دل کسی کی طرف سے پھیر دینا کیا مشکل ہے۔ ہاں ان کی نظر کرم چاہئے۔

ایک دن اس نے تخلیہ میں باباجی سے اپنی داستان غم سنائی، نیود کو جس شکار کی تلاش تھی۔ وہ آج بہت دنوں کے بعد پھنسا ہوا معلوم ہوا، تقدس کی شان سے بولا، میں نہ مہاتما ہوں، نہ کامل، نہ دنیا کے مایا جال میں پڑتا ہوں۔ لیکن تیری سردھا اور پریم دیکھ کر تجھ پر رحم آتا ہے بھگوان نے چاہا تو تیری مراد پوری ہو جائے گی،

اس انکسار نے اس کا رنگ اور بھی جما دیا، لڑکی نے اس کے قدموں پر سر رکھ کر عرض کی،
" آپ سب کچھ کر سکتے ہیں، مہاراج! مجھے آپ کے اوپر وشواس ہے "
" بھگوان جی کی جو مرضی ہوگی، وہ ہوگا، میں کچھ بھی نہیں ہوں "
" اس بدنصیب کا ڈونگا آپ ہی پار لگا سکتے ہیں
" ایشور پر بھروسہ رکھو "
" میرے ایشور تو آپ ہی ہیں "

تیور نے اس کی منتوں سے بہت مجبور ہو کر کہا، لیکن بیٹی اس کام میں بہت سے انوشٹھان (عملیات) کرنے پڑیں گے اور انوشٹھان میں سیکڑوں، ہزاروں روپے کا خرچ ہے، اس پر بھی تیری مراد پوری ہوگی یا نہیں، کہہ نہیں سکتا، ہاں میرے کئے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ میں کروں گا۔ مگر سب کچھ بھگوان کے ہاتھ ہے میں مایا کو ہاتھ سے نہیں چھوتا۔ لیکن تیرا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔

اسی رات کو اس غرض کی باؤلی نے اپنے گہنوں کی پٹاری باباجی کے قدموں پر رکھ دی، باباجی نے متنفر ہاتھوں سے پٹاری کھولی اور چاندنی کی روشنی میں زیوروں کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اب اگر اس میں کچھ عقل ہو، تو یہ ساری مایا ان کی ہے۔ وہ گویا ان کے سامنے دست بستہ کہہ رہی ہے۔ مجھے قبول کیجئے، کرنا ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں، محض پٹاری لے کر سرہانے رکھ لینا ہے اور لڑکی کو دعائیں اور تقویت دے کر رخصت کر دینا ہے۔ وہ سویرے آئے گی، اس وقت تک وہ اتنی دور ہوں گے جتنی دور ٹانگیں لے جائیں، ایسی غیر متوقع نعمت — جب وہ روپیوں سے بھری تھیلی لئے گھر پہنچیں گے، اور بدھیا کے سامنے رکھ دیں گے اس وقت بدھیا . . . . . .

لیکن نہ جانے کیوں اتنا ذرا سا کام بھی اس سے نہیں ہو سکتا وہ پٹاری کو اٹھا کر اپنے سرہانے کمبل کے نیچے دبا کر نہیں رکھ سکتا ہے کچھ نہیں، اس سے زیادہ آسان کام دنیا میں نہ ہوگا۔ مگر اس کے لئے ہمت چاہیئے، ہمت ناممکن ہے۔ ہفتخواں ہے، وہ پٹاری کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھا سکتا۔ ہاتھوں پر اس کا کوئی قابو نہیں ہے، جانے دو، ہاتھ سمجھ لو کٹ گئے، زبان پر تو اس کا قابو ہے۔ اتنا کہنے میں کونسی دنیا الٹی جاتی ہے کہ بیٹی پٹاری اٹھا کر کمبل کے نیچے رکھ دو، زبان کٹ تو نہ جائے گی۔ مگر اس پر حقیقت کھلتی گئی، کہ زبان پر بھی اس کا قابو نہیں ہے۔ آنکھوں کے اشارے سے بھی وہ کام نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن اس موقع پر آنکھیں بھی دغا دے رہی ہیں۔ دل کا بادشاہ اتنے وزیروں اور مشیروں کے ہوتے ہوئے بھی لاچار ہے ضعیف ہے لاکھ روپے کی تھیلی سامنے رکھی ہو، ننگی تلوار ہاتھ میں ہو۔ گائے مضبوط رسی سے سامنے بندھی ہو، کیا اس گائے کی گردن پر اس کے ہاتھ اٹھیں گے۔ غیر ممکن۔ کوئی خود اس کی گردن کاٹ لے مگر وہ گؤ کی ہتھیا نہیں کر سکتا۔ وہ غم نصیب مظلوم عورت اس کی نظروں میں اس گئو کی طرح بے زبان ہے قابل رحم تھی، جس موقع کو وہ اتنے دنوں سے تلاش کر رہا ہے۔ اسے پاکر آج اس کا ضمیر لرز رہا ہے۔ اور روح کانپ رہی ہے اس کی ہوس فطرت وحشی جانوروں کی طرح خونخوار ہے لیکن عرصہ دراز تک زنجیر میں بندھے بندھے اس کے ناخن گر گئے ہیں۔ اس کے دانت کمزور ہو گئے ہیں۔

اس نے فاتحانہ انداز سے کہا، — "بیٹی پٹاری اٹھائے جاؤ، تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔ میں تمہارا امتحان لے رہا تھا"

چاندنی کے اس پار درختوں کی گود میں محو خواب تھا۔ نیور آہستہ سے اٹھا۔ اور ایک طرف چل دیا، بھبھوت اور لنگ سے اسے نفرت ہو رہی تھی، اسے تعجب ہو رہا تھا۔ کہ وہ گھر سے نکلا ہی کیوں۔ تھوڑی سی رسوائی اور تضحیک کے خوف سے؟ نہیں ہمت کے زیر اثر دغا اور ریاء نے اس میں جن شیطانی جذبات کو برانگیختہ کیا تھا۔ ان سے مغلوب ہو کر، اور آج ایک معصوم، مظلوم آتما کے اعتقاد اور اعتماد میں اس نے اپنی کھوئی ہوئی حقیقت کو پھر پا لیا تھا۔ ایسا خوش تھا۔ گویا وہ زنجیروں سے آزاد ہو گیا ہو۔ ایک نئی سحر کا طلوع اس کی روح کو ایک نورانی ضیاء سے منور کر رہا تھا۔ اور اس کی رگ رگ سے اس کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

نیور آٹھویں دن اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ لڑکوں نے دوڑ کر، اچھل کود کر، ناچ کر، اس کے ہاتھ سے اس کی لکڑی چھین کر اس کا خیر مقدم کیا،

ایک لڑکے نے کہا — "کاکی تو مر گئی، نیور دادا،"

نیور کے پاؤں جیسے بندھ گئے [illegible] نہیں۔ کسی سے کچھ پوچھا

کبھی نہیں، پل بھر جیسے غشی کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر دیوانہ وار ایک بے خودی کے عالم میں اپنی جھونپڑی کی طرف چلا۔ لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ ان کی طفلانہ شرارت غائب ہو گئی تھی۔، نادانستہ طور پر وہ سب بھی اس حادثۂ غم سے متاثر ہوئے۔

جھونپڑی کھلی پڑی تھی۔ بدھیا کی چارپائی جوں کی توں بچھی ہوئی تھی۔ ایک گوشہ میں دو چار پیتل کے برتن پڑے ہوئے ننھے لڑکے باہر ہی کھڑے رہ گئے، اندر کیسے جائیں۔ وہاں بدھیا بیٹھی ہے۔

گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ نیور دادا آ گئے، جھونپڑی کے دروازہ پر بھیڑ لگ گئی، سوالات کی یورش ہونے لگی۔ تم اتنے دن کہاں تھے دادا! ۔ تمہارے جانے کے تیسرے دن کاکی چل بسی۔ رات دن تمہیں گالیاں دیتی تھی۔ مرتے دم تک تمہیں کوستی رہی۔ تیسرے دن ہم لوگوں نے دیکھا تو اکڑی پڑی تھی، تم اتنے دن کہاں رہے — وہ مکار بابا پھر نہیں دکھائی دیا۔ نہیں تو کھود کر گاڑ دیتے۔

نیور نے جواب نہ دیا، صرف مایوس، دردناک، مجروح، خالی آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتا رہا، گویا حس ہی نہ ہو۔ اس دن سے کسی نے اسے روتے یا ہنستے نہیں دیکھا، ہاں محنت وہ اسی طرح کرتا ہے اور اس کی مزدوری صرف دو روٹیاں ہیں۔

۴۔ سول نافرمانی کی تحریک، نیا قانون اور اس کے بعد

مسافر بھاگ وقت بیکسی ہے
ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
مجاز

اقبال

شعاعِ امید

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب،
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

گلہ

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلا تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

ظفر علی خاں

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

صدر اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا
کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لئے اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
اپنے پینے کے لئے شمپین بھر لی جام میں ہند کے رندان دُرد آشام کو ٹھرّا دیا
میوہ خوری کے لئے چننے لگے جب گول میز
رکھ لیا خود مغز چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا

جوشؔ ملیح آبادی

وفاق

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نوید گل اک بے پناہ جوک ہے، اک سخت بھول ہے
یہ بوستان اہل سیاست کی شاخ گل شیطان کے پاس باغ کی سوکھی ببول ہے
یہ ہے نیا نکاح کہ دولہا تو ہے خموش قاضی یہ کہہ رہا ہے کہ جی سے قبول ہے
ہشیار اہل ہند کہ پھر اس زمین پہ گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے

کہتے ہیں جس کو دولت بیدار اہل غرب — وہ اک متاع کاسد و جنس فضول ہے
ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

سعادت حسن منٹو

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی" اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا، تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اسی روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما رہا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے، جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کسی پیر کی بددعا ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا۔ اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی۔ جا۔ تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ــــ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا۔ اور کوئی اٹلی والا آ جائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے بددعا دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی ہی راج کریں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کسی گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو

اسے متلی سی آجاتی، نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریاں بھرے چہرے کو دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی۔ اور وہ شام کو اڈے میں آکر بل مارکہ سگرٹ پیتے ہوئے یا حقہ کا کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

. . . . . یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ سلگاتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی . . . جیسے کوڑھ ہو رہا ہو ۔۔۔ بالکل مردار ایک دھیلے کی مادر گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا۔ جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم۔ پہلے پہل جی میں آئی کہ سالے کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے . . ." یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندستان میں جدید قانون کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔ اور ہندستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا۔ اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا۔ چل بیٹا ۔۔۔ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی۔ اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے پر لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں عجیب وغریب طوفان برپا ہوگیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ـــ بہت بڑی خبر ـــ اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا" بار بار گونج رہا تھا۔ اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی۔ "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ـــ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہونچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ـــ سفید چوہوں کی (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا)، تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ "لا ہاتھ ادھر۔ ۔ ۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔ اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا۔ "تو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اس لئے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ انھیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصہ سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور نئے قانون کو خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے، نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں اب تک نہ آیا۔ ایسا فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ دیکھا نہ سنا گیا ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو پیدا ہوئی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے اس لئے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد

ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا: "ٹوڈی بچے"۔

جب کبھی کسی کو وہ ذہنی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگہ میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں۔ اگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔"

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں تو کچھ کمی ہوگی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی چیز سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!" وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا۔ جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی تھی۔ کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور اپنے ذہن میں وہ قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی اس سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخرکار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا۔ اور ہوا میں تازگی تھی۔

پہلی اپریل کو استاد منگو اٹھا صبح سویرے اٹھا۔ اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ــــ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔ اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ــــ آسمان کی طرح پرانی ــــ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا ۔ ۔ ۔ چاہتی تھیں مگر سوائے کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی۔ اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی۔ اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے۔ دکانوں کے بورڈ۔ اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نئی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔ "ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔"

اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ ہائی کورٹ میں ۹ بجے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا۔"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہونچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے ۹ بجائے جو طلبہ بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے کیوں نظر آئے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گذارے تھے۔ اسے یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا۔ مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا۔

" تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی۔؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا اس کی بیوی گنگا دی اس کی اس قسم کی بیقراری کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔" ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا، اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کی اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔ انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ کہ موٹر کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا۔

" چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے"

چھاؤنی پہونچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا۔ اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ

آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ــــــ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور سے اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔ وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے ملنے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا کہ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر پھر اس کو خیال آیا کہ "ان کے پیسے چھوڑنا بیوقوفی ہے" کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دئے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھیرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔ گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھار ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا۔ اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگرٹ سلگا رہا تھا۔ مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے۔ اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے کچھ غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا۔ "جانا مانگتا ہے یا پھر گڑبڑ کرے گا۔"

"وہی ہے" یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگا۔

"وہی ہے" اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرایا اور ساتھ ہی ساتھ اسے پورا یقین ہوگیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس جھڑپ ہوئی تھی اور اس خوامخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔

استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا۔ بلکہ اس کے پرزے اڑا دئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہوگیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پہ گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔ "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں اس کے چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"

"کرایہ پانچ روپیہ ہوگا" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہوگیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے۔ کیا تم ——؟"

"ہاں ہاں پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا "کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعہ کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی زیبائش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں۔ تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔ . . . . پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں — اب ہمارا راج ہے بچہ۔"

لوگ جمع ہوگئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانسوں کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ـــ اب نیا قانون ہے ـــ یہاں نیا قانون "
اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرہ کے ساتھ، بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ " نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی

" نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ـــ قانون وہی ہے پرانا " اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

جوشؔ

وفاداران ازلی کا پیام

شاہنشاہ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر اے مفلسوں کے بادشاہ

اے گداپیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ دریوزہ گروں کے شہریار

اے ہمارے عالموں کے حامیٔ دین مبیں
دور سید کے اولی الامر و امیر المومنیں

اے رئیس پاک دل اے شہریار نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجیے سلام

راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یوں ہی رسم تاج پوشی ہو مبارک آپ کو

دل کے دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں

لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور

آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں!
تن پر اک دھجی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں

تاجپوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں
شکریہ ان روٹیوں کا اے شہ گردوں نشاں

روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدام نے
آ سکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے

آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا
کھا بھی لیں گے آج گر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا

صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام
کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام

آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قوم نامراد
کھائے جاتا ہے اسے خدام عالی کا عناد

معدہ محروم غذا ہے، کیسہ ہے محروم زر
آپ کے عمال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر

آپ کے فرق مبارک کو دیا ہے جس نے تاج — آج اس بھارت کا سر ہے اور تیغ احتیاج
ہر جبیں پر ہے شکن اس کج کلاہی کی قسم — ہر مکاں اک مقبرہ ہے قصرِ شاہی کی قسم
آپ کے سر پر ہے تاج اے فاتحِ روئے زمیں — اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں!

ہم وفا کیش آپ کی نظروں سے بھی گر جائیں گے
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائیں گے

ہم سے باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات — صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات
ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے — پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں — ذرّے ذرّے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں
کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب — کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب
گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ — آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ
ہم وفادارانِ بیٹھیں، ہم غلامانِ کہن — قبر جن کی کھد چکی تیار ہے جن کا کفن
تندرو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں — نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں
مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی — جیسے کوئی دھار چھوتا ہے اپنی تلوار کی
آپ سے کیوں کر کہیں ہندوستاں پہ ہول ہے — آپ کا نام رگ ہے اور کانگرس پیڑ دل ہے
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی — صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی
آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی — ہندیوں کے سانس سے آتی ہے بو بارود کی

چونکیئے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

ظفر علی خاں

لٹ

حاشا کہ اس قدر نہیں سارے جہاں کی لوٹ — جتنی ہے ایک سال میں ہندوستاں کی لوٹ
گلچیں کے دستِ شوخ کی گیرائیوں کو دیکھ — سنبل کی لوٹ، لالہ کی لوٹ، ارغواں کی لوٹ
اجڑے ہوئے چمن میں ہے بلبل کا آشیاں — منظور انھیں ہے شاید اب اس آشیاں کی لوٹ

مغرب کے رہزنوں کی نظر میں ہے رات دن
مشرق کے نقدِ امن و متاعِ اماں کی لوٹ

حفیظ جالندھری

آزادی

شیروں کی آزادی ہے آزادی کے پابند ہیں
سانپوں کو آزادی ہے ہر بستے گھر میں بسنے کی
شاہیں کو آزادی ہے آزادی سے پرواز کرے
پانی میں آزادی ہے گھڑیالوں اور نہنگوں کو
انساں نے بھی شوخی سیکھی وحشت کے ان رنگوں سے

جس کو چاہیں چیریں، پھاڑیں، کھائیں پئیں آنند رہیں
ان کے سر میں زہر بھی ہے اور عادت بھی ہے ڈسنے کی
ننھی منی چڑیوں پر جب چاہے مشق ناز کرے
جیسے چاہیں پالیں پوسیں اپنی تُند امنگوں کو
شیروں، سانپوں شاہینوں، گھڑیالوں اور نہنگوں سے

انساں بھی کچھ شیر ہیں باقی بھیڑوں کی آبادی ہے
شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں اک من بھاتا کھاجا ہے
بھیڑیں لاتعداد ہیں لیکن سب کو جان کے لالے ہیں
ماس بھی کھائیں، کھال بھی نوچیں ہر دم لاگو جانوں کے
بھیڑیوں سے گویا قائم امن ہے اس آبادی کا

بھیڑیں سب پابند ہیں لیکن شیروں کو آزادی ہے
باقی ساری دنیا پرجا شیر اکیلا راجا ہے
ان کو یہ تعلیم ملی ہے بھیڑیے طاقت والے ہیں
بھیڑیں کاٹیں دورِ غلامی بل پر گلہ بانوں کے
بھیڑیں جب تک شیر نہ بن لیں نام نہ لیں آزادی کا

انسانوں میں سانپ بہت ہیں قاتل بھی زہریلے بھی
سانپ تو بننا مشکل ہے اس خصلت سے معذور ہیں ہم

ان سے بچنا مشکل ہے آزاد بھی ہیں پھرتیلے بھی
منتر جاننے والوں کی محتاجی پہ مجبور ہیں ہم

شاہیں بھی ہیں چڑیاں بھی ہیں انسانوں کی بستی میں
شاہیں کو تادیب کرو یا چڑیوں کو شاہین کرو
بحرِ جہاں میں ظاہر و پنہاں انسانی گھڑیال بھی ہیں

وہ نازاں ہیں رفعت پہ، یہ نازاں اپنی پستی میں
یوں اس باغِ عالم میں آزادی کی تلقین کرو
طالبِ جان و جسم بھی ہیں شیدائے جاہ و مال بھی ہیں

یہ انسانی ہستی کو سونے کی مچھلی جانتے ہیں
سرمائے کا ذکر کرو مزدور کی ان کو فکر نہیں
آج یہ کس کا منہ ہے آئے منہ سرمایہ داروں کے
کھا جانے کا کون سا گر ہے جو ان سب کو یاد نہیں
زر کا بندہ عقل و خرد پر جا ہے جتنا ناز کرے

مچھلی میں بھی جان ہے لیکن ظالم کب گردانتے ہیں
مختاری پر مرتے ہیں مجبور کی ان کو فکر نہیں
ان کے منہ میں دانت نہیں ہیں پھل ہیں خونی تلواروں کے
جب تک ان کو آزادی ہے کوئی بھی آزاد نہیں
زیرِ زمیں دھنس جائے یا بالائے فلک پرواز کرے

اس کی آزادی کی باتیں ساری جھوٹی باتیں ہیں　　مزدوروں کو، مجبوروں کو کھا جانے کی گھاتیں ہیں
جب تک چوروں، راہزنوں کا ڈر دنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے

ساغر نظامی

نئی موج طوفاں

یہ تضادوں کا جہاں، نفرت و الفت کا دیار　　طنز کرتی ہوئی بے روح محبت کا دیار
غم سے معمور خرابہ یہ مسرت کا دیار　　یہ روایات کا جنگل یہ وراثت کا دیار
ہم جو چاہیں تو یہ سب کچھ تہہ و بالا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اجالا کر دیں

شکوے کب تک ہوں مشیت کی تہی دستی کے　　معجزے کیوں نہ دکھائیں خرد و مستی کے
کیوں نہ ہم خود ہی بسا ہوں نئی بستی کے　　اپنے عکسوں سے نئے جال بنیں ہستی کے
اور ہستی کو حریف غم دنیا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اجالا کر دیں

ہم سفر، راہ نما، راہ گذر ہو جائیں　　سفر زیست کا خود زاد سفر ہو جائیں
عشق کی شام محبت کی سحر ہو جائیں　　منتہا اپنی تجسس کا اگر ہو جائیں
زندگانی کو بہر حال گوارا کردیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اجالا کردیں

یہ تو وقت ہے یا غنچۂ بشگفتہ کی بو　　موت کی گود میں پھیلی ہوئی رفتار نمو
یا کوئی بادۂ سرجوش سے لبریز سبو　　یہ جہان گذراں ہے کہ رمیدہ آہو
اس کو بھی کیوں نہ شکار غم فردا کردیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اجالا کردیں

عہد لیں زلزلوں سے آندھیوں سے ساز کریں　　بحر کے قلب میں اک باب اثر باز کریں
آکہ رقصاں ہوں، بپا محشر آواز کریں　　عین طوفاں میں نئی زیست کا در باز کریں
کشتی کو موج کریں، موج کو دریا کردیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اجالا کردیں

تقص اس کہنگی فکر و عمل سے کب تک　　تھرتھراتے ہوئے ذہنوں میں محل کے کب تک

ہم رہیں عزم گراں بار سے ہلکے کب تک　　افقِ زیست پہ قسمت کے دھندلکے کب تک
کوئی صورت اسی عالم سے ہویدا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اجالا کر دیں

بے کس و بے بس و مظلوم سراپا کا علاج　　غم سے کچلی ہوئی مسلی ہوئی بیوہ کا علاج
نقص اور جبر کی مدقوق مریضا کا علاج　　دین سے ہو نہ سکا علت دنیا کا علاج
آ کہ دنیا ہی کو دنیا کا مداوا کر دیں
آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اجالا کر دیں

جاں نثار اختر

ساقی

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج مے خانے کا دروازہ　　ہر اک میکش یکایک بے پئے برہم اٹھا ساقی
یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے　　یہ کیسا ساز سے اک نغمۂ ماتم اٹھا ساقی
بغاوت کی ہوائیں چل اٹھیں شاید گلستاں میں　　یہ پیمانے الٹ ساقی، یہ جام جم اٹھا ساقی
جو ممکن ہو تو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

مجاز

بدیسی مہمان سے

مسافر بھاگ وقت بیکسی ہے　　ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے　　یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
یہ عالم ہو گیا ہے مفلسی کا　　کہ رسم میزبانی اٹھ گئی ہے
نہ دے ظالم فریب چارہ سازی　　یہ بستی تجھ سے اب تنگ آ چکی ہے
مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے
وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

گھٹا جو اس سمندر سے اٹھی ہے　　در خوش آب بھی برسا چکی ہے
مگر اب اس کا عالم ہی جدا ہے　　یہ بدلی آگ برساتی اٹھی ہے
ستارہ صبح کا بے نور ہے اب　　در و دیوار پر دھوپ آ چکی ہے

نسیم نرم رو اس گلستاں کی سموم دشت پیما بن چکی ہے
بگولے اٹھ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں فضائے دہر میں ہل چل مچی ہے
یہاں ہر شاخ شمشیر برہنہ گلوں سے خون کی بو آرہی ہے
مرتب اک نیا دستور ہوگا بنا اک دور نو کی پڑ رہی ہے
ہلی جاتی ہے بنیادِ قدامت جوانی ہوش میں آئی ہوئی ہے
یہاں کے آسمان آتشیں پر بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہے

یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے
یہاں سے ایک آندھی اٹھ رہی ہے

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں جگمگاتی جاگتی، سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میری چھاتی پر مگر جلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں!!
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب

جیسے مفلس کی جوانی۔ جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں - اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لئے اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لئے
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کے ساز و ساماں پھونک دوں اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا تخت سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

فیض احمد فیضؔ

تسلی

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہ لیں تڑپ لیں، رو لیں

اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے جذبات پہ تعزیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ زنجیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بیکار بیکار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

تیسرا حصّہ

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک

۱۔ دوسری جنگ عظیم

۲۔ سویت جرمن جنگ

۳۔ اگست ۴۲ء کی بغاوت

۴۔ بنگال کا قحط

۵۔ جنگ کا خاتمہ

دوسری جنگ عظیم

تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

سید مطلبی فرید آبادی

جوش ملیح آبادی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑئے کو مار دو گولی پئے امن و بقا
باغ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پہ ہچکیاں

ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دستِ کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلم بے پناہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اہل آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
اہل قوت دام حق میں تو کبھی آتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
اہل حق روشن نظر ہیں اہل باطن کور ہیں
آج شاید منزل قوت میں تم رہتے نہیں
کیا کہا انصاف ہے انساں کا فرض اولیں
دیر سے بیٹھے ہو نخل راستی کی چھاؤں میں
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی

کس کے سر لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کے دھواں
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی
ڈائر گرگ دہن آلود اب بھی زندہ ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
آج بھی گونجی ہوئی ہے جن میں کوڑوں کی صدا
سخت حیران ہوں کہ اب تم درس حق دیتے ہو کیوں
"بینکی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
یہ تو ہیں الفاظ ان قوموں کے جو کمزور ہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں
خیر تو ہے اسپ تازی کیا شفا خانے میں ہے
کچھ طبیعت کیا بضد دشمناں ناساز ہے
نوع انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

اگست ۱۹۳۹ء

علی سردار جعفری

جنگ اور انقلاب

رقص کر اے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات

زندگی مینا و ساغر سے ابل جانے کو ہے
کامرانی کے نئے سانچے میں ڈھل جانے کو ہے

اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ

ہے فضاؤں میں نوید شادمانی کا سرور
پڑ رہا ہے عشرتِ فردا کی پیشانی پہ نور

موت ہنس کر دیکھتی ہے آئینہ تلوار میں
زر پرستی کا سفینہ آ گیا منجدھار میں

باہمی نفرت کے شعلے جنگ کی یہ ہول آگ
پیرزنِ سرمایہ داری کی ہے بیوہ کا سہاگ

خون کی بو سے تمام زندگی مخمور ہے
گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا معمور ہے

یہ ہے وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
یہ ہے وہ بجلی کی خود خرمن نے پالا تھا جسے

تیر جو چٹکی میں تھا پیوست اب بازو میں ہے
آستیں میں تھا جو خنجر آج وہ پہلو میں ہے

آ گیا ہے وقت وہ جو آ کے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں

ہل چکا ہے تختِ شاہی گر چکا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج

ڈھل رہی ہے زرگری کی رات کے تاروں کی چھاؤں
مفلسی پھیلا رہی ہے وقت کی چادر میں پاؤں

انقلابِ دہر کا چڑھتا ہوا پارہ ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ

ہم سے آزادوں کا اس دم گیت گانا خوب ہے
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانہ خوب ہے

غم کے سینے میں خوشی کی آگ بھرنے دو ہمیں
خوں بھرے پرچم کے نیچے رقص کرنے دو ہمیں

مخدوم محی الدین

سپاہی

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے

لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے   کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے   سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا   ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے   کھل گیا انقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا

نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے۔
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

سید مطلبی فرید آبادی

دھرتی ماں

تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

جھم جھم امڈے بادل کالے   پورب پھیلے دھوئیں کے گالے
ہٹم ہوئے سب آنکھوں والے   کون بھلا اس کالی کو ٹالے
کھانڈا باجے چمکیں بھالے   ناگ کھڑے جوں جیب نکالے
توپیں کھول رہیں دہانے   تڑتڑ تڑ تڑ گولی چالے
کٹ کٹ گرتے گورے کالے   بہنے لاگے خون کے نالے
سارے کسان ہیں سارے گوالے   سب مزدوری کرنے والے
آ انبر سے کون سنبھالے   تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

رین اندھیری گھپ اندھیاری   ساگر کالے، دھرتی، کالی
جنگل جھلسے، پھنک گئی ڈالی   ہر ہر مالی کالی کالی
گرجیں توپ تو پھیلے لالی   یہ لالی اور خوں پینے والی
کشتی تیری دھونی کالی   نو بن اور بن تو بن والی
ساگر ہل گیا توپ وہ چالی   ڈوبی ناؤ نہ ڈوبن والی
ڈوبن والوں نے گلی نکالی   نا کوئی وارث نا کوئی والی
ان ڈوبوں کو کون نکالے   تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

یہ محنت میں جٹنے والے — رات دنا یہ لٹنے والے
سوٹ بان یہ بٹنے والے — میلوں سڑکوں میں پٹنے والے
دین دھرم پر مٹنے والے — جیلوں میں یہ کٹنے والے
شیروں جیسے ڈٹنے والے — اڑ کر پھر نا ہٹنے والے
دیس پہ مرنے کٹنے والے — گرنے والے، اٹھنے والے
نام خدا کا رٹنے والے — دھوکوں پر مر مٹنے والے
ان پھلتوں کو کون بچا لے — تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے

دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

دونوں اور کسانوں کے دل ہیں — بھوکوں اور کنگالوں کے دل ہیں
سوکھ اور انجانوں کے دل ہیں — مزدوروں کے کسانوں کے دل ہیں
سب پر چھائے جانوں کے دل ہیں — گوروں، پیلوں، کالوں کے دل ہیں
دھن اور دولت والوں کے دل ہیں — لچھمی کے متوالوں کے دل ہیں
مسجد، گرجا، شوالوں کے دل ہیں — چھوٹے بچے خیالوں کے دل ہیں
سو دھوکوں میں کسانوں کے دل ہیں — مرتے کٹتے جوانوں کے دل ہیں
ان دھوکوں سے کون نکالے — تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے

دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

اس بادل کے پیچھے ماتا! — دیکھے گہری اوکھوں کی میلا
اس پر سندر ان پہ چھایا — اس چھایا میں لال پھریرا
اس جھنڈے کے نیچے ماتا — باجے ہے مزدوروں کا ڈنکا
کہیں کنگالی کا رونا — نا کوئی بیری نا کوئی دکھیا
نا کہیں ساہوکاروں کا ڈاکا — نا راجہ خون پینے والا
پھولوں جیسا سب کا چہرا — ہر اک زندہ بوڑھا بچا
یہ بھی ہیں ماتا تیرے ہی پالے — تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے

دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

کس بدھ بدلے گی ہماری دنیا — میں تیرا داسی کہہ دے ماتا
اچھا اچھا! سمجھا سمجھا — پورا پورا تیرا سندیسا
دنیا بھر کا ہو اک جتھا — مظلوم اٹھائیں لال پھریرا
پلٹ پڑے یہ ساری سینا — دونوں اور تو پھر کیا کہنا

کچلے جائیں گے موہرے راجا — نمٹے گا سب کا لیکھا کھاتا
ظلم کا یوں نکلے گا جنازا — یوں بپتا کی ڈوبے نیاّ
چومیں گے مکھ تیرا تیرے بالے — تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

فیض احمد فیضؔ

بول

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے — بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا — بول کی جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں — تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے — پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے — جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک — بول جو کچھ کہنا ہو کہہ لے

ساحر لدھیانوی

لمحۂ غنیمت

مسکرا اے زمین تیرہ و تار
سر اٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے۔
کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں آہنی ہی سہی
آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
فرصت یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

سوویت جرمن جنگ

نگاہ ہے افق ماسکو پہ عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

مخدوم محی الدین

استالین

صف اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر
الیستالین
مادر روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمین
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
ان کی محنت کا اخوت کا، محبت کا خمیر

وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں۔
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں

کیا مجاہد نہ بنوں
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر
ایسے ہنگام قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہموطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بن کر۔
نہ سما جائے گا
قرۃ العین! مری جان عزیز
او مرے فرزندو!
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

وہ مرا ملک جواں
وہ مرا بادۂ احمر کا جواں سال سبو
میری نوخیز مسرت کا جہاں
وہ مرا سرو رواں ملک جواں
و لدا لجرم خطاکار درندوں نے جہاں
اپنے ناپاک ارادوں سے قدم رکھا ہے
ایک نوخیز کلی۔ ایک نو آغاز بشر
وہ مرا ملک جواں
سچ کہا ہے کہ "زمیں کے کیڑے
اپنی بے وقت اجل سے ڈر کر
تھرتھراتے ہوئے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے

نکل آئے ہیں بلوں سے باہر"
اپنے فولاد سے روزن کے دہن بند کرو
اور فاشسٹ شغالوں سے کہو
لقمۂ اول و آخر ہے یہی
قرۃ العین مری جان عزیز
او مرے فرزندو
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالن
یہی محشر ہے دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پرانا عالم
ایک نیا
ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں
ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں
دوسرا۔ ایک ابھرتے ہوئے سینے کا شباب
تیز اور تند شراب
پیٹ سے رینگنے والے یہ نجس اور ناپاک
سوسمار
دور وحشت کے درندے
موذی
دہن آز و ہلاکت کا شکنجہ لے کر
مرے شاہین کے خلاف
رات دن ہیں کہ چلے آتے ہیں۔
نہیں جائیں گے کبھی رائگاں میرے نغمے
اور میرے ہموطنوں کے نغمے
میرے شاہین تو منصور و مظفر ہی رہیں گے دائم
سوسماران خزندہ درگور

مرا شاہین، مرا استالین
مرے شاہین بچے جن کا ابھی نام نہیں
سرخرو اور سرافراز فضاؤں میں بلند
ہاں مرے ہم وطنو
جاؤ اور اپنے سمندوں کو تو مہمیز کرو۔
سرخ فوجوں میں ملو
جوئے پرجوش بنو، برق کا سیلاب بنو اور بہو
اک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر
غضب آلود بھنور بن جاؤ
اور فاشسٹ خنازیر کو
فی النّار کرو
مرے بلخاش کہاں ہے وہ مس سرخ نژا
اس سے کہنا سر دشمن پہ گرے سیل بن کر
بحر اخضر کے او ماہی گیرو! غوطہ زنو اپنے ذخیرے لاؤ
اور قربان وطن کر ڈالو
معدنوں سے کہو اور کھیتوں کو آواز تو دو
لائیں اور اپنے سن و سال کا حاصل لائیں
اور قربان وطن کر ڈالیں
یہ ہیں رہوار، یہ پشمینہ ہے یہ خرمن ہیں
مرے محبوب وطن
سب کے سب تیرے ہیں سب تیرے ہیں
استالین نے میداں میں بلایا ہے ہمیں
کسب اور جہد کا پیغام سنایا ہے ہمیں
خطۂ قدس سے دشمن کو نکالو باہر
قازقستان!
وطن
اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اٹھ
خیز با صد حشم و جاہ و جلال

بہ ہزاراں جبروت
ایک جان ایک جسد
پھونک دے دشمن ناپاک کی خاکستر کو

(ترجمہ)

مسعود اختر جمال

احساس کامران

تجھے مسافر شب سوچ کیا ہے فکر ہے کیا — فریب راہ سے گم کیوں نشان منزل ہو
ہزار موت کے طوفاں اٹھا کریں لیکن — غم حیات سے کیوں چور موج ساحل ہو
مجھے یقیں نہیں آتا کہ تیرے ہوتے ہوئے — حدیث ظلم و ہوس زندگی کا حاصل ہو
اگرچہ رات ہے تاریک ہولناک فضا — ہراس کے خوف سے کیوں زرد شمع محفل ہو
بہار شوق سے شاداب ہے چمن تیرا — خزاں کے آنے سے مایوس کیوں ترا دل ہو

نقوش تیرے زمانہ مٹا نہیں سکتا
یہ ارتقائے تمدن بھلا نہیں سکتا

یہ بات اور ہے انسانیت کی محفل میں — بہیمیت کے خدا کا ہے اقتدار ابھی
فضائے ہوش پہ طاری ہے قومیت کا جنوں — خزاں کے روپ میں ہے موسم بہار ابھی
یہ نازیت ہو کہ فسطائیت بہر صورت — فریب شوق دئے جائیں گے ہزار ابھی
ابھی ہے نادر و چنگیز کا اثر باقی — اٹھیں گے اور بھی طوفان روزگار ابھی
مٹائے کیسے کوئی ظلم و جور کی رسمیں — کہ ظالموں پہ ہے دنیا کو اعتبار ابھی
وہی ہے محفل عقل و خرد میں بے ربطی — وہی ہے بزم تمنا میں انتشار ابھی

مگر حیات کا ضامن شباب ہوگا ضرور
حریف ظلمت شب آفتاب ہوگا ضرور

ساحر لدھیانوی

احساس کامراں

افق روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو — شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے
تیرگی جتنا سنبھلنے کے لئے رکتی ہے — سرخ سیل اور بھی بے باک ہوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسا نہ کرے — کہنہ زنجیر کی جھنکار نہیں رہ سکتی

جذبۂ نفرت جمہور کی بڑھتی رو ہیں ملک اور قوم کی دیوار نہیں رہ سکتی

سنگ وآہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے موت کے رینگتے سایوں سے کہو ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سیل انوار تیرہ وتار گھٹاؤں سے کہو چھٹ جائیں

سالہاسال کے خاموش شراروں کا خروش اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزم آزادیٔ انساں بہ ہزاراں جبروت اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لئے
کوئی زنجیر گراں کام نہیں آ سکتی
رات کے سینے میں گڑتی ہوئی کرنوں کی قسم
اب زمانے پہ کبھی شام نہیں چھا سکتی

جاں نثار اختر

سرخ فوج

یہ زمیں شرر فشاں یہ فلک دھواں دھواں
روح بحر و بر تپاں قلب عصر خوں چکاں
توپ، ٹینک، گولیاں گونجتی ہیں وادیاں
خاک و خوں کے درمیاں
سرخ فوج ہے رواں
ایک موج کارزار ایک سرخ جوئبار
ایک تند آبشار ایک ابر کوہسار
اک شہاب بے قرار اک تلاطم شرار
شعلہ خیز و شعلہ بار
سرخ فوج ہے رواں
ایک قہر آہنیں ایک سیل آتشیں

ایک شعلۂ زمیں ایک اژدر حسیں
ایک مار احمریں مرگ قہر آفریں
خشمناک و خشمگیں

سرخ فوج ہے رواں

سرخ خوں فشاں علم یہ وہل کا زیر و بم
تند گام برق رم مہر فتح ہر قدم
بحر سطوت و ہمم زور و زندگی بہم
لمحہ لمحہ دمبدم

سرخ فوج ہے رواں

حریت کے پاسباں زندگی کے رازداں
جنگ جو جری جواں ایک سرخ کہکشاں
یہ کدال یہ نشاں ہل رہا ہے کل جہاں
جھک رہا ہے آسماں

سرخ فوج ہے رواں

کیفی اعظمی

آخری امتحان

بجلیاں، آگ، ٹینک، بم، توپیں — امتحاں عزم کا ثبات کا ہے
روس، یہ جنگ تیری جنگ نہیں — آخری معرکہ حیات کا ہے

یہ ترا عزم تیری قربانی — کام اک روز آہی جائے گی
نوجوانوں کے خون کی سرخی — روئے عالم پہ چھاہی جائے گی

نئی دنیا کی پڑ رہی ہے نیو — خیر اجڑی تو اجڑی آبادی۔
فیصلہ ہوگیا سر میداں — زندگی ہے گراں کی آزادی

خاک میں جذب اب نہیں ہوتا — خون طوفان اب اٹھائے گا
ہاں یہی جوشش سیل طغیانی — آخ قاتل ہی ڈوب جائیگا

ہے بدلنے پہ وقت آمادہ — خون ترا رائیگاں نہیں ہوگا
آخری ہے یہ موت کا حملہ — اب کوئی امتحاں نہیں ہوگا

نئی صبح

یہ صحت بخش تڑکا یہ سحر کی جلوہ سامانی — افق سارا بنا جاتا ہے دامان چمن جیسے
جھلکتی روشنی تاریکیوں پر چھائی جاتی ہے — اوڑھائے نازیت کی لاش پر کوئی کفن جیسے
ابلتی سرخیوں کی زد پہ حلقے ہیں سیاہی کے — پڑی ہو آگ میں بکھری غلامی کی رسن جیسے
شفق کی چادریں رنگیں فضا میں تھرتھراتی ہیں — اڑائے لال جھنڈا اشتراکی انجمن جیسے
فضا گونجی ہوئی ہے صبح کے تازہ ترانوں سے — سرود فتح پہ ہیں سرخ فوجیں زخمہ زن جیسے
یہ سادہ سادہ گردوں، یہ تبسم آفریں سورج — پیاپے کامیابی سے ہوا استالن مگن جیسے
سحر کے آئینے میں دیکھتا ہوں حسن مستقبل — اتر آئی ہے چشم شوق میں کیفی کرن جیسے

نازیوں کا اعتراف شکست

روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیوں کر — ناؤ کاغذ کی سمندر میں چلائیں کیونکر
رنگ اڑتے ہوئے شعلوں پہ چڑھائیں کیونکر — پاؤں بجلی کے خزانے پہ جمائیں کیونکر
روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیونکر

ہوں نہ محروم جہاں علم کی دولت سے عوام — جن کے ادراک پہ چھایا نہ ہو رنگ اوہام
جن کو جاں سے بھی زیادہ ہو عزیز اپنا نظام — ان کو دستور غلامی نئے سکھائیں کیونکر
روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیونکر

ایسے بیدار کہ غافل کبھی ہوتے ہی نہیں — دولت علم و عمل ہاتھ سے کھوتے ہی نہیں
ایسا لینن نے جگایا ہے کہ سوتے ہی نہیں — آہ سوتے ہی نہیں خواب دکھائیں کیونکر
روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیونکر

غیر ممکن ہے کبھی دام میں آنا ان کا — ان کی راتوں کے بھی ماتھے پہ ہے پرتو دن کا
ان کے سینوں میں دھڑکتا ہے دل انساں کا — ان میں سب خضر ہیں یہ ٹھوکریں کھائیں کیوں کر
روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیوں کر

اپنے دستور سے ان میں کوئی بیزار نہیں | اب یہ آزاد ہیں آزاد گرفتار نہیں
پھر وہی طوق پہن لینے کو تیار نہیں | پھر وہی طوق بھلا ان کو پہنائیں کیونکر
روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیونکر

اختر انصاری

جنگ

سرنگوں ایوان، اجڑے بام و در، ویران شہر
ہیں پھریرے فتح کے، ہیں یادگار یں جیت کی
دیکھتے ہو یہ جو تم دھرتی کے سینے میں شگاف
قبر کھودی جا رہی ہے جنگ کے عفریت کی

استالن گراد

خاک و خوں کے ڈھیر ہیں خاشاک کے انبار ہیں
سارے ایوان فلک فرسا ستالن گراد کے
مسکرا کر کان میں کہتا ہے کوئی یہ کھنڈر
نازیت کے کھنڈر ہیں یا ستالن گراد کے

احمد ندیم قاسمی

شفقِ سُرخ

ہر نئی پود نے اک تازہ صنم ڈھال لیا | نت نئے بت، نئے مندر، نئے پوجا کے اصول
سنکھ بجتے رہے، جلتے رہے رنگیں فانوس | روح کھلتی رہی، ہوتا رہا انسان ملول

قصر شاہی سے گرائے گئے نیلم پکھراج | سنگریزوں کو نگلتے رہے مجبور عوام
خشک کانٹوں میں بدلتے رہے خیرات کے پھول | سوکھے جبڑوں کو جکڑتی رہی زر تار لگام

حسن بکتا رہا زلفت کے پردوں سے ادھر | عشق سنتا رہا بجتے ہوئے فولاد کا شور

قافلے لٹتے رہے منزلیں بیگانہ رہیں — چاند بجھتے رہے، تکتے رہے محبوس چکور

ہر نیا دور صد امید بداماں آیا — زندگی خستہ و درماندہ و مجبور رہی
اک شہنشاہ اٹھا، ایک شہنشاہ بڑھا — اسی چکر میں ازل سے یہ زمیں چور رہی

ناگہاں ایک دھواں دھار دریچہ کھڑکا — شوخ سی شمع بڑھی، لو کی زباں لہرائی
سرسراتی ہوئی ظلمت کے نشیبوں سے اٹھی — شفق سرخ، نئی صبح کے نغمے گاتی

اک نئے دور کا پرتو ہے افق کی لالی — اک نئے حسن کی خاطر یہ حنابندی ہے
ایک ہی سطح پہ اترے ہیں نشیب اور فراز — اب کس انسان کو دعوائے خداوندی ہے

ابن آدم تری جھلسی ہوئی شریانوں میں — خون تازہ کی نئی لہر ہے چلنے والی
یہ حکومت ہے، یہ قوت ہے سنبھل اور سنبھال
اب نئے روپ میں تقدیر ہے ڈھلنے والی

خواجہ احمد عباس

استالن گراد

(ایک طویل کہانی "زندگی" کا اقتباس)

زندگی اور موت! —— مقابلہ سخت تھا۔ موت لشکر کے لشکر ساتھ لے کر آئی تھی۔ بمبار ہوائی جہاز، ٹینک، سیکڑوں میل کی مار کرنے والی توپیں، مشین گنیں، رائفلیں اور بندوقیں اور ریوالور۔ زہریلی گیس، سپاہیوں کے دل بادل، بے روح اور بے دماغ سپاہی جن کو زندگی کی بجائے "موت کی تعلیم" دی گئی تھی۔ جن کے دلوں کو انسانیت، رحم ہمدردی کے جذبات سے اس طرح خالی کر دیا تھا۔ جیسے لیموں کو آہنی انگلیوں سے نچوڑ کر سارا رس نکال دیا گیا ہو۔

ایک شہر۔ نوجوان شہر۔ موت کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ایک شہر۔ فولاد کا شہر جس کا نام اس دیس کے سب سے بڑے سورما کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ پورا شہر لڑائی کے میدان میں اترا ہوا تھا۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے، فوجی سپاہی، ہواباز، انجینیر اور ڈاکٹر، مصنف اور شاعر، اخبار نویس اور آرٹسٹ۔ موٹر ڈرائیور اور باورچی، معمار اور مزدور۔

شہر کی عمارتوں میں کوئی دیوار سالم نہ تھی۔ ہر جگہ بم کے گولوں کے گھاؤ نمایاں تھے۔ مگر گوشت اور پوست کی انسانی دیوار فولاد کی طرح اٹل کھڑی تھی۔ اس دیوار کو دشمن کے پے در پے حملے نہ ہٹا سکے تھے نہ ہلا سکے تھے۔

شہر دریا کے کنارے پر بسا ہوا تھا۔ دریا کا پانی انسانی خون سے مل کر لال ہو گیا تھا۔ شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ فیکٹریاں، کارخانے

اسکول، کالج۔ ہسپتال، رہنے کے مکان، دکانیں، سڑکیں، باغات، پارک، اور آج ہر طرف تباہی ہی تباہی تھی۔ جہاں کبھی زندگی کا دور دورہ تھا۔ وہاں آج موت کا راج تھا۔ جہاں ہنستے ہوئے بچے نظر آتے تھے وہاں آج لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ سکولوں، کالجوں، لائبریریوں میں آتشیں بموں نے آگ لگا دی تھی۔ شہر کے کونے کونے سے دھوئیں کے کالے بادل اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔

اس شہر کے رہنے والے مہینوں سے اپنی زندگی۔ اپنے شہر کی زندگی کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان کے رہنے کے مکان بمباری سے کھنڈر ہو گئے تھے۔ وہ دن رات خندقوں میں رہتے تھے۔ ہر لمحے شہر پر گولیوں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ وہ نہ سوتے تھے نہ کام کرتے تھے نہ ہنستے تھے نہ مسکراتے تھے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ ہونٹ پھولے ہوئے تھے۔ کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے۔ بھوک اور پیاس کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔ دن اور رات میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ دن میں دھوئیں کے بادلوں میں سورج چھپا رہتا تھا۔ اور رات کو شعلوں کی روشنی ہوتی۔ دن تاریخ وقت سب بے معنی ہو گئے تھے۔

اس شہر کی تاریخ عجیب تھی۔ ایک زمانہ میں یہ ایک معمولی قصبہ تھا۔ اس کا نام ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان دنوں دنیا کے اور شہروں کی طرح یہاں بھی بے کار امیر بڑے بڑے عیش کرتے تھے اور غریب مزدور باوجود سخت محنت کرنے کے بھوکے مرتے تھے۔ پھر انقلاب کا طوفان اٹھا۔ مزدوروں اور کسانوں نے تخت و تاج کو مٹی میں ملا دیا۔ عوام کی حکومت قائم کی۔ مگر ظالم اور جابر رجعت پسند اور سرمایہ دار یوں آسانی سے ماننے والے تھوڑے ہی تھے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ خانہ جنگی کے شعلے ملک بھر میں بھڑک اٹھے۔ اس شہر میں اس دریا کے کنارے اس انقلابی جنگ کا ایک فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ شہنشاہ پرستوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر مرد میدان کے زیر کمان انقلابی فوجوں نے حملہ کیا۔ شہر کے لوگ استبداد اور ظلم کے خلاف کھڑے ہو گئے اور رجعت پسندوں کو شکست فاش ہوئی۔ شہر کا نام بدل کر اسی مرد میدان کے نام پر رکھا گیا۔ جس نے اس کو انقلاب اور آزادی کی خاطر دشمن کے پنجے سے بچایا تھا۔

پچیس برس میں اس شہر کی صورت ہی بدل گئی۔ جو مزدور، اندھیرے، گندے، شکستہ، مکانوں میں رہتے تھے۔ ان کے لئے شاندار خوبصورت عمارتیں بنائی گئیں۔ ان کے بچوں کے لئے اسکولوں، کالجوں کے دروازے کھول دئے گئے۔ نوابوں، زمینداروں، سرمایہ داروں کے محلوں میں مزدوروں کے لئے کلب اور ہسپتال قائم کئے گئے۔ نئے کارخانے قائم ہوئے۔ ریلیں۔ ٹرامیں۔ بجلی، تار ٹیلیفون، پارک، تھیٹر، سنیما۔ لائبریریاں اور ہر چیز کام کرنے والوں کے لئے زندگی کی ایک نئی لہر شہر میں دوڑ گئی۔ نہ صرف اس شہر میں بلکہ اس دیش کے ہر شہر میں، ہر گاؤں میں۔ آخر کار ہزاروں برس کے بعد انسان نے اپنی دنیا کی دولت پر قبضہ کر لیا۔ غاصبوں اور ظالموں کو مار بھگایا۔ مزدور راج قائم ہوا۔ زندگی کی فتح ہوئی۔

مگر موت اور ہلاکت کے دیوتا کب خاموش بیٹھتے ہیں۔ دنیا میں امن اور چین، مساوات اور عوام کی بہبودی دیکھ کر وہ جل جاتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ پھر زندگی پر موت غلبہ پائے۔ انصاف پر بے انصافی۔ مساوات پر استبداد، اجالے پر اندھیرا۔ موت کے لشکروں نے زندگی کے اس عظیم الشان مظہر پر حملہ کر دیا۔ امن عالم کو پھر جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔

قتل و غارت کا طوفان خوفناک رفتار سے بڑھا۔ شیطانی دماغوں نے سائنس کی مدد سے وہ وہ ہتھیار تیار کئے تھے کہ ان کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ شہر ویران ہو گئے۔ کھیتیاں جلا دی گئیں۔ لاکھوں کا خون ہوا۔ عورتیں بیوہ ہو گئیں اور بچے یتیم۔ زندگی کے قدم اکھڑ گئے۔

مگر اس شہر پر زندگی نے پھر قدم جمائے۔ موت کے لشکروں کو رکنا پڑا۔ دشمن نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ زندگی موت کے طوفان میں رک گئی اور یوں ہی کئی ماہ سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ دشمن اپنی بے پناہ قوت کو لئے شہر کے سامنے پڑا تھا۔ شہر پر بمباری ہو رہی تھی۔ چاروں طرف آگ اور تباہی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شہر جل رہا تھا۔ اور موت فاتحانہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔
زندگی خاموش تھی مگر زندگی کے قدم مستحکم تھے۔

موت کے لشکر برابر بڑھتے آرہے تھے۔ مگر زندگی نے ہار نہ مانی تھی۔ شہر کے مضافات پر دشمن کا قبضہ ہوگیا تھا۔ خود شہر کے حصے میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ہر سڑک، ہر گلی، ہر مکان پر بہادر ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ جان دے رہے تھے۔ عورتیں اور بچے بندوقیں لئے لڑ رہے تھے۔ دشمن کے ہزاروں سپاہی کام آئے۔ مگر ان کے ٹینکوں، ہوائی جہازوں اور توپوں کا آہنی سیلاب بڑھتا ہی چلا آرہا تھا۔

موت خوش تھی۔ ہنس رہی تھی۔ "چند روز کی بات ہے، فتح یقینی ہے"

مگر زندگی نے ابھی ہمت نہ ہاری تھی۔ شہر کے باشندے قسم کھائے ہوئے تھے۔ کہ دشمن کو ہماری لاشوں پر سے ٹینک گذارنے ہوں گے۔ گوشت اور خون کی چٹان تھی۔ جو دشمن کے راستے میں کھڑی ہوئی تھی۔

آخر کون سا جذبہ تھا وہ جو ان شہریوں کی ہمتوں کو ابھارے ہوئے تھا۔ آزادی کا جذبہ، مساوات اور انسانیت کا جذبہ۔

ایک سپاہی سے کسی غیر ملکی اخبار نویس نے پوچھا "کون سی وہ طاقت ہے۔ جو تمہارے شہر کو اب تک دشمن کے بے پناہ لشکروں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر رہی ہے؟"

سپاہی نے کہا۔" بھائی! میری عمر چالیس برس ہے۔ معلوم ہے میں کہاں پیدا ہوا؟ اسی شہر میں۔ سووروں کے ایک اصطبل میں وہیں سوکھی گھاس کے ایک ڈھیر میں ایک سوورنی نے بچے دئے تھے۔ اور وہیں میری ماں نے مجھے جنا تھا۔ میرا باپ ایک زمیندار کا غلام تھا۔ میری ماں نے مجھے جنم دینے کے تین دن بعد کام پر جانے کے لئے مجبور کر دی گئی تھی۔ میں وہیں۔ سوورنی کے بچوں کے پاس پڑا رہتا تھا۔ سردی لگتی۔ تو ان سؤر کے بچوں کے ساتھ ان کی ماں کے گرم جسم سے لپٹ جاتا تھا۔ یہ تھی ہماری زندگی اس زمانے میں۔ اور پھر انقلاب آیا۔ اور کایا پلٹ گئی۔ ہم انسان بن گئے۔ ہمارے لئے اچھے اچھے مکان بنے ہسپتال اور کالج۔ میرا لڑکا اور لڑکی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ سمجھے! یہ ہیں انقلاب کے نتائج! اس انقلاب کو بچانے کے لئے آج ہم اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر دشمن کامیاب ہوگیا تو مزدوروں اور کسانوں کی حالت، پھر جانوروں، کتوں اور سووروں سے بدتر ہو جائے گی! یہ موت اور زندگی کا سوال ہے میرے بھائی۔"

شہر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی دیوار اٹل کھڑی تھی۔ اور پھر ایک دن خبر آئی کہ شمال کی طرف سے کمک آرہی ہے۔ شہر کے ہر شخص کے چہرے پر زندگی اور بشاشت کے آثار نظر آنے لگے۔ ہمتیں بلند ہوگئیں۔ سینے تن گئے۔

موت کے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ موت گھبرا سی گئی۔

اگست ۱۹۴۲ء کی بغاوت

آ کے کیوں دیوار تک نقشِ قدم گم ہو گئے
کیفی اعظمی

فراق گورکھپوری

زندگی کی للکار

آؤ اور صبر و سکوں کی صورتوں کو چھین لو
آج پھر سے میرے دل کی راحتوں کو بھی چھین لو

کچھ ارادے بھی تو جھکیں کیا قضا اور کیا قدر
بطنِ مستقبل سے اپنی قسمتوں کو چھین لو

زندگی کو کیوں بنا رکھا ہے اک زندانِ تنگ
اس فضا اس بحر و بر کی وسعتوں کو بھی چھین لو

دیکھنا پھر کس طرح ملتی ہے وہ کافر نگاہ
خواب آلودا انکھڑیوں سے غفلتوں کو بھی چھین لو

دیکھنا کاشانۂ انساں کے بام و در کی شان
اہلِ دنیا آسماں کی رفعتوں کو چھین لو

بڑھ کے دھاوا بول دو کھل جائیں گے گنجِ نہاں
بطنِ گیتی میں دفینہ دولتوں کو بھی چھین لو

اس کا کھنچنا، اس کا ملنا اس کے بس میں کیوں رہے
حسن کی سب دوریاں، سب قربتوں کو بھی چھین لو

جو رگلچیں ہر طرف آفاقلوں سے ڈر بھی کیا
ان کے رنگوں اور ان کی نکہتوں کو بھی چھین لو

راہ کھوٹی کر رہی ہے منزلِ دیریں کی یاد
زندگی سے زندگی کی رجعتوں کو بھی چھین لو

جیتے مردے دیر تک مردوں کے وارث رہ چکے
ان سے اب اہلِ سلف کی قربتوں کو بھی چھین لو

زندگی اور موت سے اے اہلِ دل کچھ بے مرو
زندگی اور موت کی سب برکتوں کو بھی چھین لو

کر دو اک بزم چراغاں شامِ ہجراں کو فراق
کارواں در کارواں ان ظلمتوں کو بھی چھین لو

کیفی اعظمی

قلعہ احمد نگر

(جہاں کانگریسی رہنما نظر بند تھے)

یہ بجھی سی شام، یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں
خونِ دل بھی اس فضا میں رنگ بھر سکتا نہیں

آ اتر آ کانپتے ہونٹوں پہ اے مایوس آہ
سقفِ زنداں پر کوئی پرواز کر سکتا نہیں

جھلملائے میری پلکوں پر مہ و خورشید بھی تو کیا
اس اندھیرے گھر میں اک تارا اتر سکتا نہیں

لوٹ لی ظلمت نے روئے ہند کی تابندگی ۔ رات کے کاندھے پہ سر رکھ کر ستارے سو گئے
وہ بھیانک آندھیاں، وہ ابتری وہ خلفشار ۔ کارواں بے راہ ہو نکلا مسافر کھو گئے
ہیں اسی ایوان بے در میں یقیناً نہ تھا ۔ آکے کیوں دیوار تک نقش قدم گم ہو گئے
دیکھ اے جوش عمل وہ سقف یہ دیوار ہے
ایک روزن کھول دینا بھی کوئی دشوار ہے

طوفان

لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا
تھی آس ہمیں جس طوفاں کی، لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا
مظلوم کی آہوں کا بادل، ظالم کے جہاں پر چھا ہی گیا
پربت سے راس کماری تک، خونیں پرچم لہرا ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

سوئی ہوئی ہلچل جاگ اٹھی، مجبور کے دل کی آہ لئے
کھوئی ہوئی بجلی کوند پڑی، مزدور کی تلخ نگاہ لئے
انساں کا ستم سہتے سہتے، انسان کا دل گھبرا ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

مدت سے فضا چپ چپ تھی، آخر کو وہ سناٹا ٹوٹا
سینوں سے نیا کہرام لئے، جذبات کا فوارا چھوٹا
اک خون کا بادل لہرایا، لہرا کے لہو برسا ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

ہنگامہ و شر کے ساغر میں، تسکین دماماں کی ے لے کر
اک زہر سے دھوئے پیالے میں، امرت سی گلابی شے لے کر
وہ کالا ناگ بغاوت کا، بانبی سے نکل کر آ ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

او مست جوانی! دیر نہ کر، بڑھ اور قدم لے طوفاں کے
یہ سیل تباہی سینچے گی، سوکھے ہوئے گلشن انساں کے

جو سکھ کا سویرا لائے گا وہ دکھ کا اندھیرا آ ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

جاگا ہندستان

جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

آج مرے باغی مطرب نے چھیڑ دئے وہ تار
ڈوب گئی سنسار کے دل میں تار کی ہر جھنکار
گونج اٹھے سب دریا جنگل، بولے کوہستان
جاگا ہندستان رے ساتھی، جاگا ہندستان

بجلی بن کر سرخ فضا میں، کوند رہے ہیں راگ
ناگن بن کر گرم ہوا میں، جھوم رہی ہے آگ
آگ وہ جس کی لو میں ناچے متوالوں کی جان
جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

اور مچے ہلچل دنیا میں، اور پڑے کہرام
لوٹ لیں بڑھ کر میخانوں کے سرخ چھلکتے جام
کب تک خون کی شبنم چاٹے ہر پیارا ارمان
جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

مست امنگوں کا دل بادل، جھوم چلا جو اور
لے کے لہو کی گہری لالی، چھائی گھٹا گھنگور
نور کی چھاگل چھلکا دے گا یہ کالا طوفان
جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

بنگال کا قحط

چند ٹکڑوں کے لئے جھانسی کی رانی بک گئی
آبروِ مریم کی سیتا کی جوانی بک گئی

سردار جعفری

وامق جونپوری

بھوکا ہے بنگال

پورب دیس میں ڈُگی باجی پھیلا دکھ کا جال
دکھ کی اگنی کون بجھائے سوکھ گئے سب تال
جن ہاتھوں نے موتی رولے آج وہی کنگال ــــــ رے ساتھی آج وہی کنگال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال

پیٹ سے اپنے پیٹھ لگائے لاکھوں الٹے کھاٹ
بھیک منگائی سے تھک تھک کر اترے موت کے گھاٹ
جین مرن کے ڈانڈے ملائے بیٹھے ہیں چنڈال ــــــ رے ساتھی بیٹھے ہیں چنڈال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال

ندی نالہ گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شئے کا الٹ گیا بیوپار
مٹھی بھر چاول سے بڑھ کر سستا ہے یہ مال ــــــ رے ساتھی سستا ہے یہ مال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

کوٹھڑیوں میں گانجے بیٹھے بنئے سارا اناج
سندر ناری بھوک کی ماری بیچے گھر گھر لاج
چوپٹ نگری کون سنبھالے چار طرف بھونچال ــــــ رے ساتھی چار طرف بھونچال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال
پرکھوں نے گھر بار لٹائے چھوڑ کے سب کے ساتھ

مائیں روئیں بلک بلک کر بچے بھئے اناتھ
سدا سہاگن بدھوا باجے کھوئے سر کے بال رے ساتھی۔ کھوئے سر کے بال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

اتّی پتّی چبا چبا کر جھوجھ رہا ہے دیس
موت نے کتنے گھونگٹ مارے بدلے سو سو بھیس
کال بکٹ پھیلائے رہا ہے بیماری کا جال رے ساتھی بیماری کا جال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

دھرتی ماتا کے سینے میں چوٹ لگی ہے کاری
بابا کالی کے پھندے میں وقت پڑا ہے بھاری
اب بھی اٹھ جا نیند کے ماتے دیکھ تو جگ کا حال رے ساتھی دیکھ تو جگ کا حال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال!

جگر مرادآبادی

بنگال

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سر راہ
بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں

بچوں کا تڑپنا و بلکنا و سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّر تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں ہیں امڈے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفان شرر دیکھ رہا ہوں

بیداری احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ ارباب نظر دیکھ رہا ہوں

انجام ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
ہیں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اک تیغ کی جنبش سی نظر آتی ہے مجھ کو!
اک ہاتھ پس پردۂ در دیکھ رہا ہوں

ساحر لدھیانوی

کلکتے کے بازاروں میں

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لئے ریشم کا ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو
ملوں کے منتظمو، سلطنت کے فرزندو

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے لاشے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

دیوندر ستیارتھی

نئے دھان سے پہلے

یہ کنگلوں کی قطار تھی ہو بہو کمان کی طرح ایک دوسرے کے متوازی کہیں سات آدمی کھڑے تھے تو کہیں دس، عورتیں اور بچے اور مرد جوان اور بوڑھے سبھی ایک ترازو میں تل رہے تھے۔ سبھی بھوکے تھے۔ ننھے بچے خشک چھاتیوں کو چھوڑے جا رہے تھے بڑی عمر کے بچے قطار سے نکل کر لنگر کے دروازے پر پہونچنے کے لئے ضد کر رہے تھے۔ لنگر والوں نے لاکھ کوشش کی کہ عورتوں اور مردوں کی الگ الگ قطاریں بن جائیں لیکن یہ بھاری بھرکم کمان اپنی بات پہ اڑی رہی۔

قطار میں کھڑے کھڑے لفظ "ست جگ،، جے شری کے ذہن میں گونج اٹھا۔ جانے ست جگ کب آئے گا۔ جانے آئے گا بھی یا نہیں۔ ست جگ، تریتا، دواپر کلجگ اور کلجگ کے بعد پھر ست جگ آتا ہے۔ ست جگ کتنے برس کا ہوتا ہے کچھ معلوم نہیں۔ کلجگ کی عمر بھی تو کوئی نہیں جانتا۔ ہاں یاد ہے تریتا بارہ لاکھ چھیانوے ہزار برس کا ہوتا ہے اور دواپر آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار برس کا۔ پروہت تو شاستر اور پوران پڑھتا ہے اس نے ٹھیک ہی کہا ہوگا، کلجگ کی عمر شاستر بھی نہیں جانتے۔ جانے کلجگ کا انت ہوگا بھی یا نہیں، شاید کلجگ تریتا سے بھی بڑا ہو۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی سنتی آئی ہوں کہ پاپ کی نیا بھر چکی ہے اور اب یہ ڈوبی کہ ڈوبی۔

اس کے ذہن میں ان گنت گدھ منڈلانے لگے۔ یہ سب گدھ اس پر جھپٹنے کی کوشش میں تھے۔ اس نے سوچا ست جگ اب آئے نہ آئے یہ گدھ تو ہم کنگلوں کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ ہم بچ نہیں سکتے۔ سب سہمے جا رہے ہیں۔ جیسے سب کو گدھ نظر آ رہے ہوں۔ ماکھال اس کا ہاتھ کھینچے ہوئے "ماں بھوک" ...... ماں بھوک" کی رٹ لگا رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بھاگ جاتا۔ لیکن اب اس کے جسم میں اتنی طاقت نہ تھی۔

بیٹے کے [illegible] ماکھال کی گردن سہلاتے ہوئے سوچا " آٹھ سال سے میں اسے پالتی آئی ہوں۔ ارے ارے اس کا پیٹ

تو کیا ہو رہا ہے۔ کس طرح ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ کہیں نہ کہیں مزدوری تلاش کر لیتا۔ لنگر کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہو جب کہیں تھوڑا دال بھات نصیب ہوتا ہے۔ آخر ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟ . . . . . . اس کے ذہن میں بھوکے گدھ برابر منڈلانے رہے۔ یہ گدھ جو راکھال پر بھی جھپٹنا چاہتے تھے۔ راکھال نے ماں کا ہاتھ کھینچتے ہوئے پوچھا، "ہمیں دال بھات کب ملے گا۔ گرم گرم دال بھات"

"ہماری باری تو آئے راکھال!" جے شری نے اسے چومنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ جانے ہماری باری کب آئے گی؟ جانے ہماری باری آنے سے پہلے ہی سب دال بھات ختم ہو جائے گا۔ شاید ہم یہاں کھڑے کھڑے گر پڑیں گے اور ان گنت گدھ ہمیں نوچ نوچ کر کھا جائیں گے . . . . بھوک کے مارے پیٹ شمشان کی طرح جلتا رہتا ہے۔ ہائے رام ہماری بھوک اب کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ہم بھوکے ہیں ـــــ اور گدھ بھی بھوکے ہیں . . . کوئی کہاں تک دھیرج کرے گا؟ جانے ابھی اور کتنی دیر ہوگی؟ زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی سہی۔ جلدی نہیں تو دیر ہی سہی۔ بس دال بھات ملے ضرور . . . یہ لنگر والے بھی کتنے دیاوان ہیں۔ وہ ہمیں موت کے منہ سے بچانے کے جتن کر رہے ہیں۔

. . . جے شری، او جے شری . . . گاؤں چھوڑتے ہوئے اس کے شوہر نے کہا تھا ـــ پہلے میری موت ہوگی جے شری۔ جب تک میں زندہ ہوں جم دوت تمہاری طرف دیکھ بھی نہیں سکتے . . . . یہ مت کہو جی دیو۔ پہلے میں مروں گی، تم بچ جاؤ اور میرا راکھال بچ جائے . . . ارے ارے جے شری تمہیں چنتا کاہے کی ہے۔ راکھال کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔

اس نے سوچا اس کلجگ میں یہ ایک ست جگی بات ہوئی۔ کہ اس کا شوہر پہلے چلا گیا۔ کنگلے کا جیون کسے پسند ہوگا؟ ارے یہ جیون بھی کوئی جیون ہے یہ تو اک بوجھ ہے بوجھ، بھاری بھرکم بوجھ، ارے کوئی اسے کب تک ڈھونڈتا رہے گا۔

. . . جے شری ـــــ او جے شری! کل کی بیل سدا ہی ہری۔ جے شری، ارے ارے تم گربھ وتی ہو، جے شری سات مہینے تو ہو بھی گئے دو مہینے رہتے ہیں۔ بیٹا جنم لے گا۔ تو سب دکھ دلدر دور ہو جائیں گے اور اگر بیٹی آ گئی؟ اونھ بیٹی نہیں چاہئے، بیٹا چاہئے بیٹا۔ بیٹا جو زمین میں ہل چلاوے گا۔ بیٹا جو برس کے برس نیا دھان اگائے گا . . . . . .

یہ بھیانک کال اور میں گربھ وتی ہوں، جے شری نے جھنجھلا کر راکھال کا ہاتھ جھٹک دیا۔ جیسے سب غصہ اسی پر انڈیل دینا چاہتی ہو۔ لیکن اگلے ہی پل وہ پہلے کی طرح اس کی گردن تھپتھپانے لگی، راکھال ـــــ چندا بیٹا ـــــ ہاں ہاں کل کی بیل سدا ہی ہری۔

سکھ میں دان دیا جاتا ہے، دکھ میں دان کا پھل ملتا ہے ـــــ پیچھے سے ایک بوڑھا کھانستے ہوئے کہہ رہا تھا: "ہم دان لینے پر مجبور ہیں۔"

ایسا کال تو نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا ـــــ ایک بڑھیا کہہ اٹھی ـــ پہلے تو کال اسی سے پڑتا تھا جب برکھا نہ ہوتی اور دھان کی فصل ماری جاتی ـــــ لیکن اب کے اتنا دھان ہوا ـــــ پھر بھی یہ بھیانک کال ـــــ ہے بھگوان یہ کال کب ختم ہوگا؟

ہم پھر اپنے گاؤں کو جائیں گے دادی ـــ ایک لڑکی نے شہ دی۔ جن کو مرنا تھا وہ کبھی کے مر گئے اب یہ لنگر والے ہمیں مرنے نہ دیں گے۔

تم جینا چاہو تو شوق سے جیو بیٹی ـــــ بڑھیا بولی۔ مجھے تو ایشور اپنے پاس بلا لے تو لاکھ لاکھ دھنیہ باد کروں

جے شری بڑے دھیان سے یہ باتیں سنتی رہی۔ دائیں ٹانگ کا بوجھ بائیں ٹانگ پر ڈالتے ہوئے راکھال کا منہ چوم لیا بولی "تیرا باپ تو ہمیں چھوڑ گیا راکھال۔ اب تو ہی اس کی نشانی ہے۔ راجہ بیٹا۔ چندا بیٹا"

سورگ میں تو کال نہ پڑتا ہوگا ـــــ بغل سے وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ بھوک کی چاہ ماری بھجو گتے ہوئے ہمیں کتنا کشٹ

ہوتا ہے۔ یہ ہمارے دیوتا کیا جانیں؟

"سنکھیر لاگیا ایک گھر باندھی نون۔ ان رے بوڑھا گیرو" ــــ وہ بڑھیا گنگنا رہی تھی۔ چنڈی داس بابا سچ کہہ گئے ــــ سکھ کے لئے یہ گھر بنایا تھا۔ ہائے یہ آگ میں جل گیا ــــ!

اور جے شری کو جھٹ اپنی جھونپڑی کا خیال آیا۔ ابھی تو وہ اسی طرح کھڑی ہوگی۔ اس کے ذہن میں سنکھ کی آواز گونج اٹھی جیسے دیوتاؤں کو جگایا جا رہا ہو۔ دیوتا سورگ میں رہتے ہیں۔ لیکن ان کی مورتیاں مندروں میں ستھاپت کی گئی ہیں۔ روز رات کو انھیں سلایا جاتا ہے اور صبح کو جگایا جاتا ہے۔ اشنان کے بعد طرح طرح کے بھوجن ان کے سامنے رکھے جاتے ہیں، زمیندار بابو کے راج محل سے الگ۔ ان کے لئے پکوان پک کر آتے ہیں۔ شاید اسی لئے وہ زمیندار بابو کو کچھ نہیں کہتے۔ چاہے وہ غریب پرجا پر کتنا ہی اتیاچار کیوں نہ کرتا رہے۔ مہاجن بھی دیوتاؤں کو خوش رکھتا ہے اور ہماری رہی سہی زمین ہڑپ کرتے ہوئے زمیندار بنتا چلا جا رہا ہے۔ دیوتا جیب میں لئے ہوئے لوگ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں، پتھر اور دھات کے دیوتا ان کا نیائے نہیں کرتا ہے۔

پیچھے سے دھکے شروع ہو گئے۔ جے شری نے جھٹ راکھال کو سنبھال لیا۔ پیچھے مڑکر دیکھنا کٹھن تھا۔ ان لوگوں کو شرم بھی تو نہیں آتی۔ آج انھیں دال بھات نہ دیا جائے تو کل سے یہ آدمیوں کی طرح کھڑے ہوا کریں گے۔ لیکن جھٹ اس کے دماغ کے دوسرے حصے سے آواز اٹھی ــــ دال بھات کیوں نہ دیا جائے یہ تو بہت کڑی سزا ہوگی۔ یہ بھی کیا کریں؟ پیچھے سے یہ بھی تو دھکے کھا رہے ہیں ــــ کٹھل کے پیڑ نہ ہوتے تو سورج اس کے نیم برہنہ جسم پر سوئیاں چبھوتا چلا جاتا۔ چھاؤں کے باوجود وہ پسینے پسینے ہوئی جاتی تھی۔ راکھال نے اس کا ہاتھ کھینچا۔ گردن گھما کر وہ ماں کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ارے ارے راکھال تو بھی پسینہ پسینہ ہو رہا ہے۔ میرا راجہ بیٹا ــــ میرا چندا بیٹا تجھے بہت بھوک لگی ہوگی۔ آج تجھے میں اپنے حصے میں سے بھی تھوڑا دال بھات دے دوں گی ــــ پھر ذرا جھک کر اس نے راکھال کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ــــ ہائے یہ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا راکھال؟ ہائے رام یہ کیسی بیماری ہے...؟

اگلے ہی پل اس نے ہاتھ پھیر کر راکھال کے ماتھے سے پسینہ کی بڑی بڑی بوندیں پونچھتے ہوئے اس کا منہ چوم لیا۔ راجہ بیٹا راجہ بیٹا۔ آج گرم گرم دال بھات کھائے گا میرا راجہ بیٹا۔

وہ زور زور سے سر کھجا رہی تھی۔ موٹی جوئیں۔ لہو پینے والی جوئیں۔ جانے اتنی جوئیں کہاں سے پیدا ہوتی ہیں؟ جانے یہ جوئیں کبھی مریں گی بھی یا نہیں۔ ہائے رام یہ جوئیں میرا سب لہو پی جائیں گی۔

جانے اب گاؤں کی کیا دشا ہوگی؟ ــــ پیچھے سے وہ بوڑھا کہہ رہا تھا۔ مجھے گاؤں چھوڑے ڈھائی ماہ ہو گئے، اب تو وہاں بھوت بسنے لگے ہوں گے بھوت، ــــ بڑھیا بولی، اب وہاں انسانوں کا کیا کام؟

چاول کا دانہ گاؤں سے نکال کر لے گئے تو گاؤں والے گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

وہ لڑکی کہہ اٹھی، اب کوئی اپنے گاؤں کو لوٹ کر نہیں جائے گا۔

کہاں چلا گیا اتنا چاول؟ ــــ جے شری نے جھنجھلا کر کہا۔ کون لے گیا چاول؟ ہے بھگوان! تجھ سے یہ انیائے کیسے دیکھا گیا؟

قطار آگے کو سرک رہی تھی۔ ابھی لنگر کا دروازہ دور تھا۔ اس طرح تو بہت وقت بیت جائے گا۔ پاؤ گھنٹہ، آدھ گھنٹہ ایک گھنٹہ، جانے کتنے آدھ گھنٹے، جے شری کی انگلیاں اس کے بالوں میں دھنس گئیں اس کا سر چکرا رہا تھا۔ پیچھے سے اچھا اچھا شور

سنائی دینے لگا۔ جیسے لوگ لنگر کے دروازے پر دھاوا بولنے کی سازش کر رہے ہوں۔ یہ شور قطار کے اگلے حصے کی طرف سرکنے لگا ہائے دال، ہائے بھات ـــــ کسی نے نعرہ لگایا اور پھر کل قطار پنکھے کی طرح ڈولتی دکھائی دی۔

یہ انتظار اسے ایک لمبا بے رس خواب معلوم ہوا۔ یہ زندگی تو ایک بوجھ ہے اسے کب تک اٹھایا جاتا ہے؟ اس نے گھوم کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اسی لمحے کے انتظار میں کھڑا تھا کہ یہ ادھیڑ عورت گردن گھما کر اس کی طرف دیکھے۔ وہ جے شری کو گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو باوری ہم سب مروے ہیں مروے ہیں مردے، قبروں سے اٹھ کر ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ چلو پھر سے قبروں میں جا سوئیں باوری! اسے سیلاب کا دھیان آیا۔ یہ سیلاب تو ہر سال آتا ہے۔ بھگوان کا سراپ، کتنے گاؤں بہہ گئے، کتنے مویشی ڈوب گئے، ہائے ہائے رام آدمی کتنے کمشٹ سہتا ہے۔ سیلاب کے بعد زمین میں دراڑیں ہی دراڑیں نظر آئیں، تالابوں میں پینے کا پانی گندا اور کسیلا ہو گیا۔ ہے بھگوان۔ یہ سیلاب بند نہیں ہو سکتا۔ یہ بھوک کا سیلاب، ہائے ہم ہی دھان اگائیں اور ہم ہی بھوکے مریں۔ یہ کہاں کا نیائے ہے؟

سر کھجانے کے بجائے اب وہ نتھنوں کے بال اکھاڑ رہی تھی۔ راکھال چاہتا تھا کہ بندر کی طرح زقند لگائے اور ابھی لنگر کے دروازے پر پہنچ جائے۔ اپنے اپنے حصے کا دال بھات لے کر ہر کوئی پرے ندی کی طرف چلا جاتا ہے وہ بھی اسی طرح کریں گے۔ اس نے سوچا۔ وہ ماں کے حصے میں سے تھوڑا دال بھات ضرور لے گا آج اسے کتنی بھوک لگ رہی تھی۔ آج تو وہ اپنے حصے سے ماں کو تھوڑا بھات بھی نہ دے گا۔

پسینے کی بو تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ جے شری کے ذہن میں برابر گاؤں کا خیال چکر لگاتا رہا۔ اب کسے خبر ہو سکتی ہے کہ وہ لوٹ کر یہاں جائے گی یا نہیں۔ شوہر نہیں تو راکھال تو ہے۔ راکھال محنت کرے گا اور اپنی زمین چھڑائے گا۔ راستے کے بھکاریوں کی طرح وہ کبھی اپنے بچے کے ساتھ ماری ماری نہیں پھرے گی وہ ضرور اپنے گاؤں لوٹے گی۔

عمر بھر کا پسینہ جیسے آج ہی ٹپک پڑے گا ـــــ لڑکی کہہ رہی تھی۔

بڑھیا بولی کیا دھن وان کیا نردھن، پسینہ تو سب کے بدن سے ٹپکتا ہے

پیچھے سے بوڑھا کہہ اٹھا ـــــ میں پیاسا ہوں ـــــ مجھ میں پانی کی بوند بھی نہ ہو گی۔ جانے اتنا پسینہ کہاں سے نکل رہا ہے؟ اور پھر بوڑھے نے جے شری کو ٹھو کا دیا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ باوری تو کیوں چپ کھڑی ہے۔ لیکن جے شری نے گردن گھما کر بوڑھے کی طرف دیکھنے یا لڑکی سے بات کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

سامنے سے ایک نوجوان نے گردن گھما کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ہوں تو میں تیرا کنھیا، رادھے، لیکن میں بیچ بیچ بھوک سے مرا جا رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے رادھے تو بھی بھوکی ہے۔ جے شری نے کنھیا اور رادھا کو دھیان سے دیکھا۔ کبھی وہ بھی تو اپنے کنھیا کی رادھا تھی۔ پھر اسے اپنے شوہر کے آخری دنوں کا دھیان آیا۔ اسے بھیک مانگنا پسند نہ تھا اور اس نے پران چھوڑ دئے اس دن وہ کیسے بلک بلک کر روتی رہی تھی۔ بالی بیچ کر اس نے داہ سنسکار کے لئے لکڑی خریدی تھی۔ ہائے رام آج اس چتا کی راکھ ہوا اڑا ئے لئے پھرتی ہو گی ـــــ جانے کہاں کہاں؟

اس کا ذہن پھر گاؤں کی طرف گھوم گیا۔ ابھی کل تک گاؤں میں اس کی عزت بنی ہوئی تھی۔ کہیں نہ کہیں سے جاترا والے آنکلتے، کنھیا اور رادھا کا کھیل کھیلا جاتا۔ چنڈی داس کے پد گائے جاتے۔ جیون کو پنکھ لگ جاتے۔ ہر کوئی اڑنے لگتا۔ وہ برس کے برس برسنا جاترا والوں کے لئے نیا دھان نکالا کرتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پیسے لے کر خوش رہتے ہیں وہ مہاجن کی دکان پر چلی جاتی

اور سستے داموں دھان بیچ کر نقد پیسے آتی ، رات کو مشعلوں کی روشنی میں جب جاترا والے تھالی میں آرتی کا چوکھا دیپک رکھ کر اسے ساری سبھا میں گھماتے تو وہ جھٹ اس میں پیسے ڈال دیتی ۔ پچھلی باران کے لئے تین سو روپے جمع ہو گئے تھے پورے پچاس تو اکیلے زمیندار بابو نے دئے تھے ۔ اونھ یہ روپئے بھی تو ہمارے ہی تھے ۔ ارے کام کریں ہم اور موج اڑائیں زمیندار بابو ، دھنیہ ہے ، تمہارا نیائے ہے بھگوان دھنیہ ہے تمہاری لیلا ۔ اسے یاد تھا کہ اس نے صرف ایک روپیہ دیا تھا ۔ ایک روپیہ ، کنھیا ناچ ، رادھا ناچ ، اس کا تو کوئی مول نہیں دیا جا سکتا جاترا والوں کو تو جو کچھ دیا جائے تھوڑا ہے ۔ ارے یہی تو ان کی کھیتی ہے ۔ مردنگ کہتا ہے ، کنھیا سانورے رادھا گوری ۔ رادھا گاتی ہے ۔ میں برج کی گوپی ، مرلی والے کے سنگ راس رچاؤں ارے کہاں برج اور کہاں بنگلہ دیش ۔ سارا دیش تو کنھیا سانورے اور رادھا گوری کا ہے ۔

یہ بھیانک کال ، ارے ارے اسے رادھا گوری اور کنھیا سانورے بھی نہ روک سکے ۔ یہ سوچتے ہوئے جے شری نے لنگر کے دروازے کی طرف ایک طویل نگاہ دوڑائی ۔ اس نے بانہیں پھیلانے کی کوشش کی ۔ ایک بار پھر وہ گاؤں کی یاد میں کھو گئی ۔ اسے یاد تھا کہ کیسے چاول مہنگا ہوتا گیا اور کس طرح لوگ اندھے ہو کر چاول بیچتے گئے ۔ مہاجن خوش تھے ۔ وہ کسان کو سمجھا رہے تھے ، اب مہنگے بھاؤ چاول بیچ ڈالو پھر سستے بھاؤ خرید لینا سمے سمے کا جادو ہے ۔ یہ اوسر نت تو نہیں آتا اور ہم مورکھوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ دھان فصل تک کھانے کے لائق ہی چاول گھر میں رکھ لیں چاول نکلتا گیا ۔ گھر میں کھانے لائق چاول بھی جا رہا تھا ۔ آخر وہ بھیانک گھڑی بھی آئی جب مہاجن کہنے لگے چاول کا دانہ سونے کے بھاؤ ملے گا کلجگ میں ۔ ارے ارے یہ کیسا کلجگ ہے !

پیچھے سے بوڑھے نے جے شری کو ٹھوکا دیا ۔ جے شری مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی ۔ جیسے کہہ رہی ہو ، ہاں بابا دنیا مسافر خانہ ہے ۔ آج یہاں کل وہاں ۔ اب ہم بھکاری رہیں گے ——— راستے کے بھکاری ، نت نت تو یہ دال بھات ملنے سے رہا ۔ اسے یاد آیا کہ گاؤں چھوڑنے سے کچھ ہی دن پہلے اس نے ہاٹ بازار میں ایک بوڑھے کو رادھا اور کنھیا کی مورتیاں بیچتے دیکھا تھا ۔ ارے ارے وہ بوڑھا تو اس بوڑھے سے ملتا جلتا تھا ۔ کتنا مجبور تھا ۔ جن مورتیوں کو اس کے بزرگ پوجتے آئے تھے انھیں وہ بہت سستا بیچ رہا تھا ۔ کون جانے یہ وہی بوڑھا ہو ——— اس کے جی میں تو آئی کہ پوچھ لے ، مگر وہ چپ کھڑی رہی ۔

پھر اس کے سامنے تارا بر کی شکل گھوم گئی ۔ اس نے دلالوں کی بری گت بنائی تھی ۔ جو شہر سے عورتوں کی دلالی کرنے آتے تھے ۔ حرامی ، سور ، راکشس ۔ چلے آتے گاؤں میں ، یہ گالیاں اس کے ذہن میں گونج اٹھیں ، ہائے ری دنیا ! . . تارا بر نے گاؤں کی سب سے سندر لڑکی کو پکڑ کر بیچ ڈالا ۔ جانے وہ کدھر نکل گیا ۔ حرامی ، سور ، راکشش ، گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ ایک نہ دو تین پوری سات لڑکیوں کو بیچ چکا تھا ۔ اسے تو خوب بھات ملتا ہو گا ۔ رس گلے ، سندیش اور جانے کیا کیا مٹھائی ۔ اسے ہماری طرح لنگر کے سامنے گھنٹوں انتظار نہ کرنا پڑتا ہو گا ۔ اب تو وہ بڑا دلال بن چکا ہو گا ، سب سے بڑا دلال ۔

اب لنگر کا دروازہ نزدیک تھا ۔ رکھال خوش نظر آتا تھا ۔ اب ماں کا ہاتھ کھینچ کر لنگر کے دروازے تک دوڑ لگانے کی کچھ ضرورت نہ تھی ، گرم گرم دال ، گرم گرم بھات وہ خود کھائے گا ۔ ماں لاکھ کہے کہ مجھے تھوڑا سا دیدو رکھال ۔ بھگوان نے میرے بڑا پیٹ لگایا ہے اور مجھے تم سے زیادہ بھوک لگی ہے ۔ وہ ایک نہیں سنے گا ۔

. . . . ‏. جے شری او جے شری ۔ ارے مہاجن کے پاس سب زمین بندھک رکھ دی اور ایک بوری چاول ملا ۔ ایک بوری چاول اور جانتی ہے ۔ آج کل ایک بوری چاول کا کیا مول ہے ؟ سوا دو سو بلکہ ڈھائی سو ارے اب تو کوئی تین سو بھی مانگ لے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ۔ . . . پچھلے دو سات دن سے ہم گھوئیاں کے پتے کھا رہے ہیں اور گھوئیاں کے پتے بھی کب تک ملیں گے ؟ . . . . ارے سن تو جے شری آدھا بوری

چاول کے لیے ایک بیگھہ زمین بیچ کر آ رہا ہوں۔ پاپ مہا پاپ پتی دیو، ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو تم نے راکھال کا بھاگ بیچ ڈالا۔ ہائے رام اب راکھال یہ زمین کبھی نہ چھڑا سکے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے میں کیا کرتا جے شری؟ مہاجن تو ساری زمین کی رجسٹری کرانے کے بدلے دو بوری چاول دینے کو تیار تھا۔ میں نے سوچا راکھال کا سارا بھاگیہ کیوں بیچ ڈالوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ہماری زندگی میں تو یہ کلجگ ختم ہونے سے رہا۔ پتی دیو یہ کال ہمیں کھا جائے گا۔ پھر ست جگ آئے نہ آئے پتی دیو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلو اس گاؤں سے نکل چلیں۔ اب ہم دھان کی فصل کے لئے بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

اسے یاد تھا کہ انھوں نے رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گاؤں چھوڑا تھا۔ اسی رات مہاجن کی بیل گاڑیاں بھی کسی چور بازار کی لمبی پراسرار یاترا پر چل پڑی تھیں۔ چاول ہی چاول اتنا چاول کہاں جا رہا تھا۔

اب وہ لنگر کے دروازے کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اسے اسی وقت پتہ چلا کہ جب راکھال نے اپنے حصے کا دال بھات لے لیا اس نے بھی اپنے حصے کا دل بھات سنبھال لیا۔

ان داتا سدا ہی سکھی ــــ وہ بولی، ان داتا کی سدا ہی جے

ماں، ٹھنڈی دل اور ٹھنڈا بھات ــــ راکھال نے للچائی نگاہوں سے ماں کا دل ٹٹولتے ہوئے کہا۔ یہ تو بہت تھوڑا سا ہے ماں۔

تھوڑا بھی بہت ہے بیٹا ــــ جے شری نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ارے بیٹا یہ بھی نہ ملتا تو ہم کیا کر لیتے؟

وہ ندی کی طرف چلے جا رہے تھے۔ پیچھے سے وہ لڑکی جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ان کے ساتھ آملی۔

ذرا رک کیوں نہیں جاتی دیدی ــــ لڑکی بولی، میری ماں کو بھی آ لینے دو، ہم ایک ہی گاؤں کی نہیں تو نہ سہی۔ بھگوان نے ہمارا ملاپ کرا دیا۔

ہاں بہن ہم دکھ کے ساجھی ہیں ــــ جے شری نے اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں حیرت لہرا گئی جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ ارے ارے میرا تو خیال تھا تم اس نوجوان کے ساتھ بیٹھ کر دال بھات کھاؤ گی۔

پیچھے سے لڑکی کی ماں بھی آ گئی۔ اس نے راکھال کی ٹھوڑی اٹھا کر اسے پیار سے چوم لیا۔ ارے چندا بیٹا تھوڑا سا دال بھات تو تجھے میں بھی دے سکتی ہوں۔ اپنے حصے میں سے۔

لڑکی گھبرا گئی بولی۔ ارے سبھی کو جیوت رہنا ہے ماں۔ اپنے حصے کا دال بھات ہر ایک کو خود کھانا چاہیے۔

ندی کنارے پہونچ کر انھوں نے اپنا اپنا دال بھات خود کھا لیا۔ راکھال کے پھولے ہوئے پیٹ پر نگاہیں جماتے ہوئے ماں کہہ رہی تھی ــــ ارے بیٹا تیرا پیٹ تو ایسا نظر آتا ہے جیسے کسی زمیندار کے بیٹے کا ہو۔

یہ تو کم بھوجن کے کارن ہے ماں ــــ جے شری اب کون دید راکھال کو اودشدھی دے گا؟ جے شری کی رانوں میں جیسے کسی نے سیسہ بھر دیا تھا۔ اس کے کولھے بھی بری طرح دکھ رہے تھے۔ وہ زمین پر لیٹ گئی۔

راکھال بھی نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک رنگ جاتا تھا۔ جیسے دیا بجھ رہا ہو۔ جیسے چاند ڈوب رہا ہو۔

جے شری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی اور ماں بھی گھبرا گئیں۔ انھوں نے راکھال کو آرام سے لٹا دیا۔ ماں آہستہ آہستہ اس کا پیٹ

سہلانے لگی اور وہیں لیٹے لیٹے راکھال کی آنکھ لگ گئی۔

جے شری برابر گھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بولی —— "کچھ نہیں معلوم ہے بہن کہ کلجگ کب ختم ہوگا"

"یہ تو بہت کٹھن پرشن ہے دیدی۔ اس کا جواب تو لال جھنڈے والوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔ جو ہمیں روز سمجھاتے ہیں کہ نیا زمانہ آنے والا ہے"

لیٹے لیٹے راکھال نے کروٹ لی، اسے نہایت پتلی اجابت ہوئی۔ جے شری نے راکھال کو پونچھ کر دوسری طرف لٹا دیا اور مٹی ڈال کر غلاظت کو ڈھانک دیا اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس بار پھر وہ راکھال کا پیٹ سہلاتی رہی۔

"ست جگ، نیا زمانہ یہ کب آئے گا بہن؟" جے شری نے مائی پرواز پرندے کی طرف بانہہ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میں نہیں جانتی ہوں دیدی سنتی ہوں —— نئے زمانے میں زمیندار نہ ہوں گے۔ جو ہل چلائے گا وہی زمین کا مالک ہوگا"

"یہ زمانہ کب آئے گا —— ؟ ست جگ؟"

"لال جھنڈے والے کہتے ہیں دیدی۔ یہ دال بھات ہمیں دان میں نہیں دیا جا رہا ہے۔ اس پر ادھیکار ہے۔ وہ کہتے ہیں سب لوگ پھر اپنے گاؤں کو لوٹیں گے۔ پھر نیا دھان ہوگا۔ ہم اتنا کھائیں گے۔ کہ خوب موٹے ہو جائیں گے" اس نے اپنی بانہوں کو پھیلاتے ہوئے کہا"

جے شری نے بہت سے قلعے تعمیر کرے، کلجگ ختم ہوا۔ ست جگ شروع ہو چکا تھا۔ اب یہ ست جگ کبھی ختم نہ ہوگا اس کا ذہن بیدار ہو گیا۔ کنھیا کی بانسری گونج اٹھی۔ ایک نیا نغمہ جاترا والے سبھا میں جو کھا دیا گھما رہے ننھے لوگ بڑھ بڑھ کر تھال میں پیسے ڈال رہے تھے کنھیا کہہ رہے تھے سب اس دیش میں کال نہیں پڑے گا۔ رادھے ——! اور رادھا کہہ رہی تھی —— دیکھو کنھیا اب کبھی زمیندار کسانوں پر حکم نہ چلائیں۔ چور بازار بھی سب ختم ہو جائیں ... . . . کنھیا کہہ رہے تھے —— جو ہل چلائے وہی زمین کا مالک زمیندار وہی جو ہل چلائے ... . .

راکھال کی حالت خراب ہوتی گئی۔ جے شری گھبرا گئی۔ اس نے راکھال کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ تو کیا یہ دیا بجھ جائے گا۔ جیسے وہ اسے اپنے آنچل میں چھپا کر ہوا کے حملے سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ارے ارے یہاں تو دئے کا تیل ہی ختم ہو رہا ہے ہائے رام میں لٹ جاؤں گی۔

لڑکی بولی "گھبراؤ مت دیدی۔ راکھال اچھا ہو جائے گا"

جے شری ہونی سے بے خبر نہ تھی وہ موت کو دیکھ سکتی تھی۔ راکھال کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی جیسے وہ کسی چھپی ہوئی طاقت سے دعا مانگ رہی ہو۔ اس نے راکھال کی نبض پر ہاتھ رکھا اور چیخ ماری۔ راکھال کی نبض ڈوب رہی تھی۔

اس کا خون سب پانی بن چکا تھا۔ اب تو یہ پانی بھی خشک ہو رہا تھا۔ سب کے دیکھتے دیکھتے اس نے پران چھوڑ دیا۔

لڑکی لال جھنڈے والوں کو بلا لائی۔ وہ تین آدمی تھے۔ ایک نے اپنے ہاتھ میں جھنڈا تھام رکھا تھا۔ جھنڈے پر ہنسیا دیکھ کر اسے خیال آیا۔ کہ یہ تو یہ تو وہی ہمارا ہنسیا ہے۔ ہمارا دھیان کاٹنے کا ہنسیا۔ اس نے اپنی کلائیوں میں چاندی کے کنگن دکھائے۔ لیکن انھوں

نے انھیں قبول نہ کیا۔

وہ دوڑ کر لکڑی لے آئے۔ ذرا ہٹ کر چتا بنائی گئی، جے شری نے اپنی چیتھڑا چیتھڑا چادر میں راکھال کو کفنا دیا۔ جھنڈے والوں نے اسے اٹھا کر چتا پر رکھا۔ جے شری نے اپنے ہاتھ سے چتا میں آگ لگائی۔

لال لال شعلوں کے پس منظر میں رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ جے شری بولی ابھی کلجگ کا انت ہونے میں دیر ہے ابھی ست جگ شروع نہیں ہو سکتا۔

جھنڈے والے جا چکے تھے۔ جے شری چتا کے پاس لیٹ گئی۔ لڑکی اور ماں اسے تسلی دیتی رہیں۔ . . . جے شری، او جے شری اس کا شوہر اس سے کہہ رہا ہو۔ ارے میری نشانی تو تیرے پاس رہے گی، ارے تو گربھ وتی ہے جے شری . . . . اور پھر جیسے اسے زمین دھکا سا لگا ہو، یہ بھوک ـــ بھیانک بھوک اور میں گربھ وتی ہوں، ـــ میری بھوک کوئی آج کی بھوک تو نہیں۔ یہ تو جگ جگ کی بھوک ہے اور پھر اسے خیال آیا کہ یہ بھوک کا کلجگ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہائے رام ست جگ کیسے شروع ہو سکتا ہے۔

وہ رات رتجگے ہی میں کٹ گئی۔ سورج کی پہلی کرنوں کی روشنی میں جے شری نے چتا سے راکھ کی چٹکی اٹھا کر ماتھے پر لگائی۔ اس کے ذہن میں پھر ان گنت گدھ منڈلانے لگے۔ یہ گدھ بہت بھوکے تھے۔ اب یہ گدھ زندہ انسانوں پر جھپٹنا چاہتے ہیں ایک دن، دو دن، تین دن

جے شری وہیں پڑی رہی۔ لڑکی اور ماں کے لاکھ اصرار کرنے پر بھی وہ لنگر کی طرف جانے کے لئے رضامند نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح مر جانا چاہتی تھی۔

تم تو گربھ وتی ہو دیدی اور گربھ وتی کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیئے" لڑکی نے جے شری کے سینے پر اپنا سر تھپتھپاتے ہوئے

جے شری نے ناک سکیڑتے ہوئے لڑکی کو پرے ہٹا دیا۔ اسے شاید لفظ "گربھ وتی" سے نفرت ہو چکی تھی۔

ماں بولی۔ "تیرے تو بیٹا جنمے گا بیٹی جے شری"

جے شری اٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے سوچا اس کا بیٹا ست جگ میں جنمے گا۔ وہ اپنا بھاگیہ اپنے ساتھ لائے گا۔ وہ ست جگ میں پلے گا۔

لڑکی بولی۔ "لال جھنڈے والے کہتے ہیں، دیدی کہ زمین نئی کروٹ لے رہی ہے، اب زمانہ شروع ہوگا۔

نیا زمانہ ـــ ست جگ؟

"ہاں دیدی وہ کہتے ہیں انھوں نے سمے کے مڑتے دھارے کو دیکھ لیا ہے"

"وہ سچ کہتے ہوں گے!"

"وہ کہتے ہیں اب نئی پربھات ہوگی۔ دھرتی کی کایا پلٹ جائے گی۔

"سچ؟"

"وہ کہتے ہیں اب نیا دھان اُگے گا۔ جنتا کے لئے دھان۔ سب کے لئے دھان"

جب تو ست جگ آ رہا ہے ست جگ"

پاس سے ماں نے چڑھ کر کہا۔ "ابھی ست جگ کہاں ہے؟ ابھی کلجگ ہے۔ مجھ سے پوچھو یہ کلجگ کبھی ختم نہ ہوگا۔
ماں نے ایک دلال کی بات چھیڑ دی ہے جے شری کی آنکھوں میں تارا پر کا روپ گھوم گیا۔ ماں کہہ رہی تھی۔ اور وہ مجھ سے میری بیٹی مانگتا تھا۔ کہتا تھا تیری بیٹی تو راج کنیا ہے۔ اس کے بھاگیہ میں تو رانی ہونا لکھا ہے۔ بول اس کا کیا لے گی۔ نگوڑے نے رتی بھر شرم نہ کی!"
"تم نے کیا جواب دیا ماں؟" جے شری نے حیرت سے پوچھا۔
"میں نے تو سو بات کی ایک بات کہہ دی کہ نا بابا میری لڑکی تو بھاگیہ ونتی ہے وہ اپنا بھاگیہ خود چنے گی۔"
جے شری نے سوچا شاید تارا پر ادھر آنکلا ہو، شاید تارا پر ہی ہو۔ لڑکی سر جھکائے بیٹھی رہی اور ڈھول پر گول گول گھیرے بناتی رہی۔

حرامی، سور، راکشش —— جے شری نے تارا پر کو من ہی من میں گالی دیتے ہوئے کہا۔ "پاپوں کی نیا بھر کر ڈوبتی ہے۔"
"ہاں بیٹی پاپوں کی نیا بھر کر ڈوبتی ہے۔"
اس دلال نے اپنا نام کیا بتایا تھا، ماں؟ تارا پر تو نہیں تھا نام اس کا؟"
"میں نے پوچھا نہیں بیٹی اور اس نے بتایا نہیں اپنا نام۔"
"دیکھنے میں کیسا تھا وہ؟ —— بہت موٹا تازہ گھنگھریالے بال، بڑی بڑی آنکھیں —— اور آواز ایسی جیسے جھانجھ بجتی ہے —— کہو نا ماں؟
"تم نے کیسے جان لیا بیٹی وہ ٹھیک ایسا ہی تھا؟"
"وہ وہی تارا پر ہوگا وہ ہمارے گاؤں کا تارا پر!"
"تمہارے گاؤں کا تارا پر!"
"ہاں ماں پہلے تارا پر نیک آدمی تھا۔ اس نے پہلی بار گاؤں میں آنے والے دلالوں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ پھر خود دلال بن گیا۔ یہ کیسا کلجگ ہے! دیوتا بھی راکشش بننے لگے۔"
پہلے وستر اجلا ہوتا ہے بیٹی میلا ہونے پر اسے دھویا بھی جا سکتا ہے۔"
ادھر لڑکی ڈھول پر بہت بڑا چکر بنا چکی تھی۔ جے شری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تم یہی کہنا چاہتی ہو نا بہن کہ سماں بھی ایک چکر ہے!"
"ہاں دیدی نہ اس کا آدی ہے نہ انت۔"
"ست جگ، تریتا، دواپر، کلجگ، کلجگ اور کلجگ کے بعد پھر ست جگ آتا ہے۔ پہلے وستر اجلا ہوتا ہے۔ پھر جب ڈھل جاتا ہے تو سمجھو ست جگ آ گیا۔
"ست جگ ضرور آئے گا، دیدی، اپنی زمین ہوگی اپنے ہل، اپنے ہنسئے اور دھان اگانے والے کسان، کنگلوں کی طرح لگ کے سامنے کھڑے نہیں رہا کریں گے۔
جے شری زمین پر لیٹ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ وہ گربھ ونتی تھی۔ کیسی کیسی ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔ ابھی تو دو مہینے باقی ہیں، اس نے سوچا لیکن پچھلے تین دن سے پیٹ میں بچے کی حرکت بند ہو چکی تھی۔

ماں بولی "چندا بیٹا تو سمے پر چینے گا۔ ہم تو تیرے پاس ہی ہیں تجھے فکر کاہے کی؟"

. . . . جے شری او جے شری ہم تو سو سو پیڑھیوں سے کسان ہیں . . . . . ہاں بپتی دیو ہمارا زمیندار ہمیشہ ہم پر اتیاچار کرتا آیا ہے . . . . . . جے شری او جے شری ہماری حالت کبھی نہیں بدلی ہاں بپتی دیو ہمارے گاؤں میں سدا کا کال پڑ رہا ہے . . . . .

جے شری او جے شری ـــــ یہ کال پہلے سب کالوں کی چرم سما ہے ـــــ آخری حد . . . . . پر بپتی دیو . . . . اب تو جگ پلٹ رہا ہے۔ کلجگ کے گربھ سے ست جگ جنم لے رہا ہے اور ان ٹیسوں کا اٹھنا ضروری ہے۔

"ہائے میں مر گئی، میری میا" ـــــ جے شری بار بار چلا اٹھتی تھی۔ اس کا کشٹ کوئی معمولی کشٹ نہ تھا۔ لڑکی کہیں سے تھوڑا تیل مانگ لائی تھی۔ ماں برابر ایک دائی کی طرح جے شری کے پیٹ پر مالش کرتی رہی۔

سمے سے پہلے بچے نے جنم لیا۔ تھا تو بیٹا۔ لیکن مردہ، ماں نے جے شری کو سنبھالتے ہوئے کہا "بچے کو ڈھک دے بیٹی، ہائے رام ـــــ بھاگ کو کون بدل سکتا ہے!

جے شری بے ہوش پڑی تھی۔

ذرا ہوش آنے پر وہ ہلی اس نے اٹھنے کی کوشش کی جیسے وہ بچے کا منہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہی ہو۔ لیکن ایک دھچکے کے ساتھ وہ گر پڑی۔ اس کا کشٹ ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ نیا دھان اُگے یا نہ اُگے، اب اسے کیا؟

لڑکی نے مستقبل قریب کی طرف طویل نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا "جے شری نے کہا تھا نا۔ ماں کہ کلجگ ختم ہونے والا ہے اور یا یوں کی نیا ڈوبنے والی ہے۔ کیا اپنے دھچکے سے جے شری نے نیا کو ڈبونے کے لئے آخری زور تو نہیں لگا دیا؟"

خواجہ احمد عباس

ایک پائیلی چاول

ناگنوں کی طرح بل کھاتی۔ چیونٹی کی رفتار سے رینگتی۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھناتی۔ دو لمبی قطاریں ـــــ ایک مردوں کی اور ایک عورتوں کی ـــــ سرکاری اناج کی دکان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ عورتوں کی قطار مردوں کی قطار سے بھی زیادہ لمبی کوئی ایک فرلانگ لمبی اس کا آخری سرا سڑک کے نکڑ پر سے مڑتا ہوا، ایک تنگ سی گلی میں پہنچا ہوا تھا۔ دیر میں آنے والی عورتیں ایک کے پیچھے ایک کھڑی ہوتی جا رہی تھیں ان کو تو اناج کی دکان کی دور سے جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی۔ بس کچھ نظر آتا تھا تو اپنے سے اگلی عورت کا سر۔

کئی سو عورتیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، یہودی، مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھے ہوئے اور بغیر برقعے کے۔ کالے چکنے جسم والی مچھلی والیاں جن کے بالوں کے پھولوں کی خوشبو ان کے کپڑوں کی مچھلی کی بو میں مل کر ہوا میں پھیل رہی تھی۔ فراک پہنے ہوئے۔ ننگی ٹانگوں، پاؤں میں چپل غریب دیسی عیسائی گوانی عورتیں گھٹیا قسم کے پینٹ اور پاؤڈر اور سینٹ میں نہائی ہوئی نقلی سلک کی جرابیں اور اونچے ایڑی کے جوتے پہنے اینگلو انڈین لڑکیاں۔ پھولدار ریشمی شالیں، کاندھوں پر ڈالے، گوری چٹی کالے بالوں والی یہودنیں۔ سڈول جسم کی مرہٹنیں اور بہت دبلی یا بہت موٹی گجراتنیں کلرکوں کی بیویاں۔ مزدوروں کی بیویاں۔ معمولی درجے کے دکانداروں کی بیویاں، ٹیکسی ڈرائیوروں کی بیویاں، شادی شدہ بیویاں۔ غیر شادی شدہ بیویاں، موتیا کی کلیاں اور مرجھائے ہوئے پھول سینٹ اور پسینہ، مچھلی اور ناریل کے تیل کی بو، اور دوپہر کی دھوپ میں ان مختلف خوشبوؤں اور بدبوؤں کے ملے ہوئے بخارات اوپر کو اٹھتے ہوئے، مرہٹی اور گجراتی اور ہندوستانی اور انگریزی زبانوں میں گفتگو کا ایک نا قابل فہم شور، کئی لاکھ

شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ - انتظار، ساٹھ سکنڈوں کا ایک منٹ اور ساٹھ منٹوں کا ایک گھنٹہ - ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے، اور ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی چیونٹیوں کی رفتار سے رینگتی عورتوں کی یہ لمبی قطار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی رہی - جتنی دیر میں اگلے سرے پر ایک عورت اناج لے کر رخصت ہوتی تھی - دو نئی عورتیں پیچھے آ کر شامل ہو جاتی تھیں - دو سو عورتیں، ڈھائی سو عورتیں - تین سو عورتیں - ساڑھے تین سو عورتیں کھڑی ہو جاتیں صبر اور خلوص اور عقیدت کا ایک عجیب نظارہ - جیسے پجارنیں مندر کے دروازے کھلنے کا انتظار کر رہی ہوں - ایک نیا شوالہ جہاں ہندو اور مسلمان پارسنیں اور یہودنیں سب پوجا کے لئے آئی تھیں - ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تھیلا - ہر ایک کے دماغ میں بس ایک خیال - ایک آرزو، ایک ہوس ایک پائیلی چاول -

درگا آئی اور عورتوں کی قطار کے آخری سرے پر سب سے پیچھے کھڑی ہو گئی اس کو آج یہاں آنے میں دیر ہو گئی تھی صبح سے اس کے سر میں، جسم میں اور پیٹ میں بڑا شدید درد ہو رہا تھا - اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ آج یہاں گھنٹوں کے لئے آ کر کھڑی ہوتی مگر مجبوری تھی - گھر میں چاول کے آخری چند دانے ختم ہو چکے تھے - دو وقت بازار کا کھانا کھایا - آج کئی دن کے بعد دکان کھلی تھی - اگر اس نے چاول نہ خریدے تو معلوم نہیں پھر کب تک گھر کا کھانا نصیب ہو اور اس عرصے میں اگر کہیں دن پورے ہو گئے اور وہ وقت آ گیا جس کا انتظار تھا تو پھر تو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔

درگا کا شوہر ایک کارخانے میں کام کرتا تھا - صبح کو گھر سے نکلتا تو کبھی چراغ جلے واپس آتا - وہ بھی دن بھر مشین کی طرح کام کرنے کا تھکا ماندہ، بازار کا سب سودا سلف درگا ہی کو لانا پڑتا تھا - وہ مزدور پیشہ عورت ٹھہری، اس کو کام کرنے میں نہ عار تھا اور نہ کوئی دقت وہ جب تک اپنے ماں باپ کے پاس گاؤں میں رہتی تھی - کھیتی کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی - چرخہ کاتتی، چکی چلاتی اپنے باپ بھائی کے لئے روٹی پکا کر کھیت پر لے جاتی - گائے بیلوں کے لئے گھاس کاٹتی - دودھ دوہتی، رات کو سونے سے پیشتر ان کو بلا کر باندھتی - . . . . بیاہ کے بعد جب سے شہر آئی تھی - اپنے نندو کی طرح وہ بھی کارخانے میں کام کرتی تھی - دس گھنٹے روزانہ وہاں کام کرتی، پھر گھر آ کر چولہا پھونکتی مگر اس کو کبھی خیال نہ گزرا تھا کہ بہت محنت کرتی ہے - اپنے نندو کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتی - اس کا نندو کتنا اچھا تھا - اس نے بمبئی لا کر درگا کو کتنی سیریں کرائی تھیں، چڑیا گھر، چوپاٹی، اپالو بندر، کئی دفعہ سینما لے گیا - ایسی چیزیں درگا نے اپنے گاؤں میں کاہے کو دیکھی تھیں - نندو اس کا بہت خیال رکھتا تھا - اور مزدوروں کی طرح نہ وہ شراب پی کر آتا تھا نہ اپنی بیوی کو پیٹتا تھا - ابھی چھٹا مہینہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اس نے درگا کا کارخانے جانا بند کر دیا "اب تجھے گھر میں آرام کرنا چاہئے اب تو میرے لونڈے کی ماں بننے والی ہے نا؟" نندو نے ہنس کر کہا تھا - "دیکھ، لونڈا لوں گا مجھے لونڈیا نہیں چاہئے"۔

ناگن کی طرح بل کھاتی چیونٹی کی رفتار سے رینگتی، عورتوں کی لمبی قطار اناج کی دکان کی طرف بڑھتی جا رہی تھی - اب درگا کے پیچھے بھی آٹھ دس عورتیں قطار میں آ لگی تھیں - کہیں کہیں آپس میں بحث مباحثے ہو رہے تھے - ایک پارسن بازار کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر بسوط تبصرہ کر رہی تھی ایک خوجن اناج کی کمی کا الزام کانگرس کے سر رکھ رہی تھی - ایک عیسائی عورت کا خیال تھا کہ یہ سب مہاتما گاندھی کا قصور ہے - نہ سرکار سے لڑائی مول لیتے نہ سرکار ہندوستانیوں کو سزا دینے کے لئے اناج پر پابندیاں لگاتی۔

"کانگرس اور مہاتما گاندھی کو کیوں دوش دیتی ہو - معلوم نہیں ہے کہ گورنمنٹ نے لاکھوں من گیہوں ایران، عراق اور مصر بھیج دیا ہے" ایک گجراتن بولی۔

"ہاں گورنمنٹ نے اناج باہر بھی بھیج دیا ہے" ایک مرہٹن جھک کر بولی۔ "مگر ہم ہندوستانی کب بے قصور ہیں - بنیوں

اور ان ٹھینیوں نے گھروں میں کچھ کم اناج بھر رکھا ہے؟" اور کیا ہم ایک پائلی چاول کے لئے پانچ پانچ اور چھ چھ گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہتے ہیں، اور یہ بنئے ہیں کہ ہزاروں من اناج چھپا کر رکھا ہے اور چوری سے دگنی تگنی قیمتوں پر بیچ رہے ہیں؟"

"ایسے لوگوں کو پھانسی دے دینی چاہئے؟"

"وہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے، ہمارے ہاں تو ان کو رائے بہادر اور خان بہادر کے خطاب ملتے ہیں۔ جنگی کاموں کے ٹھیکے دئے جاتے ہیں، یہ ہندستان ہے"

دوسری طرف جنگ کی خبروں پر تنقید ہو رہی ہے۔

"ارے تمہیں نہیں معلوم یہ جرمن اور جاپان ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جاپان کو موقع مل گیا تو روس پر حملہ کرنے سے باز نہ رہے گا"

"اجی تو ان لوگوں کی شامت ہی آ گئی یہ برما اور فلپائن نہیں ہیں کہ ہڑپ کر گیا اور ڈکار بھی نہ لی؟ یہ روس ہے روس، یہ کسی اخبار نویس کی بیوی جس کا شوہر شاید خواب میں بھی خبروں کی سرخیاں پڑھا کرتا تھا۔

روس! دھوپ میں درگا کا سر چکرا رہا تھا۔ مگر اس نے سوچا یہ لفظ روس میں نے کہیں سنا ہے اور نہ جانے کیوں اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس "روس" اور اس کی اپنی زندگی میں کوئی بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہاں اب یاد آیا۔ نندو اسے ایک دفعہ ایک جلسہ میں لے گیا تھا۔ مزدوروں کا جلسہ تھا کوئی پچیس تیس ہزار مزدور ہوں گے۔ کئی ہزار تو عورتیں ہی تھیں۔ ہر طرف لال لال جھنڈے اور جھنڈوں پر ہتھوڑے اور درانتی کا نشان۔ بیچ میں ایک اونچا سا چبوترہ جس پر کھڑے ہو کر لوگ تقریر کر رہے تھے۔ اور درگا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ تقریر تو اتنی دور چبوترے پر ہو رہی ہے مگر آواز اس کے قریب ہی ایک کھمبے پر لگے ہوئے کالے بھونپوں سے آ رہی تھی۔ عجیب سی آواز جیسے کوئی کنوئیں میں منہ کر کے بول رہا ہو اور یہ آواز کہہ رہی تھی "بھائیو! ہٹلر کے خونی لٹیروں نے روس پر حملہ کر دیا ہے۔ روس جو مزدوروں کا اپنا ملک ہے۔ روس جہاں مزدوروں کا اپنا راج ہے ... دنیا کے مزدوروں کو چاہیے کہ وہ روس کی مدد کے لئے کھڑے ہو جائیں ...." اور پھر "سوویٹ روس زندہ باد" کے نعرے ہزاروں گلے سے اس طرح نکلے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ پڑے گا۔

کتنی دیر ہو گئی تھی اس کو کھڑے کھڑے، درگا نے مڑ کر دیکھا کوئی سولہ سترہ عورتیں اس کے پیچھے تھیں اب وہ قطار کے ساتھ بڑھتے سڑک کے نکڑ پر آ گئی تھی۔ گردن ٹیڑھی کر کے وہ اناج کی دکان کا لال لال سائن بورڈ بھی دیکھ سکتی تھی۔ مگر اب کم سے کم سو عورتیں اس کے اور ایک پائلی چاول کے درمیان حائل تھیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ دکاندار اتنی دیر لگاتا ہے۔ درگا نے ایک تھکی ہوئی ٹانگ سے دوسری تھکی ہوئی ٹانگ پر بوجھ بدلتے ہوئے سوچا، اور عورتیں بھی بولتے بولتے تھک گئی تھیں اور گرمی اور خاموشی نے پوری قطار کو اپنے پنجے میں دبوچ لیا تھا۔ نیلی وردی پہنے پولیس کا ایک سپاہی سامنے درخت کے نیچے اونگھ رہا تھا۔ اس کو اونگھتے دیکھ کر درگا کی تمام تھکن اس کی ٹانگوں کا درد، پیٹ کی چبھن سب اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اس کا جی چاہا وہیں سڑک کی پٹری پر سر رکھ کر لیٹ جائے۔ اس کے قدم ڈگمگائے تو اس نے اپنی سے اگلی عورت کا سہارا لے لیا؟ "ارے میری بہن۔ ذرا اپنے ہی سہارے کھڑی رہو" کوئی بڑھیا عورت تھی، اس کی آواز میں کوئی غصہ یا جلن نہیں تھی مگر درگا شرمندہ ہو کر گھبرا سی گئی۔ بے خیال پیچھے ہٹی تو اس دفعہ سخت ڈانٹ پڑی" . . . . . "اندھی ہے میرا پاؤں کچل دیا۔ یہ عورت جب درگا سے بچنے کے لئے بے اختیار پیچھے ہٹی تو قطار کے آخر تک گالیوں اور کوسنوں کا کئی مختلف زبانوں میں شور بلند ہوتا گیا۔

درگا شرمندگی سے پانی پانی ہو گئی۔ اس نے دانت کچکچا کر اپنے بدن کو قابو میں کیا اور زمین میں نظریں گڑا دیں۔ ایک دفعہ اس کا جی چاہا کہ ایک پائلی چاول کی امید چھوڑ کر بھاگ جائے مگر پھر سوچا کہ نندو شام کو تھکا ہارا آئے گا تو کیا کھائے گا۔ اس کا اچھا اچھا نندو جو اس کی

خاطر آج کل کئی کئی گھنٹے روزانہ اور ٹائم کام کرتا ہے اور اب تو وہ دکان کے قریب ہی آگئی تھی اگر کسی نہ کسی طرح ایک آدھ گھنٹہ اور گزر جائے تو پھر وہ چاول لے کر ہی گھر جائے گی۔ مگر یہ پیٹ میں اتنا درد کیوں ہو رہا ہے جیسے کوئی آدمی چلا رہا ہو، درگا تکلیف کے مارے پسینوں میں نہا رہی تھی، اس کا سر پھر چکرا رہا تھا۔ اور پیٹ کے اندر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کرب و اذیت کا جوار بھاٹا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دشمن بھالا لیے بار بار حملہ کر رہا ہے۔ ایک وار کا زخم نہیں بھرتا کہ دوسرا وار کرتا ہے۔ کیا دن پورے ہو گئے ہیں۔ کیا وہ دن آگیا ہے جس کا وہ اتنے دن سے انتظار کر رہی تھی؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے، ابھی تین ہی دن تو ہوئے۔ دائی نے کہا تھا کہ دس پندرہ دن اور لگیں گے، شاید یہ کوئی اور قسم کا درد ہے! درد اور تکلیف کے اس طوفان میں درگا نہ جانے کس طرح پوری قطار کے ساتھ آپ سے آپ دکان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اب صرف ایک عورت اس کے سامنے تھی۔ جب یہ عورت بھی دکان کے اندر چلی گئی تو درگا نے دیکھا کہ اس کو بھی سیڑھی پر چڑھ کر جانا ہوگا۔ ایک ایک فٹ کی دو سیڑھیاں اس کو ایسی معلوم ہوئیں جیسے اس کے گاؤں کا مندر والا ٹیلہ جس کی چوٹی پر جانے کے لئے سو سے زیادہ سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا تھا۔ ہے بھگوان وہ اس ڈگمگاتی ہوئی لکڑی کی سیڑھی پر کیسے جا سکتی ہے۔

اس سے اگلی عورت تھیلے میں ایک پائیلی چاول لئے، مسکراتی، پسینہ پونچھتی دکان سے باہر نکل آئی۔ درگا کی پیچھے والی عورت نے اسے ٹھوکا "وہ چل بابا چل، کیا سو رہی ہے"۔ بنئے نے بھی درگا کی طرف دیکھا اور کہا "آ بائی کیوں دیر لگا رکھی ہے؟" مگر اس نے یہ نہ دیکھا کہ درگا کی رنگت پیلی پڑتی جا رہی ہے۔ اس کی ٹانگیں سیڑھی پر چڑھنے کے خیال سے ہی ڈگمگا رہی تھیں۔

"مجھ سے . . . . مجھ سے . . . . . مجھے یہیں دے دو بھائی؟" اس کے ہونٹ بھی سوکھے ہوئے تھے، آواز بھی مشکل سے نکلی

"تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ لینا ہے تو اندر آ کر لو"

"چلتی کیوں نہیں آخر؟"

"نہیں لینا ہے تو راستہ چھوڑو، دوسروں کو جگہ دو"

ہر قدم پر درگا یہی سمجھتی رہی کہ وہ چکرا کر گر پڑے گی۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر دکان کے اندر پہونچا دیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھیلا بنئے کی طرف بڑھا کر اس نے دام سامنے رکھ دیئے۔ جو چار گھنٹے سے وہ اپنی مٹھی میں لئے ہوئے تھی۔ اور جو پسینے سے گیلے ہو رہے تھے۔ دکاندار نے پائیلی کا پیمانہ اٹھایا اس کو چاول سے بھر کر درگا کے تھیلے میں ڈال دیا۔ پھر درگا نے دیکھا کہ وہ موٹا بنیا آپ سے آپ گھوم رہا ہے۔ پائیلی کا برتن بھی۔ یہ چاول کا تھیلا بھی۔ پوری دکان گھوم رہی ہے اور گھومتے گھومتے یہ پوری دکان۔ اناج کی بوریاں، گھی کے پیپے دیوار پر لٹکی ہوئی ہنومان کی تصویر درگا سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ چاولوں کے ایک ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی پڑی ہے۔ اس کا سانس گھٹا جا رہا ہے مگر اس کے اوپر سے چاول آپ سے آپ ہٹتے گئے۔ ہنومان جی ان چاولوں کو پائیلی کے برتن میں بھر بھر کر سب عورتوں کو بانٹ رہے ہیں۔ "یہ لو ایک پائیلی چاول۔ یہ لو ایک پائیلی چاول"۔ اور ہنومان جی کی دم خوشی سے ناچ رہی ہے۔ مگر دم نہیں یہ تو ایک ناگن ہے اور اس کا منہ اس عورت کی طرح ہے جس نے درگا کو گالی دی تھی۔ اور دم بھر میں ناگن پھولتی گئی اور بڑھتی گئی۔ اور دکان سے لیکر بل کھاتی ہوئی نکڑ والی گلی تک جا پہونچی۔ پھنکاریں مارتی ہوئی اب وہ درگا کی طرف بڑھتی ہوئی آ رہی تھی۔ کوئی دم میں اس کو ہڑپ کر جائے گی۔ ناگن نے اوپر کا سانس لیا اور درگا کھنچتی ہوئی اس کے پیٹ میں چلی گئی۔

مگر یہ ناگن کا پیٹ نہیں تھا۔ بلکہ ایک اندھیرا کمرہ تھا۔ اندھیرا اور گرمی۔ ہوا بند، درگا کا دم گھٹنے لگا۔ اندھیرے کی تہہ میں سے

کسی کی آواز آئی " یہ ہندستان ہے ہندستان" اور پھر اندھیرے میں دور سے دو لال روشنیاں چمکنے لگیں، درگا سمجھی یہ کسی ناگن کی آنکھیں چمک رہی ہیں مگر قریب آئی تو دیکھا کہ یہ تو لال جھنڈے ہیں اور ان پر ہتھوڑے اور درانتی کا نشان۔ آپ سے آپ ہوا میں اڑتے جا رہے تھے اب چاروں طرف روشنی ہوگئی، ہزاروں، لاکھوں مزدور کچھ عجیب زبان میں گاتے چلے جا رہے تھے۔ ایک کنوئیں کے اندر سے آواز آئی " یہ روس ہے روس" روس اس کے اندر ہے اور پھر دفعتاً بادل چھا گئے اور بجلی چمکنے لگی۔ دور سے بادلوں کے گرجنے کی آواز آئی۔ نہیں یہ بادل نہیں گرج رہے تھے بلکہ توپیں چل رہی تھیں۔ بم برس رہے تھے۔ جیسے اس نے سینما میں دیکھے تھے ایک بم بالکل درگا کے قریب آکر گرا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ہوا میں اڑ گئے۔ . . . .

اور اب اس کو ایسا معلوم ہوا کہ دنگلی پڑی ہے ننگی مادر زاد ننگی۔ درگا شرم کے مارے گڑ گئی مگر وہ اٹھنے نہ پائی تھی کہ ایک ہیبتناک دیو آیا اور ایک بہت بڑے آرے سے اس کا پیٹ کاٹنے لگا۔ مگر جب اس کو قریب سے دیکھا تو درگا کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ خود اس کا شوہر نند دتھا۔ خوشی خوشی وہ اس کا پیٹ کاٹ رہا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا کہ " لونڈا لوں گا لونڈا مجھے لونڈیا نہیں چاہئے۔" اور چاروں طرف ہزاروں آدمی جمع ہوگئے اور درگا کو اس حالت میں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا" یہ ہندستان ہے ہندستان" تو اس پر وہ موٹی گجراتن بولی" گاندھی جی کو کیوں دوش دیتی ہے ان کو تو خود انگریز بھوکا مار رہے ہیں۔ . . .

سب لوگ غائب ہوگئے ہیں۔ اب درگا نے دیکھا کہ وہ موٹی ہوگئی ہے اس بنیئے سے بھی زیادہ موٹی اور اس کے توند نکل آئی ہے۔ ایک مٹکے کے برابر اور پھر کسی نے اس کے توند میں ایک سوا گھسا دیا۔ اور اس میں سے خون نکلنے لگا اور اتنا نکلا کہ اس کے تمام کپڑے اور جسم خون میں لت پت ہوگئے۔ اور اس کا پیٹ پچک کر کمر سے لگ گیا۔ کہیں دور کوئی درگا کے دماغ کے دروازے کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے اور بے ہوشی کے بادلوں میں سے دوکان گھومتی گھومتی نکل رہی تھی۔ گھومتے گھومتے . . . . . آہستہ آہستہ دوکان ٹھہر گئی۔ سامنے ہنومان جی کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔

کمزوری کی وجہ سے درگا گردن بھی نہ موڑ سکتی تھی۔ اور اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے دکان آدمیوں سے بھری ہوئی ہے آوازیں بدستور آرہی تھیں مگر کوئی کوئی لفظ سمجھ میں آتا تھا۔

" . . . . . بے چاری . . . . . شاید پہلا ہی ہے . . . . ."

" . . . . کسی مزدور کی . . . . معلوم نہیں کہاں ہوگا . . . ."

" چلو ہٹو . . . . . نجات . . . نکالو"

درگا نے اپنے پیٹ میں ایک عجیب خلا محسوس کیا۔ ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا تمام کپڑے پانی . . .

. . . نہیں خون . . . . میں لت پت ہیں اور دفعتاً اس کے دماغ میں ایک ہولناک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔

"میں نے یہاں . . . . . تمام دنیا کے سامنے بچہ جنا ہے۔ ہے بھگوان کیا یہ بے شرمی میرے ہی بھاگ میں لکھی تھی؟"

اس کا بس چلتا تو وہیں زمین میں گڑ جاتی ایسی بے عزتی سے تو موت ہی بہتر تھی۔ کمزوری کی ایک لہر آئی۔ اور درگا نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے سوچا " اب میں کس طرح یہاں سے جاؤں گی؟ کیسے کسی کو منہ دکھاؤں گی؟ ساری دنیا میری طرف اشارہ کرے گی"

کچھ منٹ درگا اسی شرمندگی کے سمندر میں غرق رہی۔ کمزوری اور بے ہوشی کا پھر غلبہ ہونے والا تھا کہ . . . . . .

" قیں۔ ایں۔ ایں . . . "

ایک بچے کے رونے کی آواز آئی - ایک بچہ، درگا کا بچہ، نندو کا بچہ اور اس ننھی آواز نے سماج کی بنائی ہوئی شرم پر نفاست کی دیواروں کو لرزا دیا - درگا کے دماغ سے کمزوری اور بے ہوشی کے بادل چھوٹ گئے - تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے گردن موڑی اور دیکھا کہ چند میلے سے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا - ایک لال لوئی سا بچہ ننھا سا منہ کھول کر رو رہا ہے ... "بھوکا ہوگا" یہ سوچ کر اس نے اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا اور اپنی چولی کے بند کھولنے لگی۔

ماں کی عظمت انسانی تجسس پر غالب آئی اور سب لوگ مسکراتے دکان سے باہر نکل آئے۔

چند منٹ کے بعد درگا دیوار کا سہارا لیتی ہوئی اٹھی اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں مگر فاتحانہ نظروں کے ساتھ باہر چلی گئی ایک ہاتھ سے وہ گود میں اپنے بچے کو تھامے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس کا تھیلا اور تھیلے میں ایک پاؤ کچی چاول۔

کرشن چندر

ان داتا

(طویل افسانے سے اقتباس)

وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے

...... میں مر چکا ہوں؟ میں زندہ ہوں؟ ... میری پھٹی پھٹی بے بھر آنکھیں آسمان کی پہنائیوں میں کسے ڈھونڈ رہی ہیں - آؤ پل بھر کے لئے اس قونصل خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤ اور میری داستان سنتے جاؤ، جب تک پولس، سیوا سمتی، یا انجمن خدام المسلمین میری لاش کو یہاں سے اٹھانے جائیں تم میری داستان سن لو، نفرت سے منہ نہ پھیرو، میں بھی تمہاری طرح گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہوں - یہ سچ ہے کہ اب میرے جسم پر گوشت کم اور پوست زیادہ نظر آتا ہے اور اس میں بھی سڑاند پیدا ہو رہی ہے اور ناک سے پانی کے بلبلے اٹھ رہے ہیں - لیکن یہ تو سائنس کا ایک معمولی سا عملیہ ہے - تمہارے جسم اور میرے جسم میں صرف اتنا فرق ہے کہ میرے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے - دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اور پیٹ ابھی تک بھوکا ہے کہ میں سوچتا ہوں، کہ اگر تم چاول کا ایک ہی دانہ میرے پیٹ میں رکھ دو تو وہ پھر سے کام کرنا شروع کر دے گا - آؤ، آگر دیکھ لو کدھر چلے؟ ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو، نہ جاؤ میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا - تم گھبرا گئے - کلکتے کے مردے بھی بھیک مانگتے ہیں - خدا کے لئے نہ جاؤ، میری داستان سن لو، ہاں ہاں اس چاول کے دانے کو اپنی مٹھی میں سنبھال کر رکھو - میں اب تم سے بھیک نہیں طلب کروں گا - کیونکہ میرا جسم اب گل چکا ہے - اسے چاول کے دانے کی ضرورت نہیں رہی - اب یہ خود ایک دن چاول کا دانہ بن جائے گا - نرم نرم گداز مٹی میں جس کے ہر مسام میں ندی کا پانی رسا ہوگا - یہ جسم گھل جائے گا اپنے اندر دھان کی پنیری کو اگتے ہوئے دیکھے گا - اور پھر یہ ایک دن پانی کی پتلی تہہ سے اوپر سر نکال کر اپنے سبز سبز خوشوں کو ہوا میں لہرائے گا، مسکرائے گا - ہنسے گا کھل کھلائے گا - کرنوں سے کھیلے گا - چاندنی میں نہائے گا - پرندوں کے چہچہوں اور خنک ہوا کے جھونکوں - شہد آگیں بوسوں، سے اس کی حیات کے بند بند میں ایک نئی رعنائی، ایک نیا حسن، اک نیا نغمہ پیدا ہوگا - چاول کا ایک دانہ ... ہر خوشے کے دھان کے خول میں چاول کا ایک دانہ ہوگا صدف کے موتی کی طرح اجلا، معصوم اور خوب صورت ... آج میں تم سے ایک راز کی بات کہتا ہوں - دنیا کا سب سے بڑا راز وہ راز جو تمہیں ایک مردہ ہی بتا سکتا ہے - اور وہ یہ ہے کہ خدا سے دعا کرو، وہ تمہیں انسان نہ بنائے - چاول کا ایک دانہ بنا دے - اس خالق باری کے سامنے گڑگڑاؤ - منت کرو، وہ

. . . . ، دعا مانگو، فاقے کرو، چلّہ کاٹو، جس طرح ہو سکے یہ کوشش کرو کہ وہ تمہیں انسان نہ بنائے چاول کا ایک دانہ بنا دے۔ گو زندگی انسان میں بھی ہے اور چاول کے دانے میں بھی۔ لیکن جو زندگی چاول کے دانے میں ہے وہ انسان کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ معصوم ہے خوبصورت ہے، پاک ہے اور انسان کے پاس بھی اس زندگی کے سوا اور ہے کیا۔ انسان کی جائداد اس کا جسم، اس کا باغ، اس کا گھر نہیں بلکہ اس کی زندگی ہے اس کا اپنا آپ، وہ ان سب چیزوں کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے، اپنے جسم کو اپنی زمین کو، اپنے گھر کو اس کے دل میں چند تصویریں ہوتی ہیں چند خیال، آگ کے چند انگارے، ایک مسکراہٹ، وہ انھیں پر جیتا ہے۔ اور جب مر جاتا ہے تو انھیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

چاول کے دانے کی زندگی تم دیکھ چکے۔ اب آؤ میں تمہیں اپنی زندگی دکھاؤں، نفرت سے منہ نہ پھیرو، کیا ہوا اگر میرا جسم مردہ ہے میری روح تو زندہ ہے، میری روح تو بیدار ہے اور بیشتر اس کے کہ وہ بھی سو جائے وہ تمہیں ان چند دنوں کی کہانی سنانا چاہتی ہے۔ جب روح اور جسم ایک ساتھ چلتے پھرتے ناچتے گاتے، ہنستے، بولتے تھے، روح اور جسم دو میں مزا ہے، دو میں حرکت ہے، دو زندگی ہے دو تخلیق ہے جب دھرتی اور پانی ملتے ہیں تو چاول کا دانہ پیدا ہوتا ہے، جب عورت اور مرد ملتے ہیں تو ایک خوبصورت ہنستا ہوا بچہ ظہور میں آتا ہے۔ جب روح اور جسم ملتے ہیں تو زندگی پیدا ہوتی ہے آؤ میں تمہیں اپنے درد کی داستان سناؤں۔ وہ دو جو اب الگ الگ ہو چکے، روح اور جسم دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ جب جسم ایک ہو جاتا ہے تو اس میں سڑاند پیدا ہوتی ہے اور جب روح الگ ہوتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے۔ اگر غور سے دیکھو گے تو تمہیں اس دھوئیں میں میرے ماضی کی تصاویر لرزتی، دکھتی، گم ہوتی ہوئی نظر آئیں گی . . . . . یہ تجلی کیا تھی۔ یہ میری بیوی کی مسکراہٹ تھی . . . یہ میری بیوی ہے . . . . . شرماؤ نہیں سامنے آ جاؤ اے جانِ تمنا ؟ . . . . اسے دیکھا آپ نے ؟ یہ سانولی سلونی مورت یہ گھنے بال کمر تک لہراتے ہوئے، یہ شرمیلا تبسم، یہ جھکی جھکی حیران آنکھیں، یہ آج سے تین سال پہلے کی لڑکی ہے، جب میں نے اسے اتاپارا کے ساحلی گاؤں میں سمندر کے کنارے دوپہر کی سوئی ہوئی فضا میں دیکھا تھا . . . . میں ان دنوں اجات قصبے میں زمیندار کی لڑکی کو ستار سکھاتا تھا اور یہاں اتاپارا میں دو دن کی چھٹی لے کر اپنی بڑی موسی سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ یہ خاموش سا گاؤں، سمندر کے کنارے، بانسوں کے جھنڈ اور ناریل کے درختوں سے گھرا ہوا اپنی اداسی میں گم تھا۔ نہ جانے ہمارے بنگالی گاؤں میں اتنی اداسی کہاں سے آ جاتی ہے۔ دھرتی خاموش ہے۔ سامنے سمندر، اتھاہ سمندر پھیلا ہوا ہے۔ دھان کی ہنڈی ہے۔ بانس کے جھیروں کے اندر اندھیرا ہے . . . . بانس کی ہانڈیوں میں چاول دبے ہوئے ہیں۔ مچھلی کی بو ہے، تالاب کا پانی کائی سے سبز ہے۔ دھان کے کھیتوں میں پانی ٹھہرا ہوا ہے۔ ناریل کا درخت اک نکیلی برچھی کی طرح آسمان کے سینے میں گہرا گھاؤ ڈالے کھڑا ہے، ہر جگہ، ہر وقت، درد کا احساس ہے، ٹھہراؤ کا احساس ہے، حزن کا احساس ہے، سکون، جمود، موت کا احساس ہے۔ یہ اداسی جو تم ہماری محبت، ہمارے سماج، ہمارے ادب اور نغمے میں دیکھتے ہو، یہ اداسی ہمارے گاؤں سے شروع ہوتی ہے اور پھر ساری دھرتی پر پھیل جاتی ہے۔

جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تو یہ مجھے ایک جل پری کی طرح حسین نظر آئی۔ یہ اس وقت پانی میں تیر رہی تھی اور ساحل کی ریت پر ٹہل رہا تھا۔ اور ایک نئی دھن میں سوچ رہا تھا۔ یکایک میرے کانوں میں ایک شیریں نسوانی آواز آئی "پرے ہٹ جاؤ میں کنارے پہ آنا چاہتی ہوں"، میں نے دیکھا آواز سمندر میں سے آ رہی تھی۔ لانبے ریشمی، کھلے بال، اور جل پری کا چہرہ ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا، اور دور پرے افق پر ایک کشتی جس کا مٹیالا بادبان دھوپ میں سونے کے پترے کی طرح چمکتا نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "کیا تم سات سمندر پار سے آئی ہو؟"

وہ ہنس کر بولی . . . . [illegible] . . . . مچھلیاں پکڑ رہا ہے میں اس کے

لیے کھانا لائی ہوں ... ... ذرا دیکھ کر چلو، تمہارے قریب ناریل کے تنے کے پاس کھانا رکھا ہے اور وہاں میری ساڑھی بھی ہے۔"
یہ کہہ کر اس نے پانی میں ایک ڈبکی لگائی اور پھر لہروں میں پھوٹتے ہوئے بلبلوں کی افشاں سی بناتی ہوئی کنارے کے قریب آگئی، بولی
"پرے ہٹ جاؤ اور وہ دھوتی مجھے دے دو۔"
میں نے کہا "ایک شرط پر"
"کیا ہے؟"
"میں بھی مچھلی بھات کھاؤں گا بہت بھوک لگی ہے۔"
وہ ہنسی اور سن سے ایک تیر کی طرح پانی کے سینے کو چیرتی ہوئی دور چلی گئی، جہاں اس کے چاروں طرف سورج کی کرنوں نے پانی میں طلائی جال بن رکھا تھا۔ اور اس کا نازک چھریرا ایک اندام جسم اک ننھی کشتی کی طرح ان پانیوں میں گھومتا نظر آیا۔ پھر وہ گھومی اور سیدھی کنارے کو ہولی لیکن اب ہولے ہولے آرہی تھی۔ آہستہ آہستہ، ڈگمگ ڈگمگ ... ...
میں نے پوچھا "کیا ہوا ہے تمہیں؟"
بولی۔ "آج کل بھات بہت مہنگا ہے، روپے کا دو سیر ہے۔ میں تمہیں بھات نہیں کھلا سکتی۔"
"پھر میں کیا کروں، مجھے تو بھوک ... ...
سمندر کا پانی پیو ——" اس نے شوخی سے کہا اور پھر ڈبکی لگائی۔

جب وہ میری بن کر میرے گھر آئی تو بھات روپے کا دو سیر تھا۔ اور میری تنخواہ پچاس روپے ماہانہ تھی۔ بیاہ سے پہلے مجھے خود صبح اٹھ کر بھات پکانا پڑتا تھا۔ کیونکہ زمیندار کی بیٹی اسکول جاتی تھی۔ اور مجھے علی الصبح اسے ستار سکھانے کے لئے جانا پڑتا۔ شام کو بھی اسے دو گھنٹے ملک ریاض کرانا تھا۔ دن میں بھی زمیندار بلا لیتا تھا "ستار سنا دو جی، جی بہت اداس ہے۔"
پھر یہ ننھی سی بچی ہمارے ہاں آگئی ... ... ادھر آؤ بیٹا ... ... ہاں مسکرادو، ہنس پڑو، ان سے کہہ دو، میں بالکل معصوم ہوں، انجان ہوں، میری عمر دو سال کی بھی نہیں اور مجھے جھنجھنا بجانے اور گڑیا کھیلنے اور ماں کی چھاتی سے لگ کر دودھ پینے اور دودھ پیتے اس کے سینے سے اپنے ننھے منے ہاتھ چمٹائے اس کے گداز آغوش میں سو جانے کا بہت شوق ہے۔ میں اتنی پاکیزہ ہوں کہ بول بھی نہیں سکتی۔ بات بھی نہیں کرتی۔ صرف مڑ مڑ تکتی ہوں، اس آسمان کی طرف جس کے مالک نے مجھے اس زمین پر بھیجا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے دل میں انسانی مسرت کی کرن بن کر رہوں اور بانس کی میلی میلی چھپریا میں خوشی کا گیت بن کر گھر کے آنگن کو اپنی ہنسی کے نور سے بھر دوں ... ... مسکرادو بیٹا!
... ... ہاں تو جب یہ ننھی سی بچی پیدا ہوئی۔ اس وقت بھات روپے کا ایک سیر تھا۔ لیکن ہم لوگ اس پر بھی خدا کا شکر بجا لاتے تھے جس نے چاول کے دانے بنائے اور زمیندار کے پاؤں چومتے تھے جس نے ہمیں چاول کے دانے کھلائے اور سچ بات تو یہ ہے کہ بنانے اور کھانے کے بیچ میں جو چیز حائل ہے وہ بجائے خود ایک پوری تاریخ ہے۔ انسانی زندگی کے ہزاروں سال کی داستان ہے اس کی تہذیب و تمدن، مذہب، ادہام فلسفہ اور ادب کی تفسیر ہے۔ بنانا اور کھانا بہت سہل الفاظ ہیں۔ لیکن ذرا اس گہری خلیج کو بھی دیکھئے جو ان دو لفظوں کے درمیان حائل ہے۔
بھات روپے کا ایک سیر تھا۔
پھر بھات روپے کا تین پاؤ ہوا

پھر بھات روپے کا آدھ سیر ہوا۔

پھر بھات روپے کا ایک پاؤ ہوا۔

اور پھر بھات ——— معدوم ہوگیا۔

پھر درختوں پر سے آم جامن کٹھل، شریفے کیلے ختم ہو گئے، تاڑی ختم، ساگ سبزی ختم، مچھلی ختم، ناریل ختم، کہتے ہیں زمیندار کے پاس منوں اناج تھا۔ اور بنئے کے پاس بھی۔ لیکن کہاں تھا۔ کس جگہ تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اناج حاصل کرنے کی سب تدبیریں رائگاں گئیں۔ گڑگڑانا منتیں کرنا، خدا سے دعا مانگنا، خدا کو دھمکی دینا۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔ صرف اللہ کا نام باقی تھا۔ یا زمیندار اور بنئے کا گھر۔

اناج کی گرانی دیکھ کر زمیندار نے میرا ستار سیکھنا بند کر دیا۔ جب لوگ بھوک کے مر رہے ہوں۔ اس وقت نغمے کی کسے سوجھتی ہے پچاس روپے دے کر ستار کون سیکھتا ہے!

بھوک، نا امیدی، اور بلکتی ہوئی بچی!

میں نے اپنی بیوی سے کہا "ہم کلکتے چلیں گے۔ وہاں لاکھوں لوگ بستے ہیں۔ شاید وہاں کوئی کام چل جائے۔"

"چلو کلکتے چلو!"

"چلو کلکتے چلو!" جیسے یہ صدا سارے گاؤں والوں نے سن لی۔ گاؤں کی سماجی زندگی اک بند کی طرح مضبوط ہوتی ہے یکایک "چلو کلکتے چلو" کی صدا نے اس بند کا ایک کنارہ توڑ دیا اور سارا گاؤں اس سوراخ کے راستے سے بہہ نکلا... چلو کلکتے چلو...

... ہر لب پر یہی صدا تھی... چلو کلکتے چلو...

سیکڑوں ہزاروں، آدمی اس سڑک پر چل رہے تھے، یہ سڑک جو کلکتے کے مضافات میں سے بنگال کے دور دور پھیلے ہوئے گاؤں میں سے گھومتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ سڑک جو ان انسانوں کے لئے شاہ رگ کی طرح تھی... چلو کلکتے چلو... چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ خاک وخون میں اٹی ہوئی۔ لنگڑاتی ہوئی۔ اور کلکتے کی لاش کی طرف جا رہی تھیں، ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اور اس قافلے کے اوپر گدھ گھوم رہے تھے اور ساری فضا میں مردہ گوشت کی بو تھی۔ چیخیں تھیں فضا میں آہ و بکا اور آنسوؤں کی سیلن اور لاشیں جو سڑک پر طاعون زدہ چوہوں کی طرح بکھری پڑی تھیں لاشیں جنہیں گدھوں نے کھا لیا تھا۔ اور اب ان کی ہڈیاں دھوپ میں چمکتی نظر آتی تھیں، لاشیں جنہیں گیدڑوں نے کھا لیا تھا۔ لاشیں جنہیں کتے ابھی تک کھا رہے تھے۔ لیکن چیونٹیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ چیونٹیاں بنگال کے ہر حصے سے بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ اور ان کے ذہن میں کلکتے کی لاش تھی۔ کوئی کسی کا پرسان حال کیسے ہوتا۔ ان لاکھوں آدمیوں میں سے ہر شخص اپنے لئے لڑ رہا تھا۔ جی رہا تھا۔ مر رہا تھا۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے شاید ایسا ہی ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ ان ہزاروں لاکھوں چیونٹیوں کی موت، پیٹ میں بھوک کا دوزخ اور آنکھوں میں یاسیت کی مہیب تاریکی لئے یہ انسانی چیونٹیاں اپنے بوجھل قدموں سے سڑک پر چل رہی تھیں۔ کاش ان انسانوں میں چیونٹیوں کا سا ہی نظم و نسق ہوتا تو بھی یہ صورت حال نہ ہوتی۔ چیونٹیاں اور چوہے بھی اس بری طرح نہیں مرتے......!

راستے میں کہیں کہیں خیرات بھی مل جاتی تھی۔ ہندو ہندوؤں کو اور مسلمان مسلمانوں کو خیرات دیتے تھے۔ لیکن خیرات سے کب کسی کا پیٹ بھرتا ہے۔ خیرات تو زندگی عطا نہیں کرتی۔ خیرات ہمیشہ دھوکا دیتی ہے، خیرات کرنے والے کو بھی اور خیرات لینے والے کو بھی۔ ہمیں بھی خیرات ملی اور ایک دن ایک سالم ناریل ہاتھ لگ گیا۔ بچی کب سے دودھ کے لئے چلا رہی تھی۔ اور ماں کی چھاتیاں اس دھرتی کی طرح تھیں۔ جس پر مدت سے پانی کی ایک بوند نہ

برسی ہو۔ اس کا پھول کا سا جسم جھلس گیا تھا۔ وہ بار بار بچی کو بچکارنے کے لئے اس کے ہاتھ میں جھنجھنا دے دیتی۔ بچی کو یہ جھنجھنا بہت پسند تھا۔ وہ اسے ہر وقت کلیجے سے لگائے رکھتی، اس وقت بھی وہ اس جھنجھنے کو زور سے اپنی مٹھی میں دبائے اپنی ماں کے شانے سے لگی بلک رہی تھی۔ اور رو دئے جاتی تھی، جیسے کوئی بے بس زخمی جانور برابر چیخے جاتا ہے اور جب تک اسے موت نہیں آتی۔ برابر اسی انداز میں اسی لے میں بین کئے جاتا ہے . . . لیکن اچھا ہوا عین اسی روز ہمیں ایک سالم ناریل مل گیا۔ ناریل کا دودھ ہم نے بچی کو پلایا اور ناریل ہم دونوں نے کھایا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سارا جہان جی اٹھا ہے۔

. . . .

اب کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ ساری تجارت ختم ہو چکی تھی۔ صرف گوشت و پوست کی تجارت ہو رہی تھی۔ اس کے تاجر شمالی ہند سے آتے تھے ان میں یتیم خانوں کے منیجر تھے۔ جنھیں یتیموں کی تلاش تھی۔ ماں باپ اپنے ننھے منے بچے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ان کے حوالے کر کے انھیں یتیم بنا رہے تھے دراصل غربت ہی تو یتیم پیدا کرتی ہے۔ ماں باپ کا زندہ رہنا یا مر جانا ایک خدائی امر ہے۔ ان تاجروں میں وہ دھوا آشرموں کے کارکن بھی تھے، اور خالص تاجر جو ہر قسم کی اخلاقی، مذہبی، تمدنی، ریاکاری سے الگ ہو کر خالص تجارت کرتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بکریوں کی طرح ٹٹولی جاتی تھیں۔

مال اچھا ہے

رنگ کالا ہے

ذرا دبلی ہے

منہ پر چیچک ہے

ارے اس کی تو بالکل ہڈیاں نکل آئی ہیں

چلو خیر ٹھیک ہے

دس روپے دے دو

خاوند بیویوں کو، ماں لڑکیوں کو، بھائی بہنوں کو فروخت کر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اگر کھاتے پیتے ہوتے تو ان تاجروں کو جان سے مار دینے پر تیار ہو جاتے۔ لیکن اب یہی لوگ نہ صرف انھیں بیچ رہے تھے بلکہ بیچتے وقت خوشامد بھی کرتے تھے۔ دکانداروں کی طرح اپنے مال کی تعریف کرتے، گڑگڑاتے، جھگڑا کرتے، ایک ایک پیسہ کے لئے مر رہے تھے، مذہب، اخلاقیات، روحانیات، مامتا، زندگی کے قوی سے قوی ترین جذبوں کے چھلکے اتر گئے تھے۔ اور ننگی بھوکی، پیاسی، خونخوار زندگی منہ پھاڑے سامنے کھڑی تھی۔

میری بیوی نے کہا "ہم بھی اپنی بچی بیچ دیں"

ڈرتے، ڈرتے، شرمندہ، محجوب سی ہو کر اس نے یہ الفاظ کہے اور پھر فوراً ہی چپ ہو گئی۔ اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا جیسے وہ اپنے الفاظ کے تازیانوں کا اثر دیکھ رہی ہو، اس کی نگاہوں میں ایک ایسا احساس جرم تھا۔ جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بچی کا گلا گھونٹ ڈالا ہو، جیسے اس نے اپنے خاوند کو ننگا کر کے اس کے بدن پر کوڑے لگائے ہوں، جیسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے پھانسی کا پھندا تیار کیا ہو اور اب اس کی دبلی پتلی گردن اس میں لٹک رہی ہو۔

مجھے یہ گلہ نہیں کہ وہ کیوں مر گئی۔ مرنے کو تو وہ اسی وقت مر گئی تھی۔ جس وقت اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ شاید ان الفاظ کے زبان تک آنے سے بہت عرصہ پہلے ہی وہ مر چکی تھی۔ لیکن اب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کیسے؟ یہ کیونکر ہوا۔ کس بھیانک قوت نے اس کی مامتا کو مار دیا تھا۔ اس کی روح کو کچل دیا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا۔ مجھے اس کے مر جانے کا مطلق افسوس نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس کی مامتا

کیوں مرگئی ۔ وہ ممتا جسے ہم سب لازوال کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔ میں نے اس وقت اپنی بچی کو چھین کر اپنے سینے سے لپٹا لیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ۔ لیکن وہ اسی طرح لاتعلقی کے انداز میں ۔ میرے غم و غصے کو نظر انداز کرتی ہوئی لنگڑاتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی ، کولہو کے اندھے بیل کی طرح اس کے پریشان بال دھول میں اٹے ہوئے تھے ۔ جسم پر دھوتی تار تار ہو چکی تھی ، دائیں پاؤں کے زخم سے خون رستا تھا ، اور وہ آنکھیں ۔ ۔ ۔ ہائے وہ جل پری کہاں غائب ہو گئی تھی ، وہ سمندر میں طلائی مچھلی کی طرح تیرنے والی سبک اندام بنگالی دوشیزہ ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھول کا سا حسن ، جس میں تاج کا مرمر ، ایلورا کے مندروں کی رعنائی ، اور اشوک کے کتبوں کی ابدیت گھلی ہوئی تھی ، آج کدھر غائب ہو گیا تھا ۔ ؟ کس لئے یہ حسن ، یہ ممتا ۔ یہ روح ، اس سڑک پر ایک روندی ہوئی لاش کی طرح پڑی تھی ۔ اگر یہ سچ ہے کہ عورت ایک اعتقاد ہے ایک معجزہ ہے ۔ زندگی کی سچائی ہے ۔ اس کی منزل ، اس کا مستقبل ، تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اعتقاد ، یہ سچائی ، یہ معجزہ ، چاول کے ایک دانے سے اگتا ہے اور اس کے نہ ہونے سے مر جاتا ہے ۔

جل پری نے میری گود میں دم توڑ دیا ۔ وہ تھکی ، ماندی ، خاک میں اٹی ہوئی ۔ اسی سڑک کے کنارے سو گئی ۔ مری آغوش میں دو تین ہچکیاں اور سانس غائب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے میرے احساسات کیوں مجھے اس لمحے کی طرف گھسیٹ لے گئے ۔ جب میں نے پہلی بار اس کے ہونٹوں کو چوما تھا ۔ اور اس کی ہلکی ہوئی سانس نے مجھے سگندھ راج کے پھولوں کی یاد دلائی تھی ۔ اس وقت بھی وہی سگندھ راج کے پھولوں کی مہک تیزی سے میرے نتھنوں میں گھستی چلی آئی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اور میں اس کے مردہ لبوں کی طرف تکنے لگا ۔ اور میرے آنسو اس کے لبوں پر ، اس کی آنکھوں پر اس کے رخساروں پر گرنے لگے ۔ وہ میری گود میں مری پڑی تھی ۔ جل پری جو انیس سال کی عمر میں مر گئی ۔ خاک میں اٹی ہوئی ننگی بھوکی ۔ پیاسی جل پری چڑیل بن کر مر گئی ۔ مجھے موت سے کوئی شکوہ نہیں ، اپنے خدا سے کوئی شکایت نہیں ، زندگی سے ، سڑک سے گذرتے ہوئے اندھے قافلے سے ، کسی سے کوئی شکایت نہ تھی ۔ صرف یہی جی چاہتا تھا کہ وہ اس طرح نہ مر جاتی ۔ میں ایک بندے کی طرح نہیں ایک دوست کی طرح اپنے خداؤں سے پوچھنا چاہتا ہوں ، اس میں کیا برائی تھی ، اگر وہ زندہ رہتی ۔ ایک طبعی عمر بسر کرتی ، اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا ، اس کے بال بچے ہوتے ، وہ ان کی پرورش کرتی ۔ اسے اپنے خاوند کی محبت میسر ہوتی ، ایک عام اوسط زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں دنیا ۔ ۔ ۔ کروڑوں ایسے معمولی اور چھوٹے آدمیوں سے بھری پڑی ہے جو زندگی سے ان چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے ۔ نہ سلطنت ، نہ شہرت ، نہ فرشتہ پن ، پھر بھی اسے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل نہ ہوئیں ۔ وہ کیوں اس طرح مر گئی ۔ اور اسے مرنا تھا تو وہ ساحل سمندر اور ناریل کے جھنڈ کو دیکھ کر ہی مرتی ، یہ کیسی موت ہے کہ ہر طرف ویرانی ہے اور لاشیں ہیں اور خلا ہے اور آہ و بکا ہے ، سڑک کی خاک ہے اور چپ چاپ چلتے ہوئے قدموں کی چاپ ہے اور دور کہیں گدھ رو رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ !

میں نے اسے دفن نہیں کیا ، میں نے اسے جلایا بھی نہیں ۔ میں نے اسے وہیں سڑک کے کنارے چھوڑ دیا ۔ اور اپنی بچی کو چھاتی سے چمٹائے آگے بڑھ گیا ۔

ابھی کلکتہ دور تھا اور میری بچی بھوکی تھی ۔ وہ اب رو بھی نہ سکتی تھی ۔ اس کے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی ۔ وہ بار بار اپنا منہ ایسے کھولتی جیسے مچھلی جل سے باہر نکل کر پانی کے گھونٹ کے لئے اپنے ہونٹ وا کرتی ۔ ہائے یہ ننھی سی جل پری اپنے چھوٹے سے کھلونے کو اپنے سینے سے چمٹائے ایک کھلتی ہوئی شمع کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہی تھی ۔ بجھ رہی تھی اور میں چلا جا رہا تھا ۔ میرے ارد گرد ، آمنے سامنے ، آگے پیچھے اور لوگ بھی تھے رواں دواں ، مردوں کا قافلہ ہر ایک کی اپنی دنیا تھی ۔ لیکن ہر فرد اسی موت کی وادی میں سے گذر رہا تھا ۔ اور آنکھوں میں ، چہروں پر ، جسموں پر اسی مہیب طاقت کا سایہ منڈلا رہا تھا جو اس وادی کی خالق تھی ۔ میں ہاتھ جوڑ کر دعا مانگنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے خالق ارض و سما ، اس معصوم بچی کی طرف دیکھ ۔ ۔ ۔

. . . کیا تیرے دربار میں اس کے لئے دودھ کی ایک بوند بھی نہیں، ان داتا! . . . . دیکھ یہ کس طرح بار بار منہ کھولتی ہے، بے قرار ہوتی ہے اور تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ اے خداوند لایزال۔ تو نے خوبصورت موت بنائی ہے۔ لیکن یہ موت تو خوبصورت نہیں، یہ موت تو معصوم نہیں۔ یہ موت تو اس ننھی سی جان کے لائق نہیں . . . . سن لے اے کائنات کی پر اسرار مخفی قوت عظیم . . . . اے خداؤں کے ظالم صدر اعظم . . . . تو اس خوبصورت کلی کو ابھی سے کیوں کچل کر رکھ دینا چاہتا ہے، اس کی تمناؤں کی دنیاؤں کو دیکھ . . . . سمندر میں بلبلوں کی رقص، سبک خرام کشتی ایک نغمہ اپنے معراج کو پہونچا ہوا ناریل کے جھنڈ میں عورت اور مرد کا پہلا بوسہ . . . . کمینے، سفلے۔ رذیل!

لیکن نہ دعائیں کام آئیں نہ گالیاں اور میری بچی بھی مرگئی۔ کس طرح تڑپ تڑپ کر اس نے جان دی۔ اس کا کرب و اندوہ میری ان پتھریلی۔ ساکن و جامد، بے نور، بے بصر آنکھوں سے پوچھو۔ وہ دودھ کی ایک بوند کے لئے مرگئی۔ وہ بوند جو نہ آسمان سے برسی، نہ زمین نے اگلی۔ بے حس آسمان، بے حس زمین، اور یہ ظالم سڑک! . . . .

مرنے سے کچھ عرصہ پہلے میری بچی نے اپنا پیارا جھنجھنا مجھے دے دیا۔ دیکھو اب بھی میری مٹھی میں دبا پڑا ہے۔ یہ امانت اس نے میرے حوالے کی تھی . . . . نہیں نہیں یہ جھنجھنا اس نے مجھے بخش دیا تھا۔ لاپرواہی کے ساتھ اک ایسے معصومانہ انداز میں اس نے اسے میرے حوالے کر دیا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے مجھے بخش دیا۔ مجھے معاف کر دیا ہے۔ مجھے اپنے لطف و عنایت سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس نے وہ جھنجھنا میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور پھر میری گود میں مرگئی۔ یہ ایک لکڑی کا جھنجھنا ہے۔ لیکن میرا اعتقاد ہے کہ وہ اگر کلوپیٹرا ہوتی۔ تو اپنی محبت مجھے بخش دیتی، اگر وکٹوریہ ہوتی تو اپنی سلطنت میرے سپرد کر دیتی۔ اگر ممتاز محل ہوتی تو تاج محل میرے حوالے کر دیتی۔ لیکن وہ تو ایک غریب ننھی سی لڑکی تھی۔ اور اس کے پاس صرف یہی ایک لکڑی کا جھنجھنا تھا۔ جو اس نے اپنے غریب نادار ابا کے حوالے کر دیا۔ تم میں سے کون ایسا جوہری ہے جو اس لکڑی کے جھنجھنے کی قیمت کا اندازہ کر سکے۔ بڑے آدمیوں کی قربانیوں پر واہ واہ کرنے والو، لے جاؤ، اس لکڑی کے جھنجھنے کو اور انسانیت کے اس معبد میں رکھ دو، جو آج سے ہزاروں سال بعد میری روح تمہارے لئے تعمیر کرے گی۔

آخر کلکتہ آگیا۔ بھوکی ویران بستی، سنگدل، بے رحم شہر، کہیں کوئی ٹھکانا نہیں، کوئی روٹی کا لقمہ تک نہیں۔ سیالدہ، اسٹیشن بیام بازار، ہریسن روڈ، ذکریا اسٹریٹ۔ بو بازار، سوناگاچی، نیو مارکٹ، بھوانی پور، کہیں چاول کا ایک دانہ نہیں۔ جو انسان کو انسان سمجھتی ہے۔

ہوٹلوں کے باہر بھوک کے مرے پڑے ہیں۔ جھوٹی پتلوں میں کتے اور انسان ایک جگہ کھانا ٹٹول رہے ہیں۔ کتے اور آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک موٹر فراٹے سے گذر جاتی ہے۔

ننگے بدن میں پسلیاں آہنی زنجیریں معلوم ہوتی ہیں، ان کے اندر روح کو کیوں قید کر رکھا ہے، اسے اڑ جانے دو اس زندان خانے کا دروازہ کھول دو . . . . ایک موٹر فراٹے سے گذر جاتی ہے۔

لیکن جسم روح کی فریاد نہیں سنتا . . . . مائیں مر رہی ہیں، بچے بھیک مانگ رہے ہیں۔ بیوی مر رہی ہے خاوند رکشا والے صاحب کی خوشامد کرتا ہے۔ یہ نوجوان عورت مادر زاد ننگی ہے، اسے یہ پتہ نہیں، وہ جوان ہے، وہ عورت ہے، وہ صرف یہ جانتی ہے کہ وہ بھوکی ہے اور یہ کلکتہ ہے . . . . بھوک نے حسن کو بھی ختم کر دیا ہے۔

میں اس قونصل خانے کی سیڑھیوں پر مر رہا ہوں۔ بیہوش سا پڑا ہوں۔ چند لوگ آتے ہیں، میرے سرہانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھ رہے ہیں۔ پھر میرے کانوں میں ایک مدھم سی آواز آتی ہے جیسے کوئی کہہ

رہا ہے۔

"عوامی ہند وہوگا جانے دو، آگے بڑھو۔"

وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اندھیرا بڑھ جاتا ہے . . . . .

پھر چند لوگ رکتے ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہے . . . . "تم کون ہو؟"

میں بمشکل اپنے بھاری پپوٹے اٹھا کر آنکھیں کھول کر جواب دیتا ہوں، "میں ایک آدمی ہوں، بھوکا ہوں۔"

وہ یہ کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ "سالا کوئی مسلمان معلوم ہوتا ہے"

بھوک نے مذہب کو بھی ختم کر دیا ہے۔

اب چاروں طرف اندھیرا ہے، مکمل تاریکی، روشنی کی ایک کرن نہیں۔

خاموشی، گہرا سناٹا۔

یکایک کلیساؤں میں، مندروں میں عبادت خانوں میں خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ ساری کائنات شیریں آوازوں سے معمور ہو جاتی ہے۔

ایک اخبار فروش چلا چلا کر کہہ رہا ہے "طہران میں نبی نوع انسان کے تین بڑے رہناؤں کا اعلان، ایک نئی دنیا کی تعمیر . . ."

ایک نئی دنیا کی تعمیر!

میری آنکھیں حیرت اور مسرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ احساسات پتھر کی طرح جامد ہو جاتے ہیں۔

میری آنکھیں اس وقت کھلی کی کھلی ہیں۔

میں سیاست داں نہیں ہوں، ستار بجانے والا ہوں، حاکم نہیں ہوں، حکم بجالانے والا ہوں، لیکن شاید ایک نادار مغنی کو بھی یہ پوچھنے کا حق ہے کہ اس نئی دنیا کی تعمیر میں کیا ان کروڑوں، بھوکے ننگے آدمیوں کا بھی ہاتھ ہوگا۔ جو اس دنیا میں بستے ہیں۔ میں یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ میں بھی ان تین بڑے رہناؤں کی نئی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی فسطائیت، جنگ اور ظلم سے نفرت ہے . . . . اور گو میں سیاستداں نہیں ہوں۔ لیکن مغنی ہو کر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اداس نغمے سے اداسی ہی پیدا ہوتی ہے۔ جو نغمہ خود اداس ہے وہ دوسروں کو بھی اداس کر دیتا ہے۔ جو آدمی خود غلام ہے دوسروں کو بھی غلام بنا دیتا ہے۔ دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندستانی ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ باقی پانچ آدمی کرب کی اس زنجیر کو محسوس نہ کرتے ہوں جو ان کی روحوں کو چیر کر نکل رہی ہے اور ایک ہندستانی سے دوسرے ہندستانی سے ملا دیتی ہے۔ جب تلک میری ستار کا ایک تار بھی بے آہنگ ہوتا ہے، اس وقت تک سارا نغمہ بے آہنگ، وبے ربط رہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں یہی حال انسانی سماج کا بھی ہے جب تک دنیا میں ایک شخص بھی بھوکا ہے، یہ دنیا بھوکی رہے گی۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی غلام ہے۔ سب غلام رہیں گے۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی مفلس ہے سب مفلس رہیں گے . . . . .

اسی لئے میں تم سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں

تم مجھے مردہ نہ سمجھو مردہ تم ہو، میں زندہ ہوں اور اپنی پھٹی پھٹی بے نور، بے بصر آنکھوں سے ہمیشہ تم سے یہی سوال کیا کروں گا تمہاری راتوں کی نیند حرام کر دوں گا۔ تمہارا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا۔ جینا، مرنا سب دوبھر ہو جائے گا۔ تمہیں میرے سوال کا جواب دینا ہوگا۔"

اس وقت تک نہیں مر سکتا. جب تک تم میرے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دو گے

میں یہ سوال اس لئے نہیں پوچھ رہا ہوں کہ میں تمہاری نئی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔

میں یہ سوال اس لئے بھی پوچھ رہا ہوں کیونکہ میں نے جل پری کو بے گور و کفن سڑک پر چھوڑ دیا ہے۔ اور میرے سر پانتے میں ایک مکڑی کا جھنجھنا ہے . . . . .''

سردار جعفری

چھرو مانجھی

ہوا بہت دھیمے سروں میں گا رہی تھی۔ دریا کا پانی آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے یہ نغمہ بڑا پر شور تھا۔ لیکن اب اس کی آخری تانیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ اور ایک نرم و لطیف گنگناہٹ باقی رہ گئی تھی۔ وہ لہریں جو پہلے ساحل سے جا کر ٹکرا رہی تھیں۔ اب اپنے سبالی ہاتھوں سے تھکے ہوئے ساحل کا جسم سہلا رہی تھی۔ ہماری کشتی بڑی نرمی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ کنارے سے دور آ کر بیچ دریا میں ماہی گیروں نے اپنے چپو چھوڑ دیے تھے۔ اور بادبان کھول دیے تھے۔ اور سمندر کی طرف دوڑتی ہوئی موجیں کشتی کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ بادبان میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ اور اس کا سینہ غرور سے پھولا ہوا تھا۔ ہماری کشتی لمبی لمبی نازک اور تیلی سمپانوں کو، ان میں بیٹھے ہوئے مانجھیوں کے گیتوں کو بڑے سیاہ فام جہاز کو اور اس ساحل کے پاس کے شہر کی جھلکتی ہوئی قندیلوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ سمپانیں موجوں میں، ساحل اندھیرے میں، اور روشنیاں ننھے ننھے خوبصورت ستاروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

بوڑھے ماہی گیر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "رات اچھی ہے آج طوفان کا خطرہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے میں چاند نکل آئے گا۔"

نوجوان ماہی گیر نے جو اس کا بیٹا تھا کہا کہ "اتنی دیر میں ہم کھلے سمندر میں پہونچ جائیں گے۔"

یہ وہ جگہ تھی جہاں دریائے کرنافلی خلیج بنگال میں جا کر ملتا ہے۔ جس کے کنارے چٹ گاؤں کا شہر آباد ہے۔ سبز اور نیلی پہاڑیوں کے دامن میں پہاڑی کے خوبصورت اور چھریرے بدن کی دوشیزاؤں کی طرح نازک درختوں کے سائے ہیں۔ جب سمندر میں پانی چڑھتا ہے تو دریا کا دھارا الٹا بہنے لگتا ہے۔ اور ماہی گیر اپنے جال پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ جب سمندر کا پانی اترتا ہے تو دریا پھر سمندر کی پھیلی ہوئی آغوش کی طرف لپکتا ہے اور ماہی گیر اپنی کشتیاں اور جال لے کر کھلے سمندر میں چلے جاتے ہیں اور ساحل کے کنارے کنارے کوکس بازار تک مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ گھروں پر ان کی بیویاں اور محبوبائیں ان کا انتظار کرتی ہیں اور سمندر میں ان کے گیت تیرتے ہیں۔ جنھیں سننے کے لئے دور دور کی مچھلیاں سمٹ آتی ہیں اور ان کے جال بھر جاتے ہیں اور کشتیاں بھاری ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں کی قوت سے چپو چلاتے ہیں۔ ان کی سانس پھول جاتی ہے، گیتوں کی تان دوہری ہو جاتی ہے۔ گلے کی رگیں ابھر آتی ہیں۔ بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتی ہیں، ہتھیلیاں لال ہو جاتی ہیں اور جب وہ اپنے گاؤں کے کنارے آ کر شکار سے بھری کشتیوں کو خالی کرتے ہیں تو ان کی بیویوں اور محبوباؤں کی آنکھیں رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں اور وہ اپنا دل ہمیشہ کے لئے اپنے بہادر ماہی گیر کو دے دیتی ہیں۔ اور رات کو جب تیل کی کمی سے چراغ کی مدھم لو ٹمٹمانے لگتی ہے اور ہوا کی ہلکی سی پھونک اسے بجھا دیتی ہے تو یہ تھکن سے چور ماہی گیر ان کے نیلگوں سینوں پر جن میں مچھلی کی بو آتی ہے اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔

لیکن جب سے لڑائی شروع ہوئی تھی۔ اور جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا۔ تب سے ماہی گیروں کو عام طور سے سمندر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کھلے سمندر میں جانے کے لئے انھیں فوجی افسروں سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ جو صرف چند امیر ماہی گیروں کو ملتا تھا۔ کیونکہ دوسرے ماہی گیر رشوت دینے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ کوکس بازار جانے کے تمام راستے بند ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ بندرگاہ بہت بڑی چھاؤنی میں تبدیل ہو گئی

تھی۔ سڑک سے صرف فوجی لاریاں گذرتی تھیں اور سمندر سے صرف جنگی جہاز۔ مجھے اخباری نمائندے کی حیثیت سے خاص اجازت نامہ ملا تھا جس پر فوجی افسروں کے علاوہ جیتے گاؤں کے ڈپٹی کمشنر کی بھی مہر لگی ہوئی تھی۔

بوڑھے ماہی گیر نے اپنی چلم سلگائی، نوجوان ماہی گیر ماہیگیروں کا گیت گانے لگا۔ میں کشتی میں لیٹ کر خواب دیکھنے لگا۔ میری نگاہیں دور تک سر پر سے گذرنے والے ہوائی جہازوں کی سرخ اور سبز روشنیوں کا تعاقب کرتیں اور پھر آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں میں کھو جاتیں جو نیلے آسمان کی گود میں دریا کی موجوں کی طرح بہہ رہے تھے۔

بوڑھا ماہی گیر میرے پاس سرک آیا اور چلم میری طرف بڑھا دی میں نے ایک لمبا سا کش لے کر پوچھا "تم اپنا جال ساتھ لائے ہو؟"

"نہیں۔ جال کیا ہو گا۔ جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے سمندر میں جال ڈالنے کی اجازت نہیں ہے"

"کیوں نہیں ہے؟"

"کہتے ہیں پانی میں بڑے بڑے بم ڈال دئے گئے ہیں تاکہ دشمن کے جہاز نہ آ سکیں، اور میں سوچتا ہوں کہ سرکار کے جہاز کیسے چلتے ہیں"

"بم تو سرکار ہی نے ڈالے ہیں" بیٹے نے اپنا گیت بند کر کے جواب دیا۔ "انھیں معلوم ہے کہ بم کہاں کہاں پڑے ہیں اور وہ اپنے جہاز ان کو بچا کر نکال لے جاتے ہیں"

"ہم تو تباہ ہو گئے" بوڑھے نے اپنی داستان شروع کی۔ رات کے اندھیرے میں اس کا جھریوں پڑا چہرہ بڑا پر وقار معلوم ہو رہا تھا۔ جس پر پچاس برس کے مصیبتوں کے نشان تھے۔

"پچاس برس سے دریا میں جال ڈال رہا ہوں، اس کے ایک ایک چپے کو جانتا ہوں۔ بہتی ہوئی موجوں کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ ان کے نیچے کتنی مچھلیاں ہیں۔ سمندر کی مچھلیاں اور دریا کی مچھلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ جب وہ چلتی ہیں تو موجوں کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے اور میں ایک نظر میں بھانپ لیتا ہوں کہ کونسی مچھلی جا رہی ہے، آسمان کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ موسم کتنی دیر میں بدل جائے گا۔ سمندر میں طوفان کب آئے گا اور دریا کا پانی اتھاہ کب بہے گا۔ پچاس برس سے یہی کام کر رہا ہوں، کچھ نہیں تو لاکھوں ہی مچھلیاں پکڑ ڈالی ہوں گی۔ لیکن آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ ہم جو محنت کرتے ہیں وہ دولت کہاں جاتی ہے۔ ہم دریا میں خالی جال ڈالتے ہیں۔ جب اسے کھینچتے ہیں تو اس میں چاندی بھری ہوتی ہے۔ تڑپتی ہوئی چاندی جو جھلمل جھلمل چمکتی ہے۔ عورتیں اس چاندی کو اپنی ٹوکریوں میں بھر کر بازار لے جاتی ہیں اور اس کے بدلے تانبے کے پیسے، گلٹ کے روپئے، اور کاغذ کے ٹکڑے لے آتی ہیں۔ ہم پھر دریا میں جال ڈالتے ہیں اور پھر اس میں سے تڑپتی ہوئی چاندی باہر نکالتے ہیں اور یہ چاندی پھر تانبے، گلٹ اور کاغذ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہمارے جسم پھر سوکھتے چلے جاتے ہیں اور آنکھیں دھنستی چلی جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح خشک ہوتے جاتے ہیں۔ میں پچاس برس سے جیتے گاؤں کے بازاروں کے لئے دریا سے چاندی نکال رہا ہوں۔ لیکن مجھے تانبے اور گلٹ کے ٹکڑوں اور کاغذ کے میلے پرزوں کے سوا کچھ نہ ملا اور وہ بھی میرے پاس نہیں رہے جیسے زندہ مچھلیاں ہاتھوں سے تڑپ کر نکل جاتی ہیں۔ یہ ٹکڑے بھی ہماری ہتھیلیوں سے پھسل جاتے ہیں اور ہماری مفلسی پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہو جاتی ہے۔"

نوجوان ماہی گیر باپ کی داستان غم سے بے نیاز کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھا ہوا ایک عشقیہ گیت گا رہا تھا۔

بوڑھے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم پڑھے لکھے ہو، بہت سے دیس دیکھے ہوں گے۔ تم جانتے ہو کہ ہماری دولت کہاں جاتی ہے؟"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بوڑھے ماہی گیر نے اس کا موقع نہیں دیا اور بہتی ہوئی موجوں کی طرف دیکھ کر اپنے سوال کا

جواب دینے لگا۔ جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

"یہ دریا ہزار برس سے بہہ رہا ہے اور اس کا پانی سمندر میں گر رہا ہے۔ میری عمر ساٹھ برس کی ہونے کو آئی لیکن میں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ اس کی موجوں کا بہاؤ رک گیا ہو۔ ایک کے پیچھے دوسری موج دیوانہ وار سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ سمندر جس کی تہہ کا کچھ پتہ نہیں۔ جو آکاش کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہماری محنت بھی اسی طرح بہتی ہوئی کسی بڑے سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ کوئی اندھا سمندر ہے جو ہماری چاندی کی طرح چمکتی محنت کو نگلے لے رہا ہے۔ چاندی ہی تو ہے جو بہہ رہی ہے۔ دیکھو یہ موجیں چاندی کی طرح چمک رہی ہیں۔ دریا کا رنگ سفید ہے اور سمندر کا رنگ نیلا۔ اور یہ سفید چاندی نیلے سمندر میں جا کر کھو جاتی ہے۔"

میں نے موجوں کی طرف دیکھا تو واقعی بہتی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہی تھیں، ہمارے بائیں طرف دور افق پر مہینے کی آخری راتوں کا چاند ابھر رہا تھا جس کی نرم کرنیں فضا سے گذر کر دریا کے جسم پر پھیل گئی تھیں اور مٹیالے پانی کو سیال چاندی میں تبدیل کر رہی تھیں بوڑھے کا سیاہی مائل چہرہ چاندنی کی ہلکی سی سرخی مائل روشنی میں چمک اٹھا تھا۔ اور سفید بادبان بادل کا ایک خوبصورت ٹکڑا معلوم ہوتا تھا جو ہمیں چاندی کے دریا میں بہائے لئے جا رہا تھا۔

بوڑھے ماہی گیر نے نظر اٹھا کر چاند کی طرف دیکھا پھر بادبان کی طرف۔ بادبان کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ یا شاید ہوا کا رخ بدل گیا تھا اور اس لئے بادبان کا بھی رخ بدلنا ضروری تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ دونوں نے لپٹی ہوئی رسیاں کھولیں اور بادبان کا رخ بدل کر میرے پاس آ بیٹھے۔

"جب سے لڑائی شروع ہوئی، مفلسی اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے قحط پڑا۔ پھر وبائیں پھیلیں۔ ایسا قحط اور ایسی وبائیں تو میں نے دیکھی نہیں تھیں۔ ہیضہ اور بخار کا لا آزار، پھر بدچلنی، ہمارے گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے، بوڑھے اور بچے مر گئے۔ لڑکے آوارہ ہو گئے اور لڑکیاں گھر بار چھوڑ کر چلی گئیں۔ پھر یہاں فوج آگئی اور ہمارے لڑکے اور لڑکیاں ماہی گیری چھوڑ کر فوج میں مزدوری کرنے لگے۔ ماہی گیری کیسے کرتے۔ نہ جال تھے نہ کشتیاں سر چھپانے کے لئے گھر بھی نہیں تھا۔ یہ سب چیزیں تو قحط ہی کے زمانے میں بک چکی تھیں۔ اب لڑکے بے حیا ہو گئے ہیں۔ لڑکیاں اور بھی زیادہ بے شرم ہو گئی ہیں، سپاہی انھیں روپے دیتے ہیں اور وہ سپاہیوں کو اب کیا کھوں کیا دیتی ہیں۔ پہلے انھیں جال کی مرمت کرنی پڑتی تھی۔ سر پر مچھلیوں کی ٹوکری رکھ کر بازار جانا پڑتا تھا۔ پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا۔ تو کیا۔ محنت سے جسم تندرست رہتے تھے۔ چہرے پر ایمانداری کی چمک ہوتی تھی۔ اور اب؟ اب کیا ہے ذرا سی آنکھیں مٹکائیں، ذرا سا کولھا چلایا اور کام بن گیا۔ مجھی کو دیکھو میرے گاؤں میں تین سو گھر تھے۔ اب صرف آٹھ گھر رہ گئے ہیں باقی سب اجڑ گئے۔ اب ان کھنڈروں میں بیٹھ کر کتے روتے ہیں۔ میری بیوی قحط میں مر گئی۔ دو بیٹیاں تھیں وہ گھر سے بھاگ گئیں۔ اب سنا ہے کہ وہ اماکان روڈ پر مزدوری کر رہی ہیں۔ مزدوری تو کیا کر رہی ہوں گی۔ یہ تو بہانہ ہے۔ ایک کا نام رادھا ہے اور دوسری کا ساونتری۔ یہ نام تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم گھومنے پھرنے والے آدمی ہو۔ شاید تمہیں اراکان روڈ پر وہ لڑکیاں مل جائیں تو ان سے کہہ دینا کہ تمہارا باپ زندہ ہے اپنا جھونپڑا ڈال لیا ہے۔ جال بھی ہے اور کشتی بھی اور دریا میں بہت سی مچھلیاں ہیں، رادھا اور ساونتری آجائیں تو ہم خوب مچھلیاں پکڑیں گے ہمارا ایک جال بھی ٹوٹا پڑا ہے۔ اس کی مرمت ان کے بغیر کیسے ہوگی۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ چپ ہو گیا اور بہتے ہوئے پانی کی موجیں گننے لگا۔ جیسے وہ ان موجوں کے آئینے میں اپنی ساری گذری ہوئی زندگی کا عکس ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا اجڑا ہوا گاؤں، مرے ہوئے ساتھی، بیوی جو داغ مفارقت دے گئی۔ گھر چھوڑ کر بھاگ جانے والی بیٹیاں جو اسے اب بھی اتنی ہی پیاری تھیں۔ وہ سب ان موجوں میں تیر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھا ماہی گیر

کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور آنکھوں سے بہہ کر آنسو اس کی جھریوں میں بھر گئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا "راوھا اور رساوتری ہی کو کیوں برا کہو آج کل سب لڑکیاں ایسی ہی ہو گئی ہیں ہمارے یہاں کالے گورے ہزاروں سپاہی آگئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے لئے موزے لاتے ہیں سفید اور لال رنگ سے بھرے ہوئے ڈبے لاتے ہیں چھوٹے چھوٹے آئینے لاتے ہیں اور لڑکیاں دیوانی ہو جاتی ہیں۔ اور اپنا منہ رنگ کر ان کے پیچھے دوڑتی ہیں۔ سپاہی دریا میں اور نالابوں میں ننگے نہاتے ہیں اور لڑکیاں کنارے کھڑی ہو کر ان کا تماشا دیکھتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے اور کئی بار سوچا کہ یہ سب لڑکیاں قحط اور وبا میں مر کیوں نہ گئیں۔ مچھلیاں پکڑنا، کھیت بونا اچھا پیشہ ہے۔ مانا کہ اس میں غربی دور نہیں ہوتی لیکن عزت تو باقی رہتی ہے۔ گھر بار تو سہنا ہے۔ لیکن یہ منہ پر رنگ پوت کے دیسی بدیسی سپاہیوں سے آنکھیں لڑانا کہاں کا پیشہ ہے لیکن اب جسے دیکھو وہ یہی کر رہی ہے۔ سپاہی اپنی موٹروں پر گذرتے ہیں تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں اور دو تین میل آگے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں سے دوسرے سپاہی انھیں اٹھا لے جاتے ہیں۔ جیٹ گاؤں سے بتنکا اور ینگنگا سے رامو اور راموسے کو کس بازار تک یہی سلسلہ ہے۔ سب لڑکیاں خراب ہو گئی ہیں۔ کوئی اچھی نہیں رہ گئی۔ میں سوچتا ہوں ہم پر جاپانی بم کیوں نہیں گراتے؟"

جہلم کے ساحل پر ایک گاؤں آباد تھا اور اس کے سرسبز درختوں کا جھنڈ چاندنی میں آہستہ آہستہ پیچھے سرک رہا تھا۔ بوڑھے ماہی گیر نے اپنی انگلی کا اشارہ کر کے کہا "وہ گاؤں دیکھتے ہو۔ قحط کے زمانے میں وہاں کے تمام آدمی مر گئے۔ ان کی لاشیں گیدڑوں اور کتوں نے کھائیں اس سال درخت میں پھل نہیں آئے بلکہ شاخوں میں گدھ پھلے تھے۔ گدھ ہی گدھ جو اکثر زندہ آدمیوں پر بھی جھپٹ پڑتے تھے۔ کوئی آدمی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ ایک رات کیا ہوا کہ ٹھیک بارہ بجے کے وقت دوسرے گاؤں سے ایک شعلہ بلند ہوا اور اس گاؤں کی طرف چلا۔ تھوڑی دیر میں جہلم کی طرف سے ایک شعلہ اٹھا اور وہ بھی اس گاؤں کی طرف چلا اور پھر دونوں شعلے مل گئے اس کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اب روز رات کے بارہ بجے آگ کے دو شعلے ناچتے ہوئے چلتے تھے ایک پورب سے دوسرا جہلم سے اور دونوں اس گاؤں میں آ کر مل جاتے تھے۔ کسی نے کہا بھوت ہیں۔ کسی نے کہا پریت ہیں اور تم تو جانتے ہو کہ مرنے کے بعد انسان بھوت پریت بن جاتے ہیں۔ اور یہاں تو ہزاروں آدمی مرے پڑے تھے۔ جب میں نے پہلی بار ان بھوتوں کو دیکھا تو میرا دل کانپ اٹھا۔ میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں۔ لیکن بھوت پریت سے تو سبھی ڈرتے ہیں۔"

بیٹے نے باپ کو ٹوک دیا: "یوں نہیں ہوا تھا۔ میں سناتا ہوں، میں نے ان شعلوں کو پکڑا تھا۔"

"سچ؟ تم نے ان شعلوں کو پکڑ لیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

بوڑھے نے خوش ہو کر کہا "میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔" اور نوجوان ماہی گیر کا سینہ اور چوڑا ہو گیا۔ اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں۔

اس نے بہت گمبھیر لہجے میں کہا کہ "کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان بھوتوں کو پکڑ لے۔ ارد گرد کے تمام گاؤں تھر تھر کانپتے تھے کوئی کہتا تھا بھوت ہیں کوئی کہتا تھا پریت ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ انگریزوں نے ایسے بم بنائے ہیں جو رات بھر خود بخود پہرہ دیتے رہتے ہیں اور دشمن کو پہچان کر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ بات ہی ایسی تھی۔ اس سے پہلے جیٹ گاؤں کے کسی آدمی نے شعلوں کو چلتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں کچھ اور ہی آئی میں نے کہا جان رہے یا جائے میں ضرور پتہ لگاؤں گا کہ یہ شعلے کیا ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔"

چاند اتنی دیر میں کافی اونچا ہو گیا تھا۔ اور اس کی کرنوں کی پھوار ہوا کے جھونکوں کے ساتھ زمین پر گر رہی تھی۔ رات ٹھنڈی ہو چلی تھی دونوں ماہی گیروں نے ایک چلم اور بھری اور باری باری اس کا کش لے کر میری طرف بڑھا دی۔

"میں کئی دن تک منصوبے باندھتا رہا لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں تیار ہو گیا۔ میں نے اپنی لنگوٹی کس کر باندھ لی اور ہاتھ میں ایک بلم لے لیا اور رات کے گیارہ ہی بجے سے ہی جا کر اس راستے پر بیٹھ گیا۔ جہاں سے وہ دونوں شعلے گذرتے تھے۔ میرا دل میرے سینے سے نکل کر میرے کانوں میں آ گیا تھا۔ اور اس کی دھڑکن سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ میں جس پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا اس کی شاخیں میرے سر پر چڑھتی چلی آ رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ اب مجھے کچل دیں گی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف گھاس میں چھپے ہوئے گبرّوں مکوڑوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یا کبھی کبھی کتے رونے لگتے تھے۔ یا پیڑوں پر بیٹھے ہوئے گدھ اپنے پر پھڑپھڑاتے تھے۔ گیارہ بجے سوا گیارہ بجے، ساڑھے گیارہ بجے، پونے بارہ بجے۔ بس اب بارہ بجنے ہی والے تھے، اور میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے اور خون معلوم ہو رہا تھا رگوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"ٹھیک اس وقت جب شہر کے گھنٹے نے بارہ بجائے تو میں نے دیکھا کہ دور میرے سامنے زمین سے ایک شعلہ اٹھا اور میری طرف چلنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے دوسری طرف سے ایک اور شعلہ اٹھا اور وہ بھی میری طرف بڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔ دونوں شعلے میرے قریب آتے جا رہے تھے۔ اور میں آنکھیں پھاڑے ہوئے اپنے سامنے سے آتے ہوئے شعلے کو دیکھ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی چمک بہت تیز تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ شعلہ زمین پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ہوا میں اڑ رہا ہے آہستہ آہستہ ہوا میں معلق شعلہ میرے قریب آتا گیا۔ میرا بدن سن ہو گیا۔ زبان منہ میں اینٹھ گئی۔ بلم کو چھوا تو وہ کئی من کا معلوم ہوا۔ میرے پیر زمین نے پکڑ لیے تھے اور اب مجھ میں اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ میں نے عمر میں پہلی بار یہ محسوس کیا کہ میں بزدل ہوں۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ موت میرے سر پر آ گئی تھی۔ اور وہ شعلہ مجھ سے دو تین گز کے فاصلے پر تھا۔ اور میں اس کے راستے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یکایک میرے سارے جسم میں ایک آگ سی لگ گئی۔ خون جو رگوں میں جم گیا تھا پھر تیزی سے دوڑنے لگا۔ اور کسی نے مجھے زمین سے اوپر اچھال دیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کون ہے؟"

نوجوان ماہی گیر چپ ہو گیا اور بوڑھا ماہی گیر اپنی پھٹی ہوئی قمیص پر ایک پھٹی ہوئی صدری پہننے لگا۔ رات کی خنکی بڑھ رہی تھی ہم شاید سمندر کے قریب پہونچ رہے تھے کیونکہ بوڑھا ماہی گیر کشتی میں لیٹے ہوئے چپوؤں کو نکال کر ادھر ادھر لگا رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے بھی بھیگے ہوئے تھے اور ان میں ہلکے سے نمک کا ذائقہ تھا۔

میں نے حیرت، استعجاب اور شوق سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

نوجوان ماہی گیر نے اپنی چلم سے دو تین لمبے لمبے کش اور لیے اور پھر دریا میں چلم الٹ دی۔

"ہاں تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ کون ہے۔ اسی کے ساتھ فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور زمین پر بہت سارے انگارے بکھر گئے۔ میرے سامنے ایک ننگ دھڑنگ عورت کھڑی ہوئی تھی۔ جس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔"

"عورت؟" میں نے پوچھا۔ جیسے مجھے یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں عورت ۔۔۔۔ جوان عورت۔ یہی کوئی بیس برس کی اور سر سے پاؤں تک ننگی۔ میں نے ایک کر اسے پکڑ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ بلکہ میرے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگی اور میرا سینہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ کوئی دس گز کے فاصلے پر انگاروں کا ایک ڈھیر اور پڑا ہوا تھا۔ اور اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی بھاگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا "تو کون ہے؟" لیکن ہچکیوں اور سسکیوں کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے پھر پوچھا ۔۔۔ تو کون ہے ۔۔۔ تو کون ہے۔ لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ آخر میں نے اس کا سر اپنے کندھے سے اٹھایا اور اسے غور سے دیکھا۔ ارے یہ تو چھرو تھی۔ عبداللہ چاچا کی لڑکی۔ میں نے کہا چھرو تجھے

کیا ہو گیا ہے۔ یہ رو کیوں رہی ہے۔ منہ سے بولتی کیوں نہیں۔ میں بھلا تیرا کچھ بگاڑوں گا۔ میں گنیش ہوں، گنیش مچھیرا۔

"ہاں" اس نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے بڑی شرم آ رہی تھی۔ کہ ایک ننگی عورت میری گود میں ہے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن آنکھیں بند نہیں کر سکا۔ ستاروں کی روشنی میں میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی، جیسے کوئی اپسرا

"وہ اپنے گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ عمر بیس برس کی ہو گئی تھی۔ لیکن اب تک بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے باپ کے پاس بیاہ کرنے کے لئے روپیہ تھا ہی نہیں۔ گاؤں کے تمام لڑکوں کی رال اس پر ٹپکتی تھی۔ اور وہ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتی تھی۔ یا ذرا سی مسکرا دیتی تھی۔ اس کا دل کئی دن تک دھڑکتا رہتا تھا۔ میں نے بھی اسے کئی بار دیکھا تھا۔ اور دل میں یہ سوچا تھا۔ کاش وہ مچھیری ہوتی یا میں مسلمان ہوتا۔ میں اس سے ضرور شادی کر لیتا لیکن مشکل یہ تھی کہ میں مچھیرا تھا۔ اور وہ مسلمان۔ لیکن اُس رات کو بارہ بجے گاؤں کی یہ سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی جس پر ہر جوان لڑکا اپنی جان چھڑکتا تھا۔ اکیلی اور ننگی میری گود میں تھی۔ چاروں طرف سے سڑی ہوئی لاشوں کی بو آ رہی تھی۔ درختوں پر گدھ اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہے تھے۔ کتے رو رہے تھے۔ اور چہرو میرے سینے پر سر رکھے ہوئے رو رہی تھی۔

"میں چہرو کو لے کر کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا اسے جی بھر کے رو لینے دو، جب اس کے دل کے سارے آنسو بہہ جائیں گے تب بات کروں گا۔"

بوڑھے ماہی گیر نے آواز دی "سمندر آ گیا۔ چپو سنبھال لو۔" گنیش پیچھے اور اس کا باپ آگے بیٹھ گیا اور چار چپو چپ چاپ چلنے لگے۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دریا کی انفرادیت غائب ہو چکی تھی۔ اور اب ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ سمندر پر ایک غنودگی طاری تھی۔ لہریں آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے بڑے ہلکے تھے۔ ہماری کشتی پورب کی طرف مڑ گئی اور چاند ہمارے سر پر چمک رہا تھا۔ ایک خوبصورت چہرے کی طرح جو مکان کی سب سے اونچی منزل کی کھڑکی سے جھانک رہا ہو اور راہ گیروں پر اپنے حسن کی بارش کر رہا ہو۔ دونوں ماہی گیر بڑی پھرتی اور صفائی سے چپو چلا رہے تھے۔ ان کے جسم ایک ساتھ آگے جھکتے تھے اور پھر سیدھے ہو جاتے تھے بیٹھے ہوئے وقت ان کے کندھے بلند ہوتے تھے۔ اور سینے تن جاتے تھے۔ چپو بھی ان کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے۔ جو سمندر تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور موجوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے۔ جیسے ہنسیا دھان کے پکے کھیتوں کو کاٹتا ہے۔ ان کے بازوؤں کی جنبش میں ایک خاموش ہم آہنگی اور ترنم تھا۔ جو سمندر کی موجوں کے ترنم سے مل گیا تھا۔

وہ دونوں بڑی دیر تک کشتی کھیتے رہے یہاں تک کہ چاند پچھم کی طرف ڈھل گیا۔ اور ایک گول ٹکیا سمندر کی سطح کے قریب لرزنے لگی باپ اور بیٹا دونوں تھک کر چور ہو گئے۔ دم لینے کے لئے انھوں نے پھر چپو نکال کر کشتی میں لٹا دئے۔ گنیش نے اپنی ہتھیلیاں ملیں۔ بوڑھے ماہی گیر نے پھر چلم بھری اور کشتی کی ایک دیوار سے سہارا لے کر لیٹ گیا۔ بادبان میں بھری ہوئی ہوا کشتی کو آہستہ آہستہ چلا رہی تھی۔

میں نے گنیش کو آواز دی۔ وہ مسکرانے لگا "تم چہرو کے بارے میں سوچ رہے ہو گے؟"

"ہاں"

"میرے دل میں بھی چہرو ہی بسی ہوئی ہے۔ اس کا نام گل چہر تھا۔ اور وہ ایک بہت غریب کسان کی لڑکی تھی۔ سب لوگ اسے چہرو کہتے تھے۔ قحط میں اس کے ماں باپ، بھائی بہن سب مر گئے۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ اس زمانے میں تو بھیک بھی نہیں ملتی تھی۔ فاقے کرنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ لیکن چہرو خوبصورت تھی۔ اور اس کی ایک سپاہی سے آشنائی ہو گئی۔ کوئی پنجابی سپاہی تھا۔

وہ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ ملنے کی یہ انوکھی ترکیب نکالی کہ رات کو بارہ بجے دونوں ننگے ہو جاتے تھے اور اپنے سروں پر آگ کی تھالی بھر کر رکھ لیتے تھے۔ اور اس گاؤں میں چلے جاتے تھے جہاں کسانوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔"

"لیکن وہ اس طرح کیوں ملتے تھے؟"

"میں نے بھی چہرو سے یہی سوال کیا کہ تو نے یہ کیا تماشا کیا ہے۔ رات کے بارہ بجے ننگی ہو کر چڑیلوں کی طرح کیوں نکلتی ہے۔ اس نے جواب دیا، تاکہ لوگ سچ مچ مجھے چڑیل اور میرے سپاہی کو بھوت سمجھیں! میں نے کہا تو اس کے ساتھ نکاح کیوں نہیں کر لیتی تو اس نے بتایا کہ وہ ایک بار اپنے سپاہی کے ساتھ کیمپ میں گئی تھی۔ تو فوجی افسروں نے اسے دیکھ لیا اور سپاہی کو سزا دی۔ پھر فوجی ٹھیکیداروں نے اس کے پاس آدمی بھیجے کہ چل تجھے بڑے افسروں کے پاس لے چلیں گے۔ لیکن وہ بڑے افسروں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ کوئی بیسوا تھوڑی تھی۔ اسے سچ مچ اپنے سپاہی سے محبت تھی۔ اس لئے رات کے بارہ بجے جب تمام گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں میں چھپ جاتے تھے تو وہ اپنے سر پر آگ سے بھری ہوئی تھال رکھ کر نکلتی تھی۔ اور اپنے سپاہی سے مل کر واپس چلی جاتی تھی۔ سپاہی اس کو کھانے اور رہنے کا خرچ دیتا تھا جب میں نے اس کا پورا قصہ سنا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میں نے اس سے معافی مانگی لیکن اس نے کہا "اب میں اپنے سپاہی سے نفرت کرنے لگی ہوں۔" میں نے پوچھا کہ کیوں؟ تو بولی کہ "وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ڈرپوک کہیں کا۔ وہ تو کہو کہ تم تھے اور تم مجھے جانتے ہو کوئی اور ہوتا تو کیا ہوتا۔ اور تم نے بھی مجھے ننگا دیکھا ہے۔ بتاؤ تمہیں میرا جسم دیکھنے کا کیا حق ہے۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔ تمہاری معشوقہ نہیں ہوں۔ تم نے میرے جسم پر اپنی نگاہیں کیسے ڈالیں ــــــ" یہ کہہ کر چہرو مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور اس نے اپنے خوبصورت بالوں سے اپنا سینہ چھپا لیا تھا۔ میں نے کہا چلو میں تم کو گھر پہنچا آؤں لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کیا سمجھتے ہو۔ میں ڈرتی ہوں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ جہاں میرا جی چاہے گا وہاں جاؤں گی۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ وہ دیر تک کھڑی ہوئی سانس لیتی رہی اور پھر خود ہی بڑی نرمی سے بولی ــــ تم کسی سے کہو گے تو نہیں۔ میں نے وعدہ کیا تو وہ مسکرائی۔ اس سے میری ہمت بڑھی اور میں نے کہا۔ چہرو میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ مجھ سے بیاہ کرو گی۔ وہ بہت زور سے ہنسی قہقہہ مار کر۔ جس کی آواز سن کر کتے پھر رونے لگے اور گدھ اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔ میں نے کہا چہرو سچ مچ تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں، آج سے نہیں بلکہ دو برس سے میں تمہارا دیوانہ ہوں۔

"چہرو پھر سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی " تم نے پہلے کیوں نہیں بیاہ کی بات کی۔ مجھے دو وقت کھانا دے سکو گے۔ میری بڑی بہن دس برس کی بیاہی تھی۔ لیکن اس کے میاں نے اسے ہاتھ پکڑ کر نکال دیا۔ میری ماں نے مرنے سے پہلے اپنے تین برس کے بیٹے کو گھر سے ڈھکیل دیا۔ ایک مٹھی بھر چاول کے لئے میرا باپ گلا گھونٹنا چاہتا تھا۔ بتاؤ تم مجھ سے بیاہ کر کے مچھلی اور بھات کہاں سے دو گے۔ آج تم نے مجھے ننگا دیکھا ہے تو تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی۔ لیکن اس محبت سے تم چاول نہیں خرید سکو گے۔ چاول، چاول، دو روپیہ سیر بک رہا ہے دو روپیہ سیر" یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی چہرو چلی گئی اور اس کا خوبصورت جسم اندھیرے میں کھو گیا۔ میرے سامنے زمین پر انگاروں کا ڈھیر پڑا تھا۔ جو رفتہ رفتہ بجھتے جا رہے تھے وہ راتوں رات کہیں نکل گئی اور آج تک واپس نہیں آئی۔ اس قصے کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ میں اپنے دل میں چہرو کی یاد لئے بیٹھا ہوں۔ جب بہت اداس ہوتا ہوں تو کشتی لے کر دریا میں نکل جاتا ہوں۔ جسمانی محنت سے دل کا درد دور ہو جاتا ہے۔"

گنیش تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر چپو چلانے لگا۔ اس کا بوڑھا باپ خراٹے لے رہا تھا اور سمندر کی موجیں سسک رہی تھیں۔

میں بھی لیٹے لیٹے سو گیا۔ گنیش رات بھر اکیلا چپو چلاتا رہا۔ جب صبح میری آنکھ کھلی تو سورج نکل رہا تھا۔ سمندر کی موجیں

ناچ ناچ کر گیت گا رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے سبز رنگ کا زمردیں سمندر تھا۔ اور سامنے سنہرے رنگ کا سمندر جس کے کنارے کنارے کوکس بازار کا دلکش ساحل پھیلا ہوا تھا۔ سپاری کے نازک درخت سر اٹھائے کھڑے تھے جیسے ابھی سمندر سے نہا کر نکلے ہوں اور دھوپ میں اپنے بال سکھا رہے ہوں دونوں ماہی گیر تیز تیز چپو چلا رہے تھے۔ اور کشتی کوکس بازار کے نتھنے سے دریا کے دہانے میں داخل ہو رہی تھی۔

اب ہم پتلے سے دریا کے اندر تھے اور ہمارے دونوں طرف کالے رنگ کی کیچڑ اور پھر سنہرے رنگ کا ساحل تھا۔ ایک طرف ہزاروں فوجی موٹریں اور توپیں کھڑی تھیں۔ دوسری طرف ہوائی اڈے پر سیکڑوں جہاز بڑی بڑی ٹڈیوں کی طرح اپنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کئی جہاز سر پر منڈلا رہے تھے۔ جہاز توڑ توپیں اپنے دہانے آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے جاپانی جہازوں کا انتظار کر رہی تھیں اور بہت سے سپاہی افسر اور مزدور ریت پر چل پھر رہے تھے۔ بیچ دریا میں لکڑی کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ جس کے پاس کئی کشتیاں اور سمپانیں تیر رہی تھیں۔ ہماری کشتی بھی پل سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

یکایک گنیش کی زبان سے نکلا "چھرو"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ پل پر ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے زرد مخمل کی پتلون اور سبز مخمل کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے کٹے ہوئے بال سمندر سے آنے والی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ بھویں تنی ہوئی تھیں۔ اور آنکھوں میں سورج کی کرنوں کی تیزی تھی۔ میں نے بھر نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے رخسار سے پاوڈر اور رنگ سے گلابی ہو رہے تھے۔ اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ایک بڑی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔ اور داہنے ہاتھ میں ایک فوجی بید تھا۔

اس نے بید سے میری طرف اشارہ کر کے کہا "بھدر لوک" اور اس کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک ناچ اٹھی

بوڑھے ملاح نے جلدی سے کہا "پرمٹ دکھاؤ"

میں نے جیب سے پرمٹ نکالا اور کشتی میں کھڑے ہو کر چھرو کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن اس نے پرمٹ کی طرف دیکھا بھی نہیں اور مجھ سے کہا "کشتی سے نیچے اترو"

میں نے پل پر چڑھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے اپنے بید سے ایک ٹھوکا دے کر کہا "اوپر مت چڑھو کشتی سے نیچے اترو"

لیکن نیچے سیاہ رنگ کی کیچڑ تھی۔ میں حیران تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔

گنیش نے کہا "چھرو تو کتنی بدل گئی ہے۔ دیکھتی نہیں نیچے کیچڑ ہے"

"دیکھ رہی ہوں" چھرو نے گنیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اسے نیچے اتارو۔ یہ بھدر لوک ہے اور بھدر لوگ کو پل پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے اسے کیچڑ میں چلاؤ تاکہ اس کے سفید کپڑے لت پت ہو جائیں۔ جلدی کرو، دوسری کشتیاں آ رہی ہیں"

چھرو کی آواز میں ایک قسم کا وقار تھا۔ آنکھوں میں وہی وحشی چمک۔ گنیش اور بوڑھے ملاح کے چہروں پر پریشانی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کئی فوجی کشتیاں آ رہی تھیں۔

میں کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گیا اور اپنے جوتے اتارنے لگا۔ گنیش نے اپنے مضبوط بازوؤں کی جنبش سے میرا سامان اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔ بوڑھے ملاح نے کہا "چھرو تو بڑی افسر ہو گئی ہے اور ہم سب کو بھول گئی ہے" پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا "یہ بھدر لوک نہیں ہیں۔ بمبئی سے آئے ہیں۔ غریبوں کی سیوا کرتے ہیں۔

* بنگالی زبان میں درمیانی طبقے کے سفید پوش آدمی کو بھدر لوک کہتے ہیں۔

آخری جملہ سن کر چہرو کو گھن آگئی۔ اس کے ہونٹ تلخی سے اینٹھ گئے اور اس نے اپنی وحشی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا پھر بولی

"سب بھدر لوک ایک سے ہوتے ہیں اور سب غریبوں کی سیوا کرتے ہیں۔ چاچا میں تمہیں بھولی نہیں ہوں۔ اپنی ماں کی کوکھ کو بھی نہیں بھولی ہوں مجھے خوب یاد ہے کہ میں کون ہوں۔ تم مچھیرے ہو اور میں کسان کی لڑکی ہوں، میں ہر بھدر لوک کو اس کیچڑ میں چلاتی ہوں۔ تم نے اسے سمندر میں ڈبو کیوں نہیں دیا۔ بھدر لوک کہیں کا۔"

میں اتنی دیر میں کیچڑ میں اتر چکا تھا۔ اور جیب سے روپے نکال کر کشتی کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔ میرے پیر گھٹنوں گھٹنوں تک سیاہ کیچڑ میں دھنس گئے تھے۔ پل پر کھڑی ہوئی چہرو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور گنیش اسے للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جب میں کیچڑ سے گذر کر ساحل پر پہونچا تو چہرو کا قہقہہ بلند ہوا پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر گنیش کو پل کے اوپر چڑھا لیا اور اس سے ہنس ہنس کر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگی۔

گنیش نے پکار کر باپ سے کہا "بابا تم جاؤ میں یہیں رہوں گا۔"

بوڑھے ملاح نے ملامت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا اور بولا "پاگل مت بن بیٹا۔ چہرو تیرے کام کی نہیں رہ گئی۔"

چہرو نے مسکرا کر گنیش کے رخسارے پر اپنی ہتھیلی سے ایک ہلکی سی تھپکی دی۔ اور اسے سہارا دے کر پل سے نیچے کشتی میں اتارنے لگی۔ گنیش نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کود کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چپو اٹھائے اور انھیں تیز تیز چلاتا ہوا کشتی کو نکال لے گیا۔ چہرو کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں

میں ایک میلے تولیا سے اپنے پیر کی کیچڑ پونچھ رہا تھا۔ کہ چہرو پل سے اتر کر میرے پاس آکھڑی ہوئی اور پوچھنے لگی "تم کہاں سے آئے ہو؟ بمبئی سے؟"

"جہنم سے،" میں نے جل کر کہا۔

"میں کبھی کبھی بھدر لوک کو بیٹا بھی دیتی ہوں۔ اپنے اس بدے سے،" چہرو کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

میں نے گردن اٹھا کر اس عجیب و غریب لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی وحشی چمک میں بلا کا جادو تھا۔ اور پیشانی پر نفرت اور شرارت سے پڑی ہوئی ہلکی ہلکی شکنیں۔ اس کے خوبصورت بیضاوی چہرے کی معصومیت میں وقار کا اضافہ کر رہی تھیں میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ گنیش کی کہانی نے میرا شوق اور بڑھا دیا تھا۔ لیکن چہرو کے تیور بڑے خطرناک تھے۔ اور مجھے زبان کھولنے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔

"مجھے گالی کیوں دیتی ہو۔ میں بھدر لوگ نہیں ہوں!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم بھدر لوک کو گالی سمجھتے ہو؟" وہ ہنسی "مگر تمہارے کپڑے تو ویسے ہی ہیں!"

"اور تمہارے کپڑے؟"

"یہ تو میں نے بھدر لوگوں کو جلانے کے لئے پہنے ہیں۔ مجھے اچھے تھوڑی لگتے ہیں۔"

"اور یہ چہرے پر رنگ جو تم نے پوت رکھا ہے؟"

"روزی کمانے کے لئے!"

میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ یہ بے حیائی تھی۔ بے باکی تھی۔ یا انتقام کا جذبہ۔ میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

"اچھا تو تم بھلے لوگ نہیں ہو اور غریبوں کی سیوا کرتے ہو؟" اس نے بڑے طنز سے پوچھا۔ "کالا بازار کرتے ہو یا لڑکیاں بیچتے ہو؟ اس کے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہوگئیں اور تیوریوں پر بل پڑ گئے، ہونٹوں پر ایک تلخ سی ہنسی آئی۔ اور وہ مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہوئی چلی گئی اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جس میں کسانوں کی بوباس تک باقی نہیں رہ گئی ہے۔

یہ بغاوت اور انتقام نہیں ہے بلکہ صرف مزاج اور آوارگی ہے۔ یہ پارہ سے بنی ہوئی لڑکی جس کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں خود اپنی ذات سے انتقام لے رہی ہے۔ اپنی فطرت اور اپنی نسوانیت سے بغاوت کر رہی ہے۔ جیسے سمندر کی کوئی بیتاب موج طوفان کی آغوش سے نکل کر ساحل پر آپڑی ہو اور اپنے تھپیڑوں سے خشک ریت کو سمندر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ننھے ننھے خاک کے ذرے اسے اپنا رزق سمجھ کر ایک ایک گھونٹ کر کے پی جائیں گے۔

کوکس بازار میں ہر ایک کی زبان پر چیرو مانجھی کا نام تھا۔ چیرو چوبیس برس کی کسان لڑکی تھی۔ جس نے مزدوری کرتے کرتے مزدوروں کی سرداری حاصل کر لی تھی . . . . . اور اب مانجھی کہلاتی تھی۔ . . . . . جس نے تھامی* اور ارنا اور گمچھا ترک کر کے انگریزی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ جو اپنے حسن کی وجہ سے فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوئی تھی۔ جو کسی سفید پوش آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جو ہر ایک کی بے عزتی کر دیتی تھی۔ جو ہر ایک کی بے عزتی کر دیتی تھی۔ جو درجنوں شریف آدمیوں کو کیچڑ میں چلا چکی تھی۔ عورتیں خاص طور سے اس سے نفرت کرتی تھیں لیکن مرد کچھ للچائے ہوئے لہجے میں اس کی مذمت کرتے تھے۔

دوسرے دن میں نے اسے ایک جیپ میں گذرتے دیکھا۔ اس کی گود میں پھولوں کا ایک بڑا سا گچھا رکھا تھا۔

تیسرے دن وہ مجھے ایک چیرنگ** کے پاس کھڑی ہوئی مل گئی۔ اور مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔

میں نے کہا "کیسی ہو چیرو"

"کیسی ہوں؟" اس کی آنکھیں پھر چمک اٹھیں "اچھا یہ بتاؤ۔ میں پتلون اور جیکٹ پہن کر کیسی لگتی ہوں؟"

"بالکل انگلستان کی شہزادی معلوم ہوتی ہو"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے دونوں رخساروں میں دو چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے اور خوبصورت سفید دانتوں کی قطار چمکنے لگی۔ اتنے میں ایک فوجی ٹرک آئی۔ چیرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور اچک کر اس میں بیٹھ گئی۔ جب ٹرک چلی تو وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ گاڑی کے پہیوں سے اڑنے والی سرخ دھول نے جو باری کے پیڑوں تک ملند ہوگئی تھی۔ اسے ڈھانپ لیا۔

شام کو سارے کوکس بازار میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص یہ کہہ رہا تھا۔ کہ چیرو کو یہاں سے نکال دو۔ اس نے زامو روڈ پر ٹرک سے اتر کر کسی شریف آدمی کو لہولہان کر دیا تھا۔ ساری بستی اس کے خلاف ہوگئی تھی۔ لیکن فوج کا خوف انھیں زبانی احتجاج سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ رات کو یہ خبر آئی کہ فوجی افسروں نے اسے سزا دی ہے اور اب وہ ساحل کے علاقے سے باہر بستی میں نہیں نکلنے پائے گی۔ لوگ اطمینان کا سانس لے کر سو گئے۔ اور پھر چیرو کے افسانے مزے لے لے کر بیان کرنے لگے۔

---

* تھامی رنگین دھوتی کو کہتے ہیں جو جٹ گاؤں کی مسلمان عورتیں باندھتی ہیں۔ بازو چولی یا انگیا کو کہتے ہیں۔ اور گمچھا دوپٹے کو۔

** ۔ لکڑی کا بنا ہوا ایک طرح کا جھونپڑا جو پبلک کے استعمال کے لئے سڑکوں کے کنارے بنا دیا جاتا ہے۔ لوگ اس میں بیٹھ کر ستاتے بھی ہیں۔ اور بے گھر لوگ اکثر رات کو اس میں سوتے ہیں۔

صبح ساحل پر چیرو مزدوروں کی ایک ٹولی کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ اس وقت سمندر میں پانی چڑھ رہا تھا۔ اور لہریں دوڑ کر ساحل کا منہ چوم رہی تھیں بڑی بڑی سو سو گز لمبی لہریں۔ روئی کے گالوں کی طرح بہتی ہوئی اور چاندی اچھالتی ہوئی آتی تھیں اور ریت پر جھاگ چھوڑ کر چلی جاتی تھیں، چیرو ایک نیلے رنگ کا چست لباس پہنے ہوئے تھی۔ اور ابھی ابھی سمندر سے نہا کر نکلی تھی۔ اس کے دونوں بازو، آدھی رانیں اور پنڈلیاں ننگی تھیں جن پر سمندر کے نمک کا باریک برادہ جما ہوا تھا۔ بھیگے ہوئے بال الجھے ہوئے تھے۔ اور چہرے کا گندمی رنگ سمندر کے نمکین پانی سے دھل کر نکھر آیا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کے سڈول جسم کی دلکشی کا اندازہ کیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک بار تن گئی اور اس کا سینہ سمندر کی کسی لہر کی طرح بلند ہو گیا۔ "کیا تم بھی مزدوری چاہتے ہو؟ میں نے کل شام تمہاری ہی طرح کے ایک بھدر لوک کو پیٹا تھا جو مجھے سڑک کے کنارے کھڑا ہوا گھور رہا تھا۔ کیا تمہاری بھی شامت آئی ہے؟"

"تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"تم سے مطلب؟ تم ہوتے کون ہو؟"

"میں کیسے بتاؤں۔ جب تم سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی ہو؟"

میں حیران رہ گیا اس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوڑتی ہوئی بالکل ساحل کے کنارے پہونچ گئی جہاں سمندر کی موجیں ریت کا منہ دھو رہی تھیں۔ وہ بھیگی ہوئی ریت پر بیٹھ گئی۔ اپنے پیر سمندر کی طرف پھیلا دئے اور کہنیاں نرم مخملیں ریت میں ٹیک دیں۔

"مجھے ایک بات بتاؤ گے؟" اس نے ایسی محبت سے پوچھا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

"پوچھو!"

"گنیش نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"ہاں۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا اور آنکھوں میں بے انتہا نرمی اور لطافت آ گئی۔ جیسے کسی نے جادو کے زور سے اس کی وحشت اور خشونت کو بدل دیا۔ اور وہ بے انتہا حسین ہو گئی، سمندر کی موجیں اس کے پیروں کو چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک اپنے دونوں ہاتھوں سے ریت کے گھروندے بناتی رہی اور بگاڑتی رہی۔ "مجھے اس ریت سے بڑی محبت ہے۔ میں اس سے پیدا ہوئی ہوں۔ گنیش بھی اسی سے پیدا ہوا ہے۔ میں اکثر آ کر اس ریت کی گود میں لیٹ جاتی ہوں اور گھنٹوں خواب دیکھتی رہتی ہوں بڑے بڑے دھان کے کھیت ہیں۔ دور افق تک پھیلے ہوئے کھیت جن کی سنہری بالیاں لہرا رہی ہیں۔ میں اپنے ہنسیے سے کھیت کاٹ رہی ہوں اور دھان کی بالیاں سمیٹ سمیٹ کر کھلیان لگا رہی ہوں۔ میں کٹے ہوئے کھیتوں کی منڈیروں پر گاتی ہوئی گھوم رہی ہوں، زمین گا رہی ہے آسمان گا رہا ہے۔ ہوائیں گا رہی ہیں اور دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس میں گنیش بیٹھا ہوا ہے اس کے جال میں بڑی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی ہیں۔ جنھیں دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔"

وہ چپ ہو گئی اور ریت کے گھروندے کو اپنی مٹھی میں اٹھا لیا۔

"میں گنیش سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا باپ موجود تھا۔ بڈھا کھوسٹ، کہتا ہے کہ میں گنیش کے قابل نہیں رہ گئی ہوں اور وہ اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ بزدل کہیں کا۔ دیکھو نا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" اس نے آخری جملہ یوں

کی طرح کہا :-

" مگر تم خود جو اسے چھوڑ کر چلی آئیں "

" محبت کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے ۔ مجھے بزدل آدمیوں سے بڑی نفرت ہے ، میں ایسے آدمی پسند کرتی ہوں جو ہنستے ہوئے موت کے منہ میں چلے جائیں ۔ دیکھو سمندر میں طوفان آ رہا ہے ۔ پانی گزوں اچھل رہا ہے ۔ اگر میں گنیش سے اس وقت کشتی کھینے کے لئے کہوں تو وہ کبھی تیار نہ ہوگا ۔ کنارے کھڑا ہو کر جال پھینکے گا ۔ مچھیرا ہے نا مچھیرا ۔ مجھے بھی مچھلی کی طرح پکڑنا چاہتا ہے ۔ بتاؤ میں مچھلی تو نہیں ہوں ، بولو کیا میں مچھلی ہوں ؟ "

" نہیں "

" میں مچھلی نہیں ہوں ، میں عورت ہوں ، چہرو ہوں ، گل چہرہ ہے میرا نام ۔ مجھے کوئی مچھلی کی طرح نہیں پکڑ سکتا "

ایک مزدور دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا ۔ " چہرو مانجھی ۔ چہرو مانجھی ۔ تمہیں صاحب نے بلایا ہے "

" کہدو نہیں آتی "

" وہ بوتھی ڈانگ جا رہے ہیں موٹر پہ بیٹھے ہیں "

" بس کہدو نہیں آتی ، میں بوتھی ڈانگ نہیں جاؤں گی ۔ میں سمندر میں جا رہی ہوں

مزدور چلا گیا ۔ میں نے پوچھا کس نے بلایا ہے ؟ "

" کوئی نہیں وہ لال منہ کا بندر ہے ، اس کا تبادلہ ہوگیا ہے اور مجھے بوتھی ڈانگ لے جانا چاہتا ہے ۔ میں نہیں جاتی ۔ اس کے ایسے ہزاروں یہاں میں گئے ۔ کوئی میں ڈرتی تھوڑی ہوں ۔ کسی چیز سے نہیں ڈرتی ۔ آؤ طوفان میں کشتی چلائیں بڑا مزا آئے گا "

میں کہنا چاہتا تھا کشتی الٹ جائے گی ۔ لیکن اس ڈر سے چپ رہا کہ وہ مجھے بزدل سمجھے گی ۔

اس نے ایک نازک سی سمپان کا انتخاب کیا اور پل پر چڑھ کر اس میں کود گئی ۔

میں نے پوچھا " میں بھدرلوک ہوں ، کیا کیچڑ میں چل کر آؤں "

" پل سے ہو کر آجاؤ ۔ تم بھدرلوک نہیں ہو ۔ جب تم میرے کہنے سے بغیر احتجاج کئے کیچڑ میں چلنے کو تیار ہوگئے ۔ تب ہی میں سمجھ گئی کہ تم بھدرلوک نہیں ہو "

اس نے چپو سنبھال لئے اور سمپان کھینے لگی ۔ اس کے ہاتھ بڑی مشاقی سے چل رہے تھے ۔ جب سمندر کا پانی چڑھ رہا ہو اس وقت کشتی کھینا مذاق نہیں ہے ۔ میرا دل کانپ رہا تھا ۔ کہ کہیں سمپان الٹ نہ جائے لیکن چہرو بڑے اطمینان سے چپو چلا رہی تھی ۔

" تمہیں چپو چلانا آتا ہے ؟ " اس نے پوچھا

" ہاں میں بمبئی کے سمندر میں کشتی کھے چکا ہوں "

" اور تیرنا بھی آتا ہے ؟ "

" ہاں کچھ یوں ہی سا "

پھر ڈر کی کوئی بات نہیں " یہ کہہ کر وہ چپوؤں کو اور زیادہ تیز چلانے لگی ۔

کھلا ہوا سمندر جوش کھاتے ہوئے پانی کی طرح ابل رہا تھا ۔ اور ہماری سمپان غصے میں بھری ہوئی موجوں پر ایک سوکھے ہوئے پتے کی طرح لرز رہی تھی ۔ موجوں کے تھپیڑے بڑے سخت تھے ۔ اور سمپان بری طرح ڈگمگانے لگی تھی ۔ ایک موج کشتی کے اوپر سے گذر کر ہمیں بھگو گئی ۔

میں نے کہا: "چپو مجھے دے دو"

"تم مجھ سے اچھے چپو نہیں چلا سکتے۔"

"سمپان واپس لے چلو۔ الٹ جائے گی۔"

"تم ڈر رہے ہو"

میں نے لپک کر چپو پکڑ لیئے۔ چھرو نے انھیں میرے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایک بار سمپان پھرکی کی طرح ناچ اٹھی اور ایک بڑی سی غضب ناک موج نے آکر اسے دس بارہ فٹ اوپر اٹھا لیا اور ایک زبردست جھٹکے سے ساحل پر پھینک دیا۔ ایک دوسری موج ہمارے اوپر سے گزر گئی، اور سمندر غرانے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ چھرو کہاں گری اور میں کہاں گرا۔ جب موج سر سے گذر چکی تو میں ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اور چھرو مجھ سے کئی گز دور کھڑی تھی۔ اور کشتی موجوں کے تھپیڑوں میں تھی۔ ایک چپو ریت میں دھنس گیا تھا اور دوسرا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے فریاد کر رہا تھا۔

اس نے پکار کر پوچھا۔ "چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں، ریت بہت نرم ہے" میں نے جواب دیا حالانکہ میرے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔

چھرو، پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی "میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس دنیا کو اسی طرح اٹھا کر پھینک دے جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو میں خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہوں اور میں سوچتی ہوں، یہ طوفان بڑھتا جائے گا۔ بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ آسمان اور زمین کے بیچ میں صرف سمندر ہی سمندر رہےگا۔ اس کی نیلی موجوں میں۔ ہم تم گنیش، چاند سورج ستارے سب ڈوب جائیں گے!"

میں نے کہا "تم پگلی ہو چھرو!"

"ہاں میں سچ مچ پگلی ہوں۔ تم بھی پگلے ہو جو میرے پاس بیٹھے ہو۔ گنیش بھی پگلا ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ لاکھوں کسان اور مچھیرے سب پگلے تھے جو چار دانہ چاول کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے صرف بھدر لوک پگلا نہیں ہے۔ باقی سب پگلے ہیں!"

"تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟" میں نے موقع پا کر پوچھا۔

چھرو ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اور اس کی نظروں کی وحشی چمک اس کی آنکھوں میں واپس آگئی۔

"جانتے ہو میں کیا کرتی ہوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا "میں اپنا جسم بیچتی ہوں، اجنبی آدمی تم پہلے شخص ہو جس سے میں اس طرح باتیں کر رہی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ مجھے بھی اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے اور میں اسے بیچتی ہوں ایک رات کے تیس روپے لیتی ہوں اور فوجی افسر مجھے اس سے زیادہ روپے دیتے ہیں۔ تم سمجھتے ہوگے کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ نہیں۔ میں تو کسان کی بیٹی ہوں دھرتی کی طرح پاک، میں نے یہ پیشہ کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جب میرے ماں باپ مر گئے اور سارا گاؤں اجڑ گیا اور میں ہزاروں لاشوں کے بیچ میں اکیلی رہ گئی اور لاشوں کو نوچ نوچ کر کھانے والے کتے مجھے دیکھ کر اپنے دانت پیستے تھے۔ تو گیارہ دن کے فاقوں کے بعد میں لڑکھڑاتی ہوئی اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی۔ مٹھی بھر چاول کی بھیک مانگنے کے لئے۔ وہ چاول جس کا دھان میں نے پچھلی فصل میں اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔ زمیندار کے گھر میں منوں چاول بھرا ہوا تھا۔ لاشوں کی طرح بوریاں گنجی ہوئی تھیں وہ اس کا بیوپار کرتا تھا۔ کالے بازار کا بیوپار۔ جہاں وہ ہمارے کھیتوں کا پیدا کیا ہوا چاول ساٹھ روپے من بیچ رہا تھا۔ میں گیارہ دن کی بھوکی تھی اور دنیا میں میرا کوئی سہارا نہیں تھا۔ کئی بار میں نے سڑتی ہوئی لاشوں کا گوشت کھانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گھن آگئی۔ میں نے زمیندار سے مٹھی بھر چاول مانگے۔ اس نے پوچھا کیا قیمت دوگی۔ مگر میرے پاس کیا تھا۔ میں نے کہا

خیرات دے دو۔ اس نے کہا، میں کئی خیراتی اسکول اور یتیم خانے چلا رہا ہوں۔ جٹ گاؤں میں میرا خیراتی لنگر خانہ چل رہا ہے۔ آخر کہاں تک خیرات دوں۔ میں نے پوچھا پھر کیا کروں۔ جٹ گاؤں تک جانے کی سکت نہیں ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا تمہارے پاس جوانی ہے۔ خوبصورت چہرا ہے بھرا بھرا جسم ہے اسے کہیں جاکر بیچ آؤ۔ لیکن میرا جسم چاول کی بوری تو نہیں تھا۔ جو میں اسے بیچ دیتی۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔ لیکن دو دن کے بعد جب میں تیرہ دن کی بھوکی تھی۔ میں اپنا جسم لاش کی طرح گھسیٹ کر زمیندار کے پاس لے گئی۔ میں نے کہا میں اپنا جسم مٹھی بھر چاول میں بیچنے آئی ہوں، اسے خرید و گے۔ وہ خفا ہو گیا۔ بھدر لوک، بڑے عزت والے ہوتے ہیں۔ اس نے کہا۔ میں کوئی دلال ہوں۔ میں نے کہا پھر میں کہاں اپنا جسم بیچنے جاؤں مجھ سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔ زمیندار نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس کا بیٹا جو مجھے گھسیٹ کر باہر لایا تھا۔ سیر بھر چاول میں میرا جسم خرید لے گیا۔ تب میں محسوس کرتی ہوں کہ میرے پاس میرا جسم نہیں ہے۔ میری جوانی نہیں ہے۔ میری خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ سب تو سیر بھر کچے چاول میں بک چکی ہیں اس کے بعد مجھے ایک سپاہی ملا۔ وہ ڈرپوک تھا۔ پھر گنیش ملا وہ بھی بزدل نکلا۔ اور اب کوکس بازار میں میری حکومت ہے۔ یہاں جتنے آدمی ہیں سب بزدل ہیں۔ یہاں بہت سے بھدر لوک آتے ہیں۔ اپنا بیوپار کرنے کے لئے، فوجی ٹھیکہ لینے کے لئے۔ میں انھیں کیچڑ میں چلاتی ہوں۔ کبھی کبھی کسی کو پیٹ بھی دیتی ہوں۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ میرے ایک تھپڑ مار دے۔ انھیں روپے کی ہوس اور لالچ نے انھیں بزدل بنا دیا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں فوجی افسروں کی منہ چڑھی ہوں اور وہ مجھے تھپڑ مار کر انھیں ناراض نہیں کر سکتے۔ انھیں روپیہ کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی بہو بیٹیاں لا کر فوجی افسروں کے ہاتھ بیچ جاتے ہیں۔ تم سمندر کے راستے سے واپس مت جانا۔ ارکان روڈ سے ہو کر جانا۔ جٹ گاؤں یہاں سے اسی میل دور ہے۔ لیکن یہاں سے جٹ گاؤں تک تین لاکھ کسان عورتیں ہیں جو میری طرح پیشہ کر رہی ہیں اور ان کی کمائی بھدر لوک کھا رہے ہیں۔ تم بھدر لوک نہیں ہو اس لئے میری بات سمجھ جاؤ گے۔ وہ کہتے ہیں چہرو ماجھی بدمعاش ہے۔ چہرو ماجھی آوارہ ہے۔ چہرو ماجھی بیسوا ہے لیکن بھدر لوک مجھ سے زیادہ بدمعاش ہیں، مجھ سے زیادہ آوارہ ہیں۔ وہ سب بیسوا ہیں۔ دلال ہیں۔ ان کی عزت ان کا مذہب، ان کا دیوتا، سب کچھ روپیہ ہے اس کے لئے وہ اپنی ماؤں کو بیچ ڈالیں۔ اپنی بیٹیوں کو بیچ ڈالیں۔ ان کی عزت اور شرافت صرف ان کے سفید کپڑوں میں ہے۔ کیا بمبئی میں بھی بھدر لوگ ہوتے ہیں؟"

"بھدر لوک ہر جگہ ہوتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان سے بڑی نفرت ہے" وہ بڑبڑائی۔

سورج کی کرنیں بہت تیز ہو گئی تھیں اور چہرو ماجھی کے گندمی رنگ چہرے پر پسینے کے موتی چمک رہے تھے۔ سمندر کی موجیں اس کے قدم چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جیسے کوئی غنودگی کے عالم میں باتیں کر رہا ہو۔ زیر لب آہستہ آہستہ کہا:۔

"جب یہاں سے جانا تو گنیش سے کہہ دینا کہ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔"

۵۔ جنگ کا خاتمہ

جشن یہ حوّا کا ہے، یہ سرخوشی آدم کی ہے
کارنامہ روس کا ہے فتح اک عالم کی ہے

کیفی اعظمی

کیفی اعظمی

فتح برلن

خنجروں کی باڑھ، تیغوں کی روانی ختم ہے
رہزنی، غارت گری، ایذا رسانی ختم ہے
آندھیوں کی، زلزلوں کی قہرمانی ختم ہے
زندگی پر حادثوں کی حکمرانی ختم ہے
ڈھل گئی شب صبح عشرت کا پیام آ ہی گیا
آفتاب ماسکو بالائے بام آ ہی گیا

فتح کا شعلہ لپک کر پھول برسانے لگا
سرخ پرچم سینۂ برلن پہ لہرانے لگا
ذرہ ذرہ مست ہو کر رقص فرمانے لگا
چہچہا اٹھی فضا سارا جہاں گانے لگا
پھینک کر فاشزم کا بار نحوست شان سے
آج لی دنیا نے پہلی سانس اطمینان سے

خار و خس کو تھی ہوس بڑھ کر گل تر توڑ لیں
جاں بلب مور و ملخ شاہیں کا شہپر توڑ لیں
کھوکھلی تاریکیاں اور ماہ و اختر توڑ لیں
سنگ پارے دامن دریا سے گوہر توڑ لیں
روند کر دشمن کی کشتی اور دریا بڑھ گیا
جرمنی پہ والگا کا سرخ پانی چڑھ گیا

ارتقا کی راہ میں سو جال پھیلائے گئے
سو جہنم گھات میں جنت کی بھڑکائے گئے
کتنے پتھر ساغر ہستی پہ برسائے گئے
کتنے بادل سامنے مہتاب کے آئے گئے
دب گئی آندھی بھی گھٹ کر رہ گیا طوفان بھی
لے لیا محنت کشوں نے آج کا میدان بھی

ہاں مبارک ہو انھیں یہ کامیابی یہ خوشی
بخش دی جن منچلوں نے زندگی کو زندگی
ان شہیدوں کو خبر کر دے کوئی اس عید کی
جن کی گاتی گنگناتی نوجوانی لٹ گئی

دہر میں بجتا ہے ڈنکا آج ان کے نام کا
سو گئے جو موڑ کر رخ گردشِ ایام کا

ہاں مبارک ہو انھیں یہ کامرانی یہ بہار
کر دیا فاشزم کا پرچم جنھوں نے تار تار
ان دلیروں کے گلے میں ڈال دو پھولوں کا ہار
بڑھ گیا جن کے عمل سے آدمیت کا وقار

اے عروسِ دہر کھل کر گنگنا لے جھوم لے
روحِ گیتی بڑھ کے استالن کے بازو چوم لے

کھیتیوں کو خرمنوں کو گلستانوں کو سلام
تج دیا سب کچھ جنھوں نے ان کسانوں کو سلام
ٹینکوں، گنوں، جہازوں، بادبانوں کو سلام
جن میں بم ڈھالے گئے ان کارخانوں کو سلام

اب کبھی ناکامیوں کا زخم بھر سکتا نہیں
اس طرح کچلا گیا فتنہ ابھر سکتا نہیں

کہہ دو جھومیں باغ و صحرا گنگنائیں آبشار
اب نہ لہرائیں گے شعلے اب نہ برسیں گے شرار
مٹ گیا نازی لٹیروں کا دو روزہ اقتدار
دوڑ جا جھلسے ہوئے کھیتوں پہ اے رنگِ بہار

ساتھ اپنے فتنہ گرفستوں کی دنیا لے گئے
جو شگوفوں کو کچلتے تھے کچل ڈالے گئے

کہہ دو دھو ڈالیں وہ مائیں مسکرا کر دل کے داغ
جل گئے تھے جن کے خرمن لٹ گئے تھے جن کے باغ
کہہ دو اب اٹھ کر جلائیں دیویاں گھی کے چراغ
مٹ گئے جو توڑتے پھرتے تھے عصمت کے ایاغ

زندگی پائے اجل پر جبہ سائی کر چکی
اہرمن کی نسل دنیا پر خدائی کر چکی

کہہ دو اہلِ علم پھر ذوقِ نظر پیدا کریں
پھر ادب کے پھول حکمت کے گہر پیدا کریں
تیرگی کے بطن سے نورِ سحر پیدا کریں
خامشی سے نغمہ، نغموں سے شرر پیدا کریں

جن کو چڑھ بیٹھی علم و حکمت سے ادب سے راگ سے
ہو گئے ٹھنڈے الجھ کر زندگی کی آگ سے

کہہ دو گونج اٹھے ترانوں سے دلِ ارض و سما
کہہ دو اترے چاندنی دمکے فضا مہکے ہوا
جگمگا اے روئے تہذیب و تمدن جگمگا
رقص کر اے روحِ مستقبل تھرک اے ارتقا

جشن یہ حوا کا ہے یہ سرخوشی آدم کی ہے
کارنامہ روس کا ہے فتح اک عالم کی ہے

کہہ دو چھلکے، کہہ دو برسے مست آنکھوں سے شراب
لہلہائیں عارضوں کے پھول ہاتھوں کے گلاب
آج سے آتش نوا گیتی اٹھا دے [illegible] مسکرائے حسن لہرائے عشق، جاگ اٹھے شباب

مضطرب شاعر بھی عنوان طرب پا ہی گیا
کم سے کم آج ایک پہلو تو قرار آ ہی گیا

جاں نثار اختر

سرخ ستارا

تاریک افق کے ماتھے سے صدیوں کی سیاہی چھوٹ گئی لو سرخ سویرا چونک اٹھا لو سانس بھی شب کی ٹوٹ گئی
لو صبح کی پو بھی پھوٹ گئی
لو سرخ ستارا جاگ اٹھا

موجوں نے کوئی کروٹ بدلی، ساحل کے کنارے جاگ گئے دریا کے اندھیرے سینے میں سوئے ہوئے دھارے جاگ گئے
طوفاں کے نظارے جاگ گئے
لو سرخ ستارا جاگ اٹھا

ظالم کا سفینہ ڈوب گیا خوں نابہ فشاں طغیانوں میں مظلوم کی کشتی تیر گئی ان سرخ و سپید طوفانوں میں
سیلاب اٹھا ارمانوں میں
لو سرخ ستارہ جاگ اٹھا

اک خون سا برسا دولت کے گلپوش حسیں کاشانوں پر اک آگ سی بہکی صہبا میں ڈوبے ہوئے عشرت خانوں میں
اک برق گری ایوانوں پر
لو سرخ ستارا جاگ اٹھا

صدیوں سے سلگتے آدم کا وہ سوز دروں افسانہ ہوا ابلیس کا جادو ٹوٹ گیا۔ شیطاں کا فسوں افسانہ ہوا
وہ دور جنوں افسانہ ہوا
لو سرخ ستارا جاگ اٹھا

افلاس کی بے رنگ انکھوں میں امید کی لالی چھانے لگی مزدور کے سادہ ماتھے پر گل رنگ شفق لہرانے لگی
رنگین کرن بل کھانے لگی
لو سرخ ستارا جاگ اٹھا

تاجوں کی ضیائیں خواب ہوئیں۔ محنت کی کلاہیں جاگ اٹھیں تقدیر کی ظلمت دور ہوئی تاریخ کی راہیں جاگ گئیں
خوابیدہ نگاہیں جاگ گئیں
لو سرخ ستارہ جاگ اٹھا

تخریب کا بربط ٹوٹ گیا۔ تعمیر کا پرچم لہرایا احساس کی دنیا جھوم اٹھی جذبات کا عالم لہرا

لو زیست کا پرچم لہرایا
لو سرخ ستارا جاگ اٹھا

اک اور تفارا جاگ گیا اک اور سماں پیدا ہوا   اک اور زمیں اک اور فلک اک اور جہاں پیدا ہوا
گل رنگ نشاں پیدا ہوا
لو سرخ ستارا جاگ اٹھا

سردار جعفری

فتح برلن اور ہندستان

دل غلامی میں سکوں کا لطف پاتا ہی نہیں   کوئی غنچہ آرزو کا مسکراتا ہی نہیں
کچھ ہے ایسا درد پہلو میں کہ جاتا ہی نہیں   اب خوشی کا سانس سینے میں سماتا ہی نہیں
کیا کشش ہے فتح برلن کے سنہرے راگ میں
غم کا خرمن جل رہا ہے اس خوشی کی آگ میں

سرخ پرچم کی ہوا سے شوق لہرانے لگا   دست استالن میں ٹوٹا ساز بھی گانے لگا
ذرہ آغوش ہوا میں جا کے اترانے لگا   پست ہمت ولولوں کو بھی جلال آنے لگا
ڈوبتی کشتی کو بھی آخر کنارا مل گیا
ظلم کے مارے ہوئے دل کو سہارا مل گیا

پار لگ جائے گی اب مظلوم انسانوں کی ناؤ   حریت کی سمت ہے دنیا کے دھارے کا بہاؤ
وقت کے نازک ترازو میں ہے جمہوری جھکاؤ   پڑ رہا ہے آج کے مقیاس پر کل کا دباؤ
شمع جو لینن نے روشن کی تھی بزم روس میں
جل رہی ہے ارتقا کے احمریں فانوس میں

موت کے مسکن پہ جھپٹے زندگی کے پاسبان   شب کے سینے میں در آئے صبح نو کے ترجمان
گر گئی کٹ کر شہیدوں کے گلے سے ریسمان   لے کے انگڑائی اٹھی مرقد سے روح تعامان
گلشن ویبر میں گلہائے طرب کھلنے لگے
سینہ چاکان چمن ہنس کر گلے ملنے لگے

سرخ توپوں سے شرر نکلے ستارے بن گئے   بم کے گولے آسماں پر ماہ پارے بن گئے
یوں غبار اٹھا کہ کچھ رنگیں غبارے بن گئے   ہمہمے شیروں کے موسیقی کے دھارے بن گئے
بربریت کے دل وحشی کو دہلاتے ہوئے
آ گئے علم و ہنر کا نور برساتے ہوئے

ختم آخر ہو گیا فاشزم کا پر ہول خواب — چونک اٹھی نیند سے پیرس کی ارض انقلاب
رومتہ الکبریٰ پہ چمکا حریت کا آفتاب — آج ہے یونان کے ہاتھوں میں ہومر کا رباب
روس کے محنت کشوں نے کام پورا کر دیا
فتح کے پھولوں سے اک دنیا کا دامن بھر دیا

اب نہ آئیں گے بھری محفل میں زہر آلود جام — صبح کے زریں سراپا پر نہ منڈلائے گی شام
اب نہ دھوکا کھائیں گے سرمایہ داروں کا عوام — تیرگی اب اڑ کے جا سکتی نہیں بالائے بام
کوئی اب اڑتے شرارے کو دبا سکتا نہیں
کوئی بادل سرخ تارے کو چھپا سکتا نہیں

جاگ اٹھے کوہ و صحرا ناچ اٹھے آبشار — ہو گئے بیدار شام و نجد و ایران و تتار
چین کا خونی افق بھی بن گیا ہے لالہ زار — کیوں نہیں ہے ہند کے اجڑے گلستاں میں بہار؟
ساز قبض کرتے ہیں گلچیں سر سے سر جوڑے ہوئے
باغباں بیٹھے ہیں اک مدت سے منہ موڑے ہوئے

مژدہ اے جوش حمیت، تہنیت اے جوش جنگ — اور بھی اونچی ہوا اے بیتاب سینے کی امنگ
موجۂ راوی سے ہم آغوش ہوا ہے موج گنگ — ہو گیا ہے عرصۂ ہستی ملوکیت پہ تنگ
اب نہیں ہے کوئی گہرا رنگ اس تصویر میں
چند کڑیاں رہ گئی ہیں ظلم کی زنجیر میں

اٹھ گیا ہٹلر کے ساتھ اہل ضرر کا اقتدار — آج سے چنگیزیت کا نخل ہے بے برگ و بار
ہو چکا ہے سرد شعلہ بجھتے جاتے ہیں شرار — ہند کی گردن پہ ہے شاہی کا دست رعشہ دار
ایک ہی ہلکے سے جھٹکے میں کلائی موڑ دے
اے مجاہد سامراجی انگلیوں کو توڑ دے

مٹ چکی ہے اس کی طاقت اڑ چکے ہیں اس کے ہوش — ہو چکا ہے بند اس منحوس سینے کا خروش
اس سمندر میں نہ لہریں ہیں نہ طوفاں ہے نہ جوش — اب ابد تک اس کے ہنگاموں کی دنیا ہے خموش
دور خاص آخر ہوا اب دور عام آنے کو ہے
جس سے سب سیراب ہو جائیں وہ جام آنے کو ہے

اے زمیں اے آسماں اے آفتاب اے ماہتاب — اے جلال عصر حاضر اے ہوائے انقلاب
اے مقدس وید اے انجیل اے ام الکتاب — آج پورا ہو رہا ہے عظمت انساں کا خواب
اک نئی جنت میں اب آدم کو گھر مل جائے گا
سیکڑوں صدیوں کی محنت کا ثمر مل جائے گا

کرشن چندر

بھوت

بارش ہو رہی تھی۔ گزشتہ پانچ روز سے متواتر موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔ بادلوں کا رنگ دھواں دھواں تھا، اور زمین مخمل کی پانی میں بھیگی ہوئی سبز مخمل جس پر پاؤں پھسلتے تھے، اور پانی کے بلبلے بنتے اور پھٹتے تھے۔ فضا میں گرتی ہوئی بوندوں کا اندوہناک شور تھا۔ اور سڑی ہوئی مٹی کی باس۔ مینڈک پانی کی وقتی جھیلوں میں ٹراتے تھے۔ ایک بہت بڑا بھودے رنگ کا مینڈک ان کے سامنے سے پھدکتا اور ریل کی پٹری کو پار کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ سگنل والے کی کوٹھری کے پاس ایک بھینس چر رہی تھی۔ مینڈک اس کے پاؤں تلے آگیا۔ حادثہ، اتفاق۔ خدا کسی کو کیا کہیے، زندگی، موت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

گاڑی آنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ اس نے ٹکٹ خریدا، چھاتا کھولا، چنے والے سے چنے کھائے، اخبار پڑھا، بوٹ پر پالش کروایا۔ سر کھجایا۔ اٹھ کر ٹہلا۔ ٹہل کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مضافاتی اسٹیشن تھا۔ بمبئی سے انیس میل دور۔ اور یہ انیس میل اس وقت ہزاروں میل معلوم ہو رہے تھے پلیٹ فارم کی گھڑی کی سوئیاں گویا مدت سے ساکن تھیں۔ شاید یہ کمبخت بھی گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں۔ اس نے جمائی لی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی خوبصورت عورت بھی تو نہ تھی: نگاہ کہیں نہیں رکتی۔ لوہے کے زنگ آلود تاروں پر کوّے ٹھٹھر رہے تھے۔ نم آلود بنچوں پر کائنات کی بدصورت ترین مخلوق بیٹھی ہوئی پان کی جگالی کر رہی تھی۔ مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ رانیں کھجلا رہی تھی۔ چنے کی خشک دال میں کاندہ، نمک اور سرخ مرچ، نیبو کا رس ڈال کر اپنے دانتوں کی چکی تلے پیس رہی تھی۔ اور بار بار آنکھیں جھپک کر ریل کی چمکتی ہوئی لائن دیکھنے میں مصروف تھی۔ . . . گاڑی . . کہیں کوئی گاڑی نہ تھی۔ ریل کی چمکتی ہوئی پٹری دور فضا میں گم ہو رہی تھی۔ اور پانی برس رہا تھا اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔

اگر وہ پانچ منٹ پہلے آجاتا تو پوری دلی سے آنے والی گاڑی پر سوار ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب چھ بج چکے تھے۔ اور اسے دوسری گاڑی کا انتظار تھا۔ جو پونے سات بجے آئے گی۔ اس نے چھاتا الٹا کر اسٹیشن کے ایک کھمبے سے لگا دیا۔ اور قریب ہی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا: "فرسٹ اور سکنڈ کلاس کی عورتوں کے لئے"، اوّل تو اسے پلیٹ فارم پر پہلے اور دوسرے درجہ کی ایک عورت بھی نظر نہ آئی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کے بنچوں پر عورتیں اور عورتوں کے بنچ پر مرد بیٹھتے تھے۔ اس نے سوچا اس مرد میں بھی کس قدر ذم کا پہلو نمایاں ہے۔ لیکن کمبخت اسٹیشن ماسٹر کو اپنی پتلون کی نوک پلک درست کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ پلیٹ فارم کا اخلاق کیسے سمجھ سکتا ہے۔ چھاتے کی دراز کمانیوں سے پانی ٹپ ٹپ گر کے بہہ رہا تھا۔ اور فرش پر بہتا ہوا کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ ناگری کے حروف، اردو کے حروف، گیدڑ کا منہ۔ شیر کے ایال۔ جناح کا چہرہ۔ گاندھی کا جبڑہ۔ چرچل کا سگار۔ مندر کی تکونی چھت۔ جو دیکھتے دیکھتے مسجد کے گنبد میں تبدیل ہو گئی۔ اور پھر گاتھک گرجا کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ اور پھر ایک عالیشان محل کا کھنڈر بن گئی قطرہ قطرہ کرکے پانی بہہ رہا تھا۔ اور ایک ہی قلم کی نوک سے مختلف زبانیں تہذیبیں، شخصیتیں اور مذاہب ایجاد کرتا چلا جا رہا تھا۔ اب چھاتے کی مڑی ہوئی تیلی کے نیچے بہت سا پانی جمع ہو کر ایک چھوٹی سی جھیل بن گیا۔ وہ منبع تھا تو یہ منزل ہے۔ اس نے سوچا جہاں سب تہذیبیں اور کلچر اور شخصیتیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ پانی بھی خوب چیز ہے صاحب! ہندو پانی، مسلم پانی، اور پھر —— چھاتے کا پانی —— گاڑی ابھی نہیں آئی تھی

ملاڈ سے چرچ گیٹ جانے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوگا۔ اس خیال سے اس کی کنپٹیاں دکھنے لگیں۔ اور اسے اسپرو کے پیکٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ملاڈ تو ایک ذلیل مضافاتی اسٹیشن تھا۔ یہاں اسپرو تو کیا جنجر کی بوتل بھی مہیا نہ ہو سکتی تھی۔ جنجر کی بوتل سے اس کے سر کا درد کیسے دور ہوتا لیکن وہ جنجر کی بوتل ضرور پینا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ملاڈ اسٹیشن سے فوراً رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کی فضا میں برستی ہوئی بارش کی اداسی

تھی اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔ اور غلیظ کوّے زنگ آلود تاروں پر بیٹھے ہوئے اپنے ناپاک جسموں کو اپنی کالی کالی چونچوں سے صاف کر رہے تھے اور گندے امیر و کبیر بار وارڈ کی دھوتیوں سے جوئیں چننے میں مصروف تھے اور مٹیالی مٹیالی عورتوں نے ایک ہی قسم کے پھول ایک ہی طرح پر اپنے جوڑوں میں لگا رکھے تھے۔ ان میں سے مانگ نکال کر اپنے بالوں میں کھوپرے کا تیل لگا کر بعض پالش کئے ہوئے بوٹ کی طرح چمکا یا ہوا تھا۔ اور وہ سیدھی مانگ دور سے بالکل ریل کی پٹری معلوم ہو رہی تھی۔ اور گاڑی ابھی تک نہ آئی تھی۔ عورت اور ریل کی پٹری میں کیا فرق ہے۔ اس نے سوچا ریل کی پٹری کئی اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے عورت صرف ایک اسٹیشن پر اور اگر ایک سے زیادہ اسٹیشن پر ٹھہرے تو عورت نہیں طوائف کہلاتی ہے۔ انتظار دونوں کے لئے کرنا پڑتا ہے اور جو مزا انتظار میں ہے وہ گاڑی پر چڑھنے میں نہیں۔ عورت تک پہونچنے کے لئے اس سے شادی کرنا پڑتی ہے اور گاڑی کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے اور جو لوگ بے ٹکٹ سفر کرتے ہیں وہ سماجی اعتبار سے بداخلاق سمجھے جاتے ہیں۔ گاڑی ہو یا عورت بے ٹکٹ سفر کرنے والے کو ہر حالت میں سزا ملتی ہے۔ توبہ، توبہ کیسی بری بری باتیں سوچ رہا تھا۔ اور اس کے کنوارے جذبات خطرناک حد تک بداخلاقی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اب اسے ازدواجی زندگی کا ٹکٹ خریدنا ہی پڑے گا۔

اب گاڑی آ بھی چکے۔ اس نے پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی صرف دس منٹ گذرے تھے۔ صرف دس منٹ؟ اور وہ اپنی دانست میں کئی عمریں گذار چکا تھا۔ وہ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے میں آ گیا۔ پھر اپنے بچپن کے سہانے خوابوں کی سمت لوٹ چلا تھا۔ لیکن گاڑی پھر بھی نہ آئی اور ابھی صرف دس منٹ گذرے تھے۔ اس نے پالش والے لڑکے کو آواز دی۔ اے او لڑکے پالش والے۔

پالش والا لونڈا ایک نتھنے میں انگلی ڈال کر گنگنے الفاظ میں بولا۔ "صاحب ابھی تو ترا بوٹ پالش کیا ہے"

"کوئی ہرج نہیں اسے پھر پالش سے اچھی طرح چمکا دے۔ دیکھ اب کے اچھی طرح پالش کیجیو دو آنے دوں گا"

پالش والے نے اس کے پاؤں اپنی پھٹی ہوئی نیکر پر رکھ لئے۔ نیکر جو کبھی خاکی رنگ کی تھی لیکن اب جگہ جگہ سے پھٹ کر بے رنگ ہو چکی تھی۔ پالش والے کی ٹانگوں پر چھوٹے چھوٹے بے شمار زخم اور پھنسیاں تھیں۔ اس کے ننگے پاؤں میں بیائیاں پھوٹ آئی تھیں۔ اور اس کی ناک سے نزلہ سڑ سڑ کر کے بہتا تھا لیکن پالش والا لونڈا بھی بڑا ہوشیار تھا۔ وہ اپنے بہتے ہوئے نزلے کو ایک ہی بار سانس کھینچ کر فوراً ناک کے اندر لے جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نزلہ پھر اس کے نتھنوں سے بہنا شروع ہو جاتا۔ وہ سوچتا کہ اب گرا۔ یہ نزلہ میرے بوٹ پر اب گرا۔ لیکن پالش والا لونڈا بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے پھر زور سے سانس لے کر نزلہ کے لعاب کو ناک کے اندر کھینچ لیا۔ اور برش کو زور زور سے بوٹ پر رگڑنے لگا۔ گاڑی پھر بھی نہ آئی۔ شاید یہ گاڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اس نے پالش والے سے کہا بوٹ کے تسمے کھول دو، اور بوٹ الگ لے جا کر پالش کرو، اس نے سوچا چلو تسمے کھولنے ہی میں کچھ وقت صرف ہوگا۔

گاڑی ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ پلیٹ فارم کی گھڑی اس قدر سست کیوں ہے۔ بارش اس طرح کیوں برس رہی ہے۔ کیا یہ اب کبھی نہیں رکے گی۔ ریلوے والوں نے فرسٹ اور سکنڈ کلاس کے بنچوں کے سامنے کھپریل لگا دئے تھے۔ پردے کے لئے نہیں۔ بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے وہ ریلوے کا تہہ دل سے شکر گذار تھا۔ لیکن اسے اس وقت کھپریل کی نہیں۔ ایک گاڑی کی سخت ضرورت تھی۔ جو اسے چند لمحوں میں ملاڈ سے چرچ گیٹ پہنچا دے جہاں اس کی محبوبہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

چرچ گیٹ پر اس کی راہ تک رہی ہے اور وہ ملاڈ میں لکڑی کے ایک گلے سڑے بوسیدہ بنچ پر بیٹھا اپنے جوتوں پر پالش کرا رہا ہے اور پالش والے لونڈے کی ناک سے بہتا ہوا نزلہ دیکھ کر خودکشی پر آمادہ ہو رہا ہے۔ گاڑی نہیں آئی۔ ضرور کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ کوئی کھمبا گرا ہوگا۔ آزادی پسندوں نے پٹری توڑ دی ہوگی۔ ریل الٹ گئی ہوگی۔ یہ گھڑی غلط ہوگی۔ بجلی کے تار فیل ہو گئے ہوں گے۔ سگنل نہ ملا ہوگا۔ راستے میں پل طوفان سے اڑ گیا ہوگا۔ سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گاڑی کے سر سے گذر گیا ہوگا۔ ورنہ گاڑی ابھی تک آ گئی ہوتی۔

آج فتح کی خوشی میں وہ چرچ گیٹ جا رہا تھا۔ جہاں نیلا ریشمی سایہ پہنے اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ

آج اس نے وہی نیلا ریشمی سایہ پہنا ہوگا۔ جو اسے بہت پسند ہے۔ اور جس کے دام بھی اس نے درزی کو ادا نہیں کئے۔ کانوں میں الکٹرو پلیٹڈ نکل کے آویزے ہوں گے۔ بڑے بڑے ہلالی آویزے، عید کے چاند کی طرح خوبصورت اور ان آویزوں کے بیچ میں موتی لٹکے ہوں گے۔ موتی؛ آبدار موتی، ویکدار موتی، چمکدار موتی۔ طرح دار موتی۔ . . . . ایں۔ اس نے اپنے الجھے ہوئے تصور میں آویزوں کو بازاری کتابوں کے ناموں سے کیوں گڈمڈ کر دیا تھا اس کی محبوبہ تو بازاری نہ تھی۔ بے حد شریف لڑکی۔ نیلا سایہ اور سفید سینڈل پہننے والی لڑکی، گورے گورے چکنے رخساروں والی۔ ہنس ہنس کر اتر ہنانے والی لڑکی اور پھر پیچھے مڑ کر راہ گیر کی تفریحی نگاہوں سے خراج وصول کرنے والی بے حد شریف کنواری لڑکی۔ پڑھی لکھی خاندانی لڑکی، چرچ گیٹ پر اس کا انتظار کر رہی تھی اور گاڑی ابھی آئی نہ تھی۔ اور آج فتح کا دن تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی تھی۔ اور دنیا نے امن و چین کا سانس لیا تھا۔ جرمنی —— اور پھر جاپان شکست خوردہ ہو کر بیٹھ رہے (ڈال چکے تھے) اور اس کی محبوبہ نے نیلا ریشمی سایہ پہنا تھا۔ جس میں اس کا چھریرا نازک متناسب جسم کنواری بہاروں کی طرح شگفتہ و شاداب نظر آتا تھا۔ دنیا میں بہار آگئی تھی۔ اور وہ ملاڈ میں جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔

آج گاڑی نہیں آئے گی۔ آج وہ فتح کا جشن نہیں منا سکے گا۔ امن کی مسرتوں میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ فورٹ ایریا میں گھومتی ہوئی قمقموں سے جگمگاتی ہوئی سڑکوں کی روشنی نہ دیکھ سکے گا۔ ڈیموکراسی کے سپاہیوں کو جام پہ جام لنڈھاتے اور ابدی امن کے ترانے گاتے نہ سن سکے گا۔ ناچ گھر میں نیلے سایہ کے محور کے گرد طواف نہ کر سکے گا۔ جوہو کے ساحل کی ریشمی ریت پر لٹا کر اس کے ہونٹ نہ چوم سکے گا۔ بس آج وہ جوتے پالش کرائے گا۔ اور ناک سے بہتے ہوئے نزلے کو اندر سے باہر اور باہر سے اندر جاتے ہوئے دیکھتا رہے گا۔ اور اس کی محبوبہ ناامید ہو کر واپس چلی جائے گی۔ اور قمقمے بجھ جائیں گے اور بھیگی بھیگی گھاس پر مینڈک ٹراتے رہیں گے۔ اور لاپرواہ بھینسوں کے پاؤں تلے کچلے اور مسلے جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے اب اس کا دل مسلا اور کچلا جا رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی نہیں آئی تھی —— فرط یاس سے مغلوب ہو کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے اس کی نگاہ ایک ٹوکرے پر پڑی جو اب اس کے قدموں کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا جو ابھی ابھی یہاں رکھا گیا تھا۔ اس ٹوکرے میں مچھلیاں تھیں۔ سمندری مچھلیاں۔ موٹی، پتلی، الٹی، سیدھی۔ چھوٹی، بڑی، ہر قسم کی مچھلیاں، —— اور اس ٹوکرے کے پاس ایک نیم برہنہ انسان بیٹھا تھا۔ جس نے تاڑی پی رکھی تھی اور جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔ اس کا سیاہ گٹھا ہوا جسم خوبصورت تھا۔ دانت مضبوط اور سپید دھڑ سے اوپر ننگا۔ پاؤں ننگے، آدھی رانیں بھی ننگی۔ صرف کمر کے اوپر کسی پرانی دھوتی کا چیتھڑا تھا۔ گیلا۔ تپلا۔ بارش کے پانی سے شفاف ہو گیا تھا۔ کیڑا نہ تھا۔ اک آئینہ تھا جس میں انسانیت کا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ ماہی گیر نہ تھا اس کے خد و خال بھیلوں کے سے تھے۔ آنکھوں میں جنگلی وحشت تھی۔ بازوؤں میں ایک کی ہوئی جابر توانائی۔ اعضا میں اک لچک، لوچ اور گٹھلاوٹ، جیسے وہ کسی مہذب بستی کا انسان نہ تھا جنگل کا خوبصورت جانور تھا۔ اور مچھلیاں پکڑ کر لایا تھا۔ اور تاڑی پی کر ہنس رہا تھا۔

قریب ہی اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ وہ بھی نیم برہنہ تھی۔ اور ایک نحیف و نزار بچے کو اپنے گود میں لئے ہوئے۔ اور اپنے تندرست تھنوں سے اسے دودھ پلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں اپنی ناکامی کا ماتم بھی کرتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی اس کے ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی۔ اور وہ ایک بچے کی طرح تھی جس کا عزیز ترین کھلونا اس سے چھینا جا رہا ہو۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا نحیف و نزار بیمار بچہ تڑپتے تڑپتے کر رہا تھا۔ اور اس کا دم الٹ رہا تھا۔ اور پلیٹ فارم کا فرش غلیظ ہو گیا تھا۔ اور بچے کی گردن ایک طرف جھک گئی تھی۔ اور وہ بھی یہ سب دیکھ کر بھی ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور اس نے تاڑی پی رکھی تھی۔

بچے نے پھڑکنے کی اور وہ لڑکی زور زور سے چلانے لگی۔ اور بھیل اسے پیٹنے لگا۔ اور لڑکی نے ساگ کا گٹھا بھیل کے سر پر دے مارا اور لوگ ہنسنے لگے۔ اور پھر وہ بھیل خود بھی ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی جیسے وہ آدمی نہیں تھا۔ پاگل تھا۔ ایسی بھی کیا ہنسی۔ مانا کہ آج جشن آزادی ہے، جشن فتح، آج دنیا کو

فاشیت کے جنگل سے نجات ملی ہے اور ہندستان کا ہر ہوٹل مسرت کے نغمے گا رہا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یوں بے سوچے سمجھے تاڑی پی کر نہا جائے
چھوٹے بچے کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور وہ نیم برہنہ بھیلنی بیٹھی ہوئی اپنی پھٹی ہوئی دھوتی سے اس کی نئی صاف کر رہی تھی اور پولس مین اسے اس طرح غلاظت پھیلانے پر گالیاں دے رہا تھا اور اس کے پستان ننگے تھے اس کی باہیں ننگی تھیں اور کاٹن مارکیٹ میں کروروں من روئی کے انبار لگے تھے ۔ اور اس کا پیٹ ننگا تھا ۔ اور اس پر ایک خوفناک ناگ کی تصویر کھدی ہوئی تھی ۔ اور اس کی باہوں پر بھی خوفناک دیوتاؤں کی سبز تصاویر کھدی تھیں ۔ سٹاک ایکسچینج میں سونے چاندی اور روئی کا بھاؤ گر رہا تھا ۔ لیکن وہ نیم برہنہ تھی ۔ اور اس کی ننگی باہوں میں لکڑی کے موٹے کڑے تھے ۔ سونے کے نہیں چاندی کے نہیں ۔ پیتل یا تانبے کے بھی نہیں صرف لکڑی کے اور ٹخنوں پر پائل کی تصویر کھدی تھی ۔ کیونکہ جب عورت کو زیور نہ ملے تو وہ اس کی تصویر دیکھ کر ہی کیوں نہ خوش ہو . . . . . ؟

اس کا لڑکا اس کی گود میں دم توڑ رہا تھا ۔ اور وہ رو رہی تھی اور پولس مین اسے گالیاں دے رہا تھا اور اس کا خاوند تاڑی کے نشے میں دھت اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا ۔ وہ ننگا تھا ۔ اس کی بیوی ننگی تھی ۔ اور ان کے آنسو ننگے تھے ۔ اور ان کی ہنسی ننگی تھی کیونکہ بھیل سے اس کا جنگل چھن گیا تھا ۔ اس کا دیس چھن گیا تھا ۔ اس کے تیر و کمان چھن گئے تھے ۔ اب وہ اپنے گھر میں بے گھر تھا ۔ بے ہتھیار تھا ۔ بے علم تھا ۔ جنگل چھنا لیکن شہر نہ ملا ۔ جنگل کی چھال چھینی لیکن روئی نہ ملی ۔ تیر و کمان چھینے لیکن بندوق نہ ملی ۔ جڑی بوٹی چھینی ، لیکن دوا نہ ملی ۔ وہ تنہا تھا ۔ بے یار و مددگار تھا ۔ اور مچھلیوں کا ٹوکرا لئے پلیٹ فارم پر الٹی پالتی مارے بیٹھا تھا ۔ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے ۔ اس نئی دنیا میں جہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی ۔

اس کا جھولتا ہوا سر اور بھی جھولنے لگا ۔ اور ریل کے کھمبے کا سہارا لے کر اپنے پیٹ پر جھک گیا ۔ یکایک اس کی بیوی نے ایک چیخ کے ساتھ اپنے سر کو دوہتڑ سے پیٹ ڈالا ۔ کچھ بھی نہ ہوا تھا ۔ وہ بار بار نفرت کرنے والا غلیظ لڑکا اس دنیا سے چل بسا تھا ۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور وہ بے وقوف عورت بار بار اپنے جوان پستان اس کے مردہ ہونٹوں میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ اس لئے کہ اس کی ممتا کے پاس اپنے دودھ بھرے پستانوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا دوا کیا ہے ، کھانا کسے کہتے ہیں ، مکھن اور دودھ ، گلوکوس اور وٹامن اور کالرے کو روکنے والے انجکشن اور ڈاکٹر لوگ یہ سب کہاں تھے ، اور کیا کر رہے تھے اسے کچھ معلوم نہ تھا ۔ ریشم کیا ہے ۔ سینڈل کیا ہے ۔ نیلا سایہ کیا ہے ۔ آرام کیا ہے ۔ کتاب کیا ہے ۔ علم کیا ہے ۔ تہذیب کیا ہے ۔ ہونٹ کیسے مسکراتے ہیں ۔ آنکھیں کیسے چمکتی ہیں ۔ سانس میں خوشبو کا تعطر کیسے پھیلتا چلا جاتا ہے اسے کچھ معلوم نہ تھا ۔ فتح کسے کہتے ہیں ۔ فاشزم ۔ ڈیموکریسی اور جنگ و امن میں کیا تفریق ہے ۔ اسے کچھ بھی تو معلوم نہ تھا ۔ وہ یکایک اپنے مردہ بچے کو لے کر کھڑی ہو گئی ۔ چکنے ہوئے بالوں والی عورتوں سے جوئیں چننے والے امیر و کبیر مارواڑی سے سیٹی بجانے اور اپنی بیلوں کی نوک پلک سنوارتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر سے اس کی حیران پھٹی پھٹی نگاہیں کچھ کہہ رہی تھیں ۔ اس کے چمکدار بوٹ کی نوک سے کچھ پوچھ رہی تھیں اور جب کہیں بھی انہیں اپنے سوال کا جواب نہ ملا تو اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور ہراساں ہو کر زمین پر بیٹھ گئی ۔ جیسے اس نے اس ذلیل مضافاتی اسٹیشن پر آ دھمکنے کا نہیں چٹانوں کا منہ دیکھا تھا ۔

گاڑی اب دور سے نظر آ رہی تھی ۔ اور اس کا جوتا شفاف آئینے کی طرح چمک رہا تھا ۔ اور اس نے صاف ستھرے چمکتے ہوئے جوتے کی نوک سے جھولتے ہوئے بھیل کو ایک ٹھوکا دیا ۔ بھیل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ۔ گاڑی آ گئی ۔ بھیل نے اپنے سر پر مردہ مچھلیوں کا ٹوکرا رکھا ۔ بغل میں مردہ بچے کو دبایا ہاتھ سے سسکتی ہوئی بیوی کو پکڑا اور تھرڈ کے ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا ۔ اس کی نگاہوں میں وہی وحشت تھی ، لبوں پر وہی ہنسی ۔

اور ـــــ وہ ـــــ فرسٹ کلاس کے نرم گدیلے پر بیٹھ کر بھی ایک موہوم سا خطرہ محسوس کر رہا تھا ۔ اس کے بزدل ذہن میں لاکھوں کروڑوں ، ننگے بھوکے پیاسے بیمار آدمی ابھر رہے تھے ۔ گھستے چلے آ رہے تھے ۔ اس کے ذہن کے نرم نرم گداز گدیلوں پر بیٹھنے جا رہے تھے اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے ۔ یہ ہنسی کیا ہے ۔ یہ میرے گلے میں پھندا سا کیوں ہے ۔ یہ کس کے ہاتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں پھیلے پھیلے ٹیڑھے میڑھے بے

لمبے ہاتھ، سوکھے سکڑے سہمے سہمے ہاتھ، کمزور ہاتھ، قوی ہاتھ، بزدل ہاتھ، وحشی ہاتھ، دلیر ہاتھ، کالے ہاتھ گورے ہاتھ، پیلے ہاتھ، کرنجی بدنما ہاتھ۔ ہاتھ... جن پر زخموں کے نشان تھے۔ گولیوں کے نشان تھے۔۔۔ ہاتھ... جن پر انگلیاں نہ تھیں شکستہ بوڑھے ہاتھ... جن پر نیلی دھاریاں ابھری ہوئی تھیں۔ کانپتے ہوئے ٹھنٹھ، خوف سے لرزتے ہوئے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ جو ننگے تھے۔ اور خون آلود تھے۔ اور ناسوروں سے بھرے ہوئے تھے اور اس پر ہنس رہے تھے، ان کی خاموشی میں ایک مہیب گویائی تھی۔ ان کے تاریک سایوں میں ایک عجیب گونج تھی۔ کسی خوفناک طوفان کی گونج... اور یہ ہاتھ بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ آگے، اور آگے، قریب اور قریب...!

وہ چیخ مار کر صوفے پر سے اچھل پڑا۔ سامنے کی سیٹ پر ایک انگریز سپاہی اپنی سانولی محبوبہ سے جس نے ریشمی نیلا سایہ پہن رکھا تھا۔ انہماک محبت کر رہا تھا۔ انگریز سپاہی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا

"کیا بات ہے جانی؟ ڈر گئے تھے کیا؟

"ہاں میں واقعی ڈر گیا تھا" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کس سے؟"

"ابھی ابھی میں نے ایک بھوت دیکھا تھا"

"بھوت؟ اس گاڑی میں؟" سانولی نے پوچھا۔

"نانسنس"

"نہیں سچ کہتا ہوں بھوت تھا"

"کس کا بھوت تھا۔؟" اس نے اپنی محبوبہ کی ترشی ہوئی زلفوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"تیسری جنگ عظیم کا بھوت" اس نے رکتے رکتے کہا۔

انگریز سپاہی اور اس کی سانولی محبوبہ کے چہرے فق ہو گئے۔ ڈبے میں سناٹا چھا گیا۔ موت کا سا سکوت۔ جیسے اب وہاں کوئی نہ تھا اور اسے ایسا معلوم ہوا گویا ڈبے کے کسی کونے میں کھڑا ہوا وہ بھیل ابھی تک ہنس رہا ہے۔

چوتھا حصّہ

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک

۱۔ نیا ابال

۲۔ سامراجی چالیں اور ہندو مسلم فساد

۳۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء

۴۔ آزادی کی منزل

انیا بال

" یہ طوفان ہے طوفان اسے کون روکے گا . . .   .

. . .   یہ انقلاب ہے انقلاب اسے کون چھیڑے گا . . . . .

. . . یہ قمیص ہے قمیص . . .   . . . آدمی کی قمیص . . . . .

ہوا میں لہراتی ہوئی - اسے گولیوں سے چھلنی کر دو - اسے بموں اور ٹینکوں

سے اڑا دو - یہ پھر ثابت و سالم ہو جائے گی - یہ قمیص مر نہیں سکتی - یہ آدمی

کی روح ہے "

کرشن چندر

سردار جعفری

عہد نو

عہد نو آرہا ہے

راحتیں ، برکتیں ، لذتیں لا رہا ہے .

خاک کی کوکھ میں ، ان جنی کونپلیں ناچتی ہیں

کھیتیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں

گیہوں اور دھان کی نرم ناپیدا شاخیں

رنگ اور نور میں کھیلنے کے لئے مضطرب ہیں

خاک چلا رہی ہے کہ جاگیردار اور زمیندار نے اپنے

ناپاک قدموں سے مجھ کو نجس کر دیا ہے

خارزار اور بنجر زمینیں

کہہ رہی ہیں کہ گنگا کے پانی سے دھو دو ہمیں

پاک اور صاف کر دو ہمیں

تاکہ ہم اپنے مخمل کے پیراہنوں کو پہن کر

جشن صبح بہاراں منائیں .

اور دھرتی کے سینے میں کانوں کے اندر
کتنی دھاتیں ہیں جو کروٹیں لے رہی ہیں
ان کے جوہر میں جنبش ہے اور دل میں ارمان یہ ہے
کوئی آکر ہمیں قیدِ فطرت سے آزاد کر دے
ہم مشینوں کی صورت میں انسان کی خدمت کریں گے۔
ان کی آنکھوں میں اک خواب لہرا رہا ہے
ریشم اور سوت کے کارخانے
ابر کی طرح دھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے
ناچتی چرخیاں۔ گنگناتی ہوئی تکلیاں سیکڑوں
رنگ کے تانے بانے
جیسے سورج کی رنگین کرنیں
اپنی لاکھوں لچکتی ہوئی انگلیوں سے
آسمانوں پہ قوسِ قزح کی حسیں چادریں بن رہی ہوں

ملک سے سنگ اور خشت میں
سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں
کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں
کتنے دیوار و در کتنے مینار جو سنگِ مرمر کے سینے
میں سوئے ہوئے ہیں
جو عدم کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہیں
آج انسان کے دستِ تعمیر کے منتظر ہیں
کاش صناع و معمار انھیں ان کے خوابِ گراں سے جگا دیں
سنگ اور خشت کے ڈھیر کو قصر و ایواں بنا دیں
ہم اجنتا کے نقاش، بت گر، ایلورا کے معمار ہیں۔ تاج اور سیکری کے
ہم وہ صناع ہیں انگلیاں جن کی پتھر کو بھی
موم کر کے سبک اور حسین شکل میں ڈھالتی ہیں

لیکن ان انگلیوں کو
ڈیڑھ سو سال کی مفلسی اور غلامی
ڈیڑھ سو سال کی کوڑھ نے کھا لیا ہے

آج ہندوستاں جاگ اٹھا ہے
یہ چمن بوستاں جاگ اٹھا ہے
اس کی انسانیت اور روحانیت جاگ اٹھی ہے
بچے گہواروں سے رینگ کر آج باہر نکل آئے ہیں
اور انگریز سے اپنا کھویا ہوا بھولا پن مانگتے ہیں
عورتیں اپنی کھوئی ہوئی عصمتیں
مائیں بے آب سینوں کی شادابیاں مانگتی ہیں
دستکار اپنے مضبوط انگوٹھے
اور صناع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں
جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی
کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں

یہ چمن بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا
ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں
اور کچھ بھی نہیں
صرف جینے کا حق مانگتے ہیں
(نئی دنیا کو سلام کا ایک ٹکڑا)

کرشن چندر

تین گنڈے

اس کا نام عبدالصمد تھا۔ وہ بھنڈی بازار میں رہتا تھا۔ بعض اس لئے اسے بدرت سے لوگ گنڈے رے کہتے تھے۔

ہوگا۔ عبدالصمد بھی گنڈہ تھا۔ گو اس بیچارے کو زندگی بھر پتہ نہیں چلا کہ وہ ایک گنڈہ ہے ... ... ۔ بالعموم لوگوں کو اپنی زندگی کے بارے میں تھوڑا بہت معلوم رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ انھیں اچھا سمجھتے ہیں یا برا۔ وہ شریف ہیں یا بدمعاش، دونوں کو وہ بہت سمجھتے ہیں یا اپنی ہونے نرالی محبوبہ، وہ دیانت دار سمجھے جاتے ہیں یا جھوٹے، دروغ گو فسادی یا امن پسند، انھیں کچھ نہ کچھ پتہ چلتا رہتا ہے اپنے متعلق۔ لیکن بیچارے عبدالصمد کو آج تک کمر میں گولی لگنے تک پتہ نہ چلا کہ وہ ایک گنڈہ ہے اسے گولی کیسے لگی۔ یہ تو میں آپ کو بتاؤں گا۔ اس وقت میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ عبدالصمد ایک گنڈہ تھا جو سلطانی فائن آرٹ پرنٹنگ ورکس میں کام کرتا تھا جو وزیر ریسٹوران کے ایک سرخ اینٹوں والی دو منزلہ عمارت میں واقع ہے اور جس کے سامنے ٹرام کا اڈا ہے جو آج کل جل کر کوئلہ ہو چکا ہے۔ ہندستانی اور انگریزوں کی دیرینہ رقابت کی وجہ سے اس لڑائی میں ہندستانیوں کی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوا ہی لیکن بیچارے انگریزوں کے کئی ہزار کارتوس مفت پھنک گئے۔

عبدالصمد فائن آرٹ پریس میں ملازم تھا۔ لیتھو کے بھاری پتھر اٹھا کر مشین پر جماتا تھا۔ یہ اس کا کام تھا۔ دوسرے مزدور تو مشکل سے ایک پتھر ایک وقت میں اٹھا سکتے تھے۔ لیکن عبدالصمد کے کام کرنے کا انداز یہ تھا کہ پان کی پیک زور سے سامنے پھینک کے ایک موٹی سی گالی دے کر وہ بیک وقت دو پتھر اٹھا لیتا اور انھیں جان عزیز کی طرح سینے سے لگائے ہوئے منیجر کی میز کے پاس سے گذر کر مسکرا کر ایک آنکھ میچ کر دل ہی دل میں منیجر کو ایک موٹی سی گالی دے کر وہ دونوں پتھر مشینوں پر جمانے کے لئے جاتا اور ہنس کر مشین مین سے کہتا۔ لو بیٹا بھیکے اب قلفی جاؤ۔ مشین چلانے کو وہ قلفی جانا کہتا تھا۔ دراصل اس کی اپنی زبان تھی جس میں وہ زندگی کے اہم موضوعات پر گفتگو کیا کرتا۔ جب مالک پریس میں آتا تو چپکے چپکے مزدوروں سے کہتا ... ... تیسرا آیا تیسرا آیا دوڑنا۔ جب مالک نہ ہوتا اور منیجر زور سے چلانے لگتا تو کہتا کام کرو۔ کرو کام سور کی اولاد۔ دیکھتے نہیں ہو گیدڑ کی بیلی رو رہی ہے جب تنخواہ کا دن آتا تو کہتا "آج جھلمر نائیں گے"، اگر کسی مزدور کے دام کٹ جاتے تو بڑا سا منہ بنا کر کہتا۔ آج بیچارے کا چٹم بتا ہو گیا۔ چم بجا کس زبان کا لفظ تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس نے کہاں سے سیکھا تھا۔ اس امر کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ عبدالصمد کی زبان تھی۔ یہ اس کا مالک تھا۔ وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرتا۔ اسے کون روک سکتا تھا۔ زبان کے سلسلہ میں اسے سب سے زیادہ عبور ... گالیوں پر تھا۔ میں نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا کہ جو عبدالصمد سے بہتر گالی دے سکتا ہو۔ تیری ماں کے دودھ میں حکم کا یکہ۔ ایسی گالی کوئی شاعر ہی دے سکتا ہے۔ اور گالیوں کے سلسلہ میں عبدالصمد ایک شاعر تھا جس کا رنگ تھا۔ فصاحت و بلاغت کا بادشاہ تھا جب گالی دیتا تو اس کے انداز میں ایسی متانت ہوتی اور زبان اور بیان میں وہ روانی ہوتی کہ مجھے ہندوستان کے بہترین سیاست دان یاد آ جاتے جو اکثر باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں۔ لیکن عبدالصمد میں یہ خاص بات تھی کہ وہ باتیں بہت کم کرتا تو کام بھی بہت اچھا کرتا تھا۔ پریس کے منیجر کو وہ اپنی بدزبانی کی وجہ سے ناپسند تھا۔ لیکن کام اتنا اچھا کرتا تھا کہ وہ اسے پریس سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے اور ممکن ہے آپ نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہو کہ چلتے گنڈے ہوتے ہیں کام کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سب سے اچھے مزدور بھی گنڈے ہوتے ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ ہے نا۔ عبدالصمد ایک اچھا مزدور تھا۔ اور اگر اس میں بات بنانے گالی بکنے اور بلا وجہ لوگوں پر ہنسنے کی عادت نہ ہوتی وہ ایک اچھا آدمی بھی ہوتا۔ ہاں وہ ہر وقت پان کھاتا تھا جس سے اس کے بڑے بڑے دانت اور بھی کریہہ منظر معلوم ہوتے تھے۔ گالی بکنے میں اسے وہ کمال حاصل تھا کہ بڑے بڑے ادیبوں کو عمر بھر محنت کے بعد بھی وہ طرز انشا نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور ہنسی اس کی ہنسی سب سے بڑی تھی۔ پاٹ دار گونجدار بلند و بالا ہنسی۔ جو پریس کی تاریک عمارت میں اور خاص کر اس کے لئے قطعی طور پر ناموزوں تھی۔ پہاڑوں کی جہاں صنوبروں کے جنگل کھڑے ہیں وسیع میدانوں کی جہاں میلوں تک گیہوں کے کھیت کھڑے ہیں تاروں بھری رات کی جب سب سو جاتے ہیں اور رات کی رانی اس افق سے اس افق تک زلفیں پھیلائے سورج کی کرنوں کا انتظار کرتی ہے۔ یہ ہنسی جو گویا سمندر کا سینہ چیر کر نکلی تھی۔ وہ ساری دھرتی پر پھیلتی جا رہی تھی۔ انسان کی ہنسی نہیں کسی دیوتا کی ہنسی معلوم ہوتی تھی۔ کرخت، بری، گندی۔ ابھرتی ہوئی۔ بڑھتی ہوئی۔ ارض و سما کی وسعتوں کو آغوش میں لیتی ہوئی یہ ہنسی، پریس کی محدود چار دیواری کے لئے قطعی ناموزوں تھی۔ اس پر بھی عبدالصمد اکثر ہنستا رہتا تھا۔ گالی بکتا

رہتا تھا۔ اور منیجر کے سامنے لیتھو کے پتھر اٹھائے اکڑتا چلا جاتا تھا۔ گنڈا ـــــ

میں نے پہلی بار اسے فائن آرٹ پریس میں دیکھا تو ایک سخت کراہیت اور نفرت کا احساس میرے دل میں پیدا ہوا۔ جے۔ جے ہسپتال کے اسٹاف کے لوگ اک محفل رقص و سرود منعقد کرنا چاہتے تھے اور میں اس کنسرٹ کا پروگرام شائع کرانے کے لئے پریس میں آیا تھا۔ یہاں میں نے عبدالصمد کو پہلی بار دیکھا۔ آپ بڑے ٹھسے سے کمر پر ہاتھ رکھے فرما رہے تھے۔ وہ لیتھو کا پتھر مجھ سے ٹوٹ گیا منیجر صاحب!

"کیسے ٹوٹ گیا؟"

یہ کیسے بتاؤں بس ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ٹکڑے ہو گیا۔ دیکھئے اس مادر . . . . . پتھر کو آج ہی ٹوٹنا تھا۔ دو سال ہو گئے مجھے اس حرامی پریس میں کام کرتے ہوئے۔ دیکھئے کبھی ایسی واردات نہیں ہوئی۔ یہ کہہ کر آپ نے سر کھجایا اور سر سے ایک جوں نکال کر اسے اپنے ناخنوں کی چکی میں پیستے ہوئے بولے۔ بہت تیزی جوں کے منہ میں سور کے کباب۔

منیجر بولا :۔ سیدھی طرح بات کرو۔

سیدھی طرح تو کہہ رہا ہوں جناب منیجر صاحب! لیتھو کا پتھر ہم سے ٹوٹ گیا معافی چاہئے۔ یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ گویا معافی مانگنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے دانت اس کے مسوڑے بلکہ اس کا حلق اور تالو تک مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں ذرا پرے ہٹ گیا۔ کیونکہ اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی تھی۔ ہر گنڈے کے جسم سے بو آتی ہے۔ زمین کی بو پسینے کی بو اور پیاز کی بو آتی تھی۔ اور گو اس کا جسم بدبودار تھا۔ اس کا دل بدبودار نہ تھا جس طرح اس کی چھوٹی چھوٹی شربتی آنکھیں گھنے ابروؤں کے نیچے چمکتی تھیں۔ اس میں کوئی بدبو نہ تھی۔ دس تاریخ کو جب اسے تنخواہ ملتی اور منیجر صاحب کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتا۔ ایسی نگاہیں جس میں تشکر کے علاوہ حیرت ہوتی اور ایک ایسا جذبہ جیسے وہ نگاہ کہہ رہی ہے۔ تم منیجر نہیں ہے تو میرا بھائی ہے ہم دونوں انسان ہیں۔ اس جذبہ میں بھی کوئی بدبو نہ تھی اور اس کی مسکراہٹ غلیظ مسکراہٹ جس پر پریس کا مینیجر مشینوں کا آئل کھلا ہوا تھا۔ اس میں بھی کوئی بدبو نہ تھی لیکن اس کا جسم بدبودار تھا۔ اس کے مسوڑے غلیظ تھے۔ اس کی باہوں میں مچھلیاں پھولی ہوئی تھیں اور وہ گالی بکتا تھا۔ اور ہر وقت لڑائی کے لئے آمادہ رہتا تھا۔ وہ گنڈا تھا گنڈا، اور جب منیجر نے اسے اس طرح ہنستے ہوئے معافی مانگتے ہوئے دیکھا اور وہ بھی ایک غیر آدمی کے سامنے تو اس کے دل میں غیظ و غضب کا ایک طوفان امڈ آیا اور اس نے ہاتھ میں لکڑی کا رول لے کر میز پر زور سے مارا اور عبدالصمد کو بلند آواز میں گالی دے کر کہا۔ کہ وہ کبھی اس کا قصور معاف نہیں کرے گا۔ لیتھو کا پتھر بہت مہنگا ہے تمہیں معلوم نہیں ہے۔ یورپ سے آتا ہے جو جرمنی میں واقع ہے، تمہیں معلوم نہیں ہے اور آج کل بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے کیونکہ جرمنی کو اتحادیوں نے شکست دے دی ہے تمہیں معلوم نہیں ہے آج کل پتھر بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔

عبدالصمد نے جواب دیا۔ مجھے سب معلوم ہے۔ پتھر تو ہندوستان میں اتنے ہیں کہ ایک پوری فوج پتھر مار مار کر ہندوستان سے باہر نکالی جا سکتی ہے۔ پتھر تو ملتا ہے منیجر صاحب لیکن روٹی نہیں ملتی۔ گالی کے بے عزتی کے بغیر۔ منیجر صاحب! اور یہ تو آپ جانتے ہیں گالی دینے میں آپ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہہ کر عبدالصمد نے جو منیجر کی ماں کے دودھ میں حکم کا یکہ پھیرنا شروع کیا تو سارے پریس والے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ منیجر نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی۔ عبدالصمد نے کہا گھر رکھو اپنے پتھر، عبدالصمد عبدالصمد ہے۔ اس کا چیتھم پیٹا نہیں ہو سکتا۔ پتھر ٹوٹ گیا تو ہم کیا کریں اپنے چیتھم چیتڑ کاٹ کر رکھ دیں پریس میں۔ واہ منیجر صاحب اور اوپر سے گالی دیتے ہو ہم کام نہیں کریں گے کبھی کام نہیں کریں گے اس سالے پریس میں ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔ فوراً اسی وقت چلے جاتے ہیں۔ عبدالصمد اسی طرح بکتا جھکتا رہا۔ لیکن پریس چھوڑ کر نہیں گیا اس معاملے میں اس کی سیاست انگریزوں سے ملتی جلتی ہے جو ہمیشہ ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں لیکن کمبخت جاتے نہیں۔ خیر وہ خود نہیں گیا تو دوسرے روز منیجر نے پریس کے مالک سے کہہ سن کر عبدالصمد کو وہاں سے نکلوا دیا۔ یہ قیاد سے دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں

نے اگلے روز عبدالصمد کو دیکھا کہ سڑکوں پہ اور بھنڈی بازار کے مختلف راستوں پر اور دوسرے گنڈوں کے ساتھ مل کر واویلا کر رہا تھا اور ہڑتال کرا رہا تھا ایک جگہ مسٹر بندری گر جو مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر ہیں تقریر کر رہے تھے۔ ہمیں اس ہڑتال میں اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہئیے۔ یہ سب کانگرس کی شرارت ہے۔ تو اس وقت بھی عبدالصمد اور اس کے ساتھی ... ... گنڈوں نے شور مچا کر اس امن پسند لیڈر کی ایک نہ چلنے دی۔ اور جے ہند اور ہندستانی جہازی ہڑتال زندہ باد کے نعرے لگا لگا کر اسے جلسے سے باہر کر دیا اور پھر میں نے سنا کہ انھوں نے ہڑتال کی اور ٹرامیں اور ٹرام کے شیڈ جلا دئے اور ان تمام کاموں میں عبدالصمد بھی شامل تھا۔ لیکن ان باتوں کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ بندری گر کی میٹنگ کے بعد میں نے عبدالصمد کو جے جے ہسپتال میں دیکھا۔ گولی اس پیٹھ میں کمر کے پاس لگی تھی اور پیٹ پھاڑ کے باہر ہو گئی تھی۔ کمر کے پاس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جہاں گولی اندر داخل ہوئی تھی اور دوسری طرف پیٹ میں ایک بڑا زخم تھا۔ جو ہزاروں چھروں سے پیدا ہوا تھا۔ یہ کارتوس ڈم ڈم والی گولی والا کارتوس نہ تھا جو گذشتہ غدر میں استعمال کیا گیا تھا۔ یہ ایک نیا کارتوس تھا۔ نیا خوفناک جو جسم کے اندر جا کر پھیل جاتا ہے اور سیکڑوں چھوٹے چھوٹے زخم پیدا کر سکتا ہے۔ مارنے کو انسان کو یوں بھی ایک معمولی سے کارتوس سے مارا جا سکتا ہے۔ لیکن گنڈوں کے لئے اس قسم کا کارتوس ذرا اچھا رہتا ہے۔ ہمارے یہاں یہ کارتوس سور کے شکار کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خیر گنڈے تو سور سے بدتر ہوتے ہیں۔ اچھا ہوا عبدالصمد مر گیا۔

عبدالصمد مر گیا اور اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ عمر چوبیس سال، ذات راجپوت، مذہب مسلمان، غیر شادی شدہ، آنکھوں کی چمک مردہ، مردہ لبوں کی ہنسی مردہ، زندگی بخش اگالی مردہ۔ ہر چیز کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ اور وہ میرے سامنے ہاتھ پھیلائے منہ کھولے مردہ پڑا تھا۔ ایک طعنہ، ایک تاریک مستقبل، ایک خاموش گالی۔ اور اس کی ماں اپنی چھاتی اور دھڑ کوٹ رہی تھی۔ اور بین کر رہی تھی۔ اور ہسپتال کے باہر خیمے میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ میرے بیٹے نے ان ظالموں کا کیا بگاڑا تھا۔ میرا بیٹا کیوں مر گیا۔ کیوں گولی اسے لگی اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ . . . .

وہ تو گلی میں بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی اینگلو انڈین لڑکی کو بچانے کے لئے باہر نکلا تھا۔ کہ کسی نے اس کے پیٹھ میں گولی مار دی۔ لڑکی بچ گئی۔ لیکن میرا جوان ہونہار بیٹا، ڈاکٹر میرا بیٹا اس جہاں میں نہیں ہے۔ وہ کیوں مارا گیا۔ ڈاکٹر خدا کے لئے مجھے بتاؤ وہ کیوں مارا گیا۔

اس لئے کہ وہ ایک گنڈہ تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا اور اس کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا اور دوسری لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

(۲)

دوسرے گنڈے سے میری ملاقات ایک بنئے کے گھر پہ ہوئی سینڈھرسٹ روڈ جسے گنڈے سنڈاس روڈ کہتے ہیں۔ بڑے بڑے بنیوں کا مسکن ہے۔ یہیں پدم سی سیٹھ بھی رہتے ہیں۔ پدم سی سیٹھ جے جے ہسپتال کے ڈاکٹروں میں بہت مقبول ہیں۔ کیونکہ آپ سو روپیہ پر ایک سو بیس روپیہ سود لیتے ہیں اور سارا معاملہ نہایت خاموشی سے طے کرتے ہیں۔ پدم سی سیٹھ کا چہرہ بچوں کی طرح نظر آتا ہے۔ مسکراہٹ گھی میں چپڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور لب و لہجہ میں راشن کے باوجود اتنی شکر گھلی ہوئی ہے کہ چور بازار کا شبہ ہوتا ہے۔ پدم سی سیٹھ میرے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ اس لئے مجھے قرض کی اکثر حاجت رہتی ہے اور جو دوست مجھے روپیہ قرض نہ دے میں ذرا اسے دوست کم بناتا ہوں۔ اور پھر پدم سی سیٹھ کوئی زیادہ سود نہیں لگاتے، سو روپئے پر صرف ایک سو بیس روپے اور پھر وہ بھی بغیر ضمانت کے ــــــ اب بتائیے اس سے اچھا سودا ہندوستان سے باہر کہاں ہو سکتا ہے۔ آج بھی جب میں گنڈوں سے بچتا بچاتا سینڈھرسٹ روڈ پدم سی سیٹھ کے مکان پر پہونچا تو انھوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ وہ مجھے کبھی نہیں ٹالتے ہمیشہ روپیہ دے دیتے ہیں۔ یہ تو انھیں معلوم ہے کہ میں جے جے ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے اور روپیہ معہ سود ادا بھی کر دوں گا۔ انھیں میرے عشق کا پورا حال معلوم ہے۔ وہ اس نرس کو بھی جانتے ہیں جو اس قدر خوبصورت اور سانولی ہے کہ اس کے لئے ایک کنوارے نوجوان ڈاکٹر

کو ایک سو بیس روپے سیکڑہ سود دینا پڑتا ہے۔ ہندستان میں تو عشق بہت مہنگا ہے اور پھر خلاف قانون بھی سماج نے اور سیاست نے اور حکومت نے محبت کو خلاف قانون قرار دے رکھا ہے۔ آپ کسی انسان کو قتل کر سکتے ہیں مگر اس سے عشق نہیں کر سکتے، اگر آپ کسی لڑکی سے کہنا چاہیں، "مجھے تم سے محبت ہے" تو وہ فوراً جواب دیتی ہے "کیوں کیا تیرے گھر ماں بہن نہیں" گویا اس ملک میں عشق صرف ماں بہن تک محدود ہے اس کے بعد بھی اگر آدمی عشق کرنے کی جرأت کرے تو جوتی کھاتا ہے پٹتا ہے یا گولی کا شکار ہوتا ہے اس لئے کہ ہندستان محبت کرنے کی نہیں نفرت کرنے کی جگہ ہے۔ یہاں انسان انسان سے محبت نہیں کرتا ہے، نفرت کرتا ہے۔ لوگ حکومت سے، حکومت لوگوں سے، ماں باپ بیٹوں سے۔ بیٹے ماں باپ سے نفرت کرتے ہیں۔ گھر میں بازار میں، بازار میں، کارخانوں میں دفتروں میں نفرت کا راج ہے۔ کانگرسی، لیگی، سوشلسٹ ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ انھیں جتنی نفرت ایک دوسرے سے ہے اتنی اجنبی حکومت سے نہیں جس کے یہ سب غلام ہیں۔ ہندستان ایک صحرائے نفرت ہے۔ جس میں کہیں کہیں محبت کے نخلستان نظر آتے ہیں اور یہ نخلستان، نرسوں، دیہاتی لڑکیوں، فلم سٹاروں اور عدم تشدد کے حامیوں نے اگائے ہیں۔ چاروں طرف نفرت کی ریت ہے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے، شاید اس ملک کی آب و ہوا ہی ہے۔ بیچارے پدم سیٹھ بھی اسی آب و ہوا میں رہتے ہیں۔ اس لئے ہر ایک آدمی سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں۔ پدم سیٹھ دنیا میں ہر آدمی سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر اس نفرت میں کوئی شامل نہیں ہے تو وہ ان کی چھوٹی بیٹی شانتا ہے۔ شانتا ایک تیلی دبلی نو سال کی گجراتی لڑکی ہے جس کو خدا نے خوبصورتی دی ہے، موٹاپن، وہ تیلی تیلی ٹانگیں میلے فراک سے باہر نکلی ہوئی تیلی تیلی باہیں۔ سوکھا سوکھا منہ جیسے پیاس کبھی بجھی نہیں ہر وقت چلاتی رہتی ہے اور منہ میں مٹھائی ٹھونستی رہتی ہے۔ اس قدر پھوہڑ بد مذاق بدصورت لڑکی ہے کہ معاذ اللہ دیکھ کر متلی ہوتی ہے۔ مجھے ایک تو بچوں سے یوں ہی نفرت ہے۔ کمبخت جب دیکھو یوں ہی بلا سوچے سمجھے چلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کرسی پکڑ کر ہلاتے رہتے ہیں تو کبھی آپ کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہے ہیں۔ کبھی تھرمامیٹر پر ہاتھ مارتے ہیں تو کبھی دیوار پھاندنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر ایسی بچی جسے ایک پل قرار نہ ہو۔ جس کی آواز بھی تیز اور کرخت ہو اور جس کے لبوں سے ہر وقت جلیبی کی سی رال بہتی ہو اور جس کا باپ مجھ سے ایک سو بیس روپیہ سود لیتا ہو، آپ اس لڑکی سے میری محبت اور شفقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خیر تو اس روز جب میں وہاں پہنچا ہوں تو شانتا کمرے میں موجود تھی۔ ادھر ادھر ادھر اور اس کمرے سے اس کمرے اچھل رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ پدم سی سیٹھ نے ڈانٹا اور کہا جا دوسرے کمرے میں بیٹھ جا۔ دیکھتی نہیں ہے صاحب تشریف لائے ہیں تو شانتا منہ بسورتی ہوئی اور دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتی ہوئی اور شکایتی نگاہوں سے مجھے گھورتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ باپ نے اسے جاتے دیکھ کر پھر کہا "اور ہاں دیکھ باہر نہ جانا بیٹا۔ باہر دنگا ہے۔" پھر انھوں نے بھی کھوئی اور ریشم کی طرح ملائم آواز میں بولے "آپ کو کتنے روپے چاہئیں ڈاکٹر صاحب" میں نے کہا "آج تو میں اپنی آخری قسط ادا کرنے آیا ہوں۔ فی الحال مجھے روپے نہیں چاہئیں۔ کیونکہ نرس سے میری لڑائی ہو گئی ہے۔ اس لئے میرا عشق ختم سمجھئے۔" وہ ہنسے تو رسید کاٹ دوں؟ میں نے کہا ہاں لائیے میں بھی دستخط کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ رسید کاٹ دی گئی اور دستخط ہو گئے۔ اور اسٹامپ واپس مل گیا۔ پھر میں سگرٹ اور وہ بیڑی پینے لگے۔ اور ہونے لگیں جہاں بھر کی باتیں۔ روئی کا بھاؤ بند ہے اور سونے چاندی کا دھندا ہے اور اسٹاک ایکسچینج گندا ہے اور گلے میں انگریزوں کا پھندا ہے اور ہم تو ڈاکٹر صاحب رام آپ کا بھلا کرے بہت بری طرح پھنسے ہیں۔ یہ سٹرلنگ بیلنس۔ میں نے کہا جی ہاں یہ سٹرلنگ بیلنس تک ہی معاملہ رہتا تو غنیمت تھا۔ لیکن سیٹھ صاحب اسٹرلنگ بیلنس کی افیوں نے ایک اور مشق نکالی ہے۔ اسے CAROTID ART ERY کہتے ہیں۔ کیرانڈ آرٹری کیا ہے؟

"کیرانڈ آرٹری کے ساتھ اینٹی فی بین یو کا کائی جرمنی سائیڈیکل لنگ کے ساتھ میں اس کو ANTISE PTIC بھی کر دیا ہے"

"سیٹھ صاحب" باپ رے سیٹھ صاحب چونکے "تب تو معاملہ بہت بڑھا ہے"

میں نے کہا۔ جی ہاں انگریزی اخبار میں . . . . سب آیا ہے۔ آپ نے پڑھا نہیں۔

سیٹھ بولے :۔ جی نہیں ۔ میں تو جنم بھومی پڑھتا ہوں ۔ یہ تو اچھا ہوا آپ نے بتا دیا ۔ ایک تو یہ فساد شروع ہے ۔ جانے یوں نے ہڑتال کر رکھی ہے ۔ گنڈہ گردی ہو رہی ہے اور ادھر سے یہ اینٹی ٹیکس آپ نے بتا دیا ۔ میں تو صاحب چور بازار میں جتنا روپیہ لگا ہوا ہے سب نکلواتا ہوں ۔

اتنا کہہ کر سیٹھ صاحب نے کروٹ بدلی تو نیچے گلی میں کارتوس دغنے کی بار بار آواز آئی ۔ بولے ۔ دیکھا آپ نے ہڑتال کرنے سے یہ ہوتا ہے ۔ یہ گنڈے بدمعاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں ۔ کارخانے جلانا چاہتے ہیں ۔ شہر کو تباہ کرنا چاہتے ہیں ۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا ہے ۔ کلجگ

دھرم کا بیج نہیں رہا اس دھرتی پر ۔

میں نے کہا : آپ بالکل سچ کہتے ہیں ۔

اتنے میں پھر گولی چلنے کی آواز آئی ۔ اور گلی میں آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی ۔ اور بچوں کی چیخیں سنائی دیں ہم بھاگے بھاگے کھڑکی کی طرف گئے اور نیچے جھانک کر دیکھا تو یکایک سیٹھ نے چیخ ماری ۔ اور پھر دھڑ دھڑ سیڑھیاں نیچے اترنے لگے ۔ میں ان کے پیچھے آ رہا تھا ۔ کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی ۔ ہوا یہ تھا کہ گلی کے بچے پولیس والوں سے آنکھ مچولی کھیلتے تھے ۔ یہ لوگ چپکے گلی کے دوسرے کونے میں چلے جاتے اور وہاں سے پولیس والوں پر جے ہند کے نعرے کستے اور ان پر کنکر پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھینکتے اور جب پولیس والے ان کو ڈراتے اور ان کا تعاقب کرتے تو بچے بھاگ کے ہنستے کھیلتے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے گلی کے دوسرے نکڑ پر جا کھڑے ہوتے اور وہاں بھی اسی طرح پولیس والوں سے کھیل کھیلتے بڑا دلچسپ مشغلہ تھا ۔ اور یہ بچے دن بھر اسی طرح مصروف رکھتے تھے کوئی دوسرا ملک ہوتا تو ان بچوں کی یہ شرارت کھیل سے تعبیر کی جاتی ۔ زیادہ سے زیادہ ہوتا کہ پولس کا سپاہی کسی شریر بچے کے کان کھینچ دیتا ۔ دیکھ بیٹا آئندہ سے ایسا مت کیجو اور معاملہ وہیں ختم ہو جاتا ۔ لیکن یہاں تو باوا آدم ہی نرالا ہے ۔ اس ملک میں محبت نہیں نفرت کا راج ہے ۔ اس لئے پولس والوں نے ملٹری کو مدد کے لئے بلایا اور ریڈ ہرسٹ روڈ پر آنکھ مچولی کا دلچسپ کھیل شروع ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ بچے حسب معمول چیختے چلاتے ، کنکر پھینکتے ، گلی کے نکڑ پر پہونچے تو یہاں گولیوں سے ان کا استقبال کیا گیا اور پھر وہ جب یہاں سے ہٹ کر دوسرے نکڑ پر پہونچے تو وہاں بھی گولیوں سے ان کی آؤ بھگت کی گئی ۔ کنکر کی گولیوں سے نہیں کارتوس کی گولیوں سے ۔ جب بچے زخمی اور جاں بلب ہو کے وہاں سے بھاگے اور گلی کے تیسرے ناکے کی طرف چلے تو وہاں بھی آنکھ مچولی کھیلنے والے سپاہی بیٹھے تھے ۔ دھڑا دھڑ گولیاں چلیں اور پھر اس کے بعد ایک لخت سناٹا ہو گیا تھا ۔ اب جے ہند کہنے والا کوئی نہ تھا ۔ سپاہی چلے گئے ۔ پھر یکایک لوگ گلی میں گھس آئے اور اپنے زخمی اور مردہ بچوں کو اٹھانے لگے اور مائیں اور بہنیں ، بھائی اور باپ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے ۔ پدم سی سیٹھ نے اپنی زخمی شانتا کو اٹھا لیا اور ہم دونوں مل کے اسے اوپر کمرے میں لے آئے ۔ پدم سی سیٹھ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا ۔ شانتا میں نے تجھ سے کہا تھا باہر نہ جانا ۔ سیٹھ یہ الفاظ طوطے کی طرح رٹ رہا تھا ۔ اور ہاتھ ملتا جا رہا تھا ۔ اور وہ بدصورت گجراتی بچی "جے ہند" کہتے ہوئے مر رہی تھی ۔ اور اس کے منہ سے لہو ابل رہا تھا ۔ اس کے منہ سے اس کے بازوؤں سے اس کے سینے سے لہو ابل رہا تھا ۔ اس کا جسم اپنے لہو کے رنگ میں رنگا گیا ۔ سرخ رنگ ، لال اوڑھنی ، ماتھے کا سیندور ، وہ نو سال کی بچی آج بیاہی جا رہی تھی "ننھی معصوم دلہن" اس کے رنگ نے گویا اس کی بدصورتی غائب کر دی ۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا ۔ اس کی باہیں گول اور گداز اور چھاتی ماں کے دودھ سے بھاری ۔ اے بن بیاہی دلہن ۔ آج تیری مانگ میں شہیدوں کا لہو ہے ۔ تیری بڑی آنکھوں میں اجڑے وطن کا سہاگ ۔ تیرے تڑپتے ہوئے لبوں پر "جے ہند" کا نغمہ ہے آج تو نے ملک کو اپنی زندگی کی آخری قسط ادا کر دی ۔ اور اپنے خون سے رسید لکھ کر دے دی ہے ۔ اے ننھی گنڈہ لڑکی تیری موت آج ہم سب پر بھاری ہے اور میں نہیں جانتا کہ کیا کروں ، کس طرف دیکھوں ۔ کس کو بلاؤں ۔ کس کو یاد کروں ۔ کیونکہ زمین پاؤں تلے نکلی جا رہی ہے اور تیرے وطن کے بڑے بڑے آدمیوں نے تجھ سے غداری کی ہے اور تیرا لہو انتقام کے لئے پکار رہا ہے ۔

گجراتی لڑکی مر گئی ۔ ایک دو سسکیاں جے ہند کا مدھم ہوتا ہوا نغمہ ، اور پھر اس کا خون پگھلے ہوئے یاقوت کی طرح فرش پر بکھر گیا ۔

مجھے اس فضا کی خاموشی یاد ہے۔ جیسے ساری کائنات رو رہی ہو۔ مجھے وہ نگاہ یاد ہے جیسے ہزاروں پرچھائیاں ایک ساتھ دل میں کھبی جا رہی ہوں۔ جگرتانی لڑکی مر گئی اور اس کے ساتھ اس کا ہونے والا شوہر مر گیا اور اس کے خوبصورت بچے مر گئے اور زندگی اور اس کی تخلیق اور اس کی ساری خوبصورتی مر گئی۔

کیا ہونا چاہیے یہ سب کچھ نہیں جانتا، اتنا جانتا ہوں کہ وہ نغمہ اور وہ پکار اور وہ آہنگ جس میں اس بچی کا خون گھلا ہوا ہے۔ کبھی مر نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب کوئی گیت، کوئی چیخ۔ کوئی تبسم یوں کسی کے خوف سے رک جائے تو پھر وہ کبھی نہیں مرتا۔ وہ گلے میں پھندا بن کے رہتا ہے۔ دل میں ناسور بن کے چبھتا ہے اور روح کا کانٹا بن کر کھٹکتا ہے۔ اسے گنڈہ کہنا آسان ہے، اسے بھول جانا ممکن نہیں ہے۔

(۳)

تیسرا گنڈہ جو مجھے ملا وہ سکھ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں نہیں اپنی موت کے بعد مجھ سے ملا۔ اس نے ایک شلوار پہن رکھی تھی، اور ایک نیلی دھاری دار قمیص اور اس کے جسم پر گولی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔ اور اس کا گندمی چہرہ خاموش تھا۔ . . . . خاموش اور ظفر یاب اور اس کی چھوٹی بھوری داڑھی میں ریشم کی ملائمیت تھی اس کے خد و خال حسین تھے۔ اور زمین کی طمانیت لیے ہوئے۔ اس کے چہرے سے مجھے جاٹوں کے وہ گاؤں یاد آگئے جن میں دھرتی سونا اگلتی ہے جہاں سونے کی مورتیں اپنی سیاہ غزالی آنکھیں وحشی محبت کا خمار لیے ہوئے پنگھٹ پر کھڑی ہو کر پردیسیوں کو پانی پلاتی ہیں۔ جہاں نہر کے کنارے لانبی لانبی دریائی گھاس ہوتی ہے۔ اور نہر کے پرے گیہوں کے خوشے سرسراتے ہیں اور خوشوں سے اوپر نیلا آسمان اور اوپر بلند ہوتا جاتا تھا۔ ایک بھولا ہوا خواب ایک پر اسرار حقیقت، اچانک مسرت، یہ سب کچھ اس نوجوان سکھ کے چہرے پر نظر آ رہا تھا اس کی قمیض کی جیب میں ایک نامکمل خط تھا۔ یہ خط اس نے شاید صبح لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر وہ اسے مکمل نہ کر سکا۔ کیونکہ صبح ہو گئی اور اس کی زندگی کی شام آگئی اور اس کی آنکھوں کی بینائی اور اس کے ہونٹوں کی گویائی، اور اس کے ہاتھوں کی طاقت اس سے چھن گئی۔ گنڈہ مر گیا۔ اس کا مجھے افسوس نہ تھا۔ افسوس اس خط کے نامکمل ہونے کا ہے۔ یہ خط گورمکھی میں تھا اور اس کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہے۔ اس لہجے کا اس زبان کا اس طرز ادا کا جو تخمینہ ہے۔ پھر بھی جیسا برا بھلا مجھ سے ہو سکا یہاں درج کرتا ہوں۔

میری ماں جی ست سری اکال۔ واہ گورو کی کرپا سے میں یہاں خیریت سے ہوں اور خیریت واہ گورو مہاراج کی کرپا سے لکھنا مجھ کو بہت جلدی۔ اپنے کو ابھی کوئی ٹھکانا نہیں ملا ہے۔ اور کوئی کام کاج بھی نہیں ہے۔ شہر بمبئی کے بیچ میں دنگا ہے اور ہندو مسلمان ایک ہیں۔ واہ گورو کی کرپا سے فکر نہ کرنا۔ تیرا بیٹا جرور نوکری حاصل کرے گا۔ تجھ کو روپیہ بھیجے گا۔ اپنی اچھری بہن کی شادی کرے گا۔ اور اس بانی چودسور کے بچے بنئے کا سود بھی دے گا۔ میری ماں جی بدکلامی پر ہم کو معاف کرنا۔ گلال چند بنئے کا نام لیتے ہی تیرے بیٹے کو گصہ آ جاتا ہے۔ ادھر ابھی میں کرپال سنگھ موٹر ڈرائیور کی ساری میں سوتا ہوں اور روز صبح اس کی لاری دھوتا ہوں۔ جگجیت سنگھ کو بولنا کہ وہ بہن منتو کا بیاہ اس بھین پار کے منوہر سنگھ سے نہ کرے نہیں تو اس کی جان مار دوں گا۔ جب مجھ کو نوکری ملتی ہے تو ایک دم آ کے خود منتو کو بھگا کے لے جاؤں گا۔ میری ماں جی۔ وہ تمہاری بہو اچھی بہو بن کر خدمت کرے گی۔ اور . . . . .

اس سے آگے کچھ نہیں لکھا۔ ہاں جو لوگ اس سکھ نوجوان کی لاش کو ہسپتال میں لائے تھے وہ کہتے تھے کہ اس نوجوان نے بڑی کیبڈ پر اپنی جان دے دی۔ وہ گرانڈ روڈ والے جلوس کے آگے آگے پگڑی سنبھال لال جٹا والا گیت گا رہا تھا۔ اور جب گولی چلنے لگی۔ جب وہ سب سے آگے ہی گیت گا رہا تھا اور بے فکری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانگرس اور لیگ دونوں جماعت کے جھنڈے تھے دائیں بائیں وہ نغمیں لہراتا ہوا وہ آگے بڑھتا گیا۔ گو بعد میں گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اور وہ اس خون کی بارش میں بھی بڑھتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ اور جب وہ گولیوں سے

چھلنی ہو کر گر گیا۔ تو اس نے کہا یہ میری شلوار کسی حاجت مند کو دے دینا اور مجھے سکھ دھرم انوسار جلا دینا۔ اتنا کہہ کر اس نے جان دے دی۔ اور وہ وہیں ٹرام لائن پر مر گیا۔ دونوں جھنڈے اس کے خون سے سرخ ہو گئے۔ لیگ کا سبز جھنڈا، اور کانگرس کا سبز سفید اور زعفرانی جھنڈا دونوں اس کے خون سے ایسے سرخ ہو گئے کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کون جھنڈا کس کا ہے اور وہ جو ہندو تھا نہ مسلمان۔ اس نے اپنا لہو دے کر دونوں جھنڈوں کو ایک کر دیا تھا۔ وہ ایک کسان تھا۔ گاؤں سے آیا تھا۔ اجڈ اور ان پڑھ تھا۔ گنڈہ۔

میں نے اس کی شلوار اور قمیص اپنے ہسپتال کے ہریجن دھوبی کو دے دی۔ دھوبی نے وہ شلوار پہن رکھی ہے۔ نیلی قمیص اس کی بیوی پہننا چاہتی ہے اس نے اسے پھر سیا ہے، جوڑا ہے دوسرے کپڑے کے ٹکڑے لگائے ہیں اور اب یہ قمیص دھوبی کے گھر کے باہر جنگلے کے سلاخ پر پڑی جھول رہی ہے۔ یہ عجیب قمیص ہے جو پنجاب سے آئی ہے۔ جسے کسی کسان بچے کی ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سیا ہے۔ شاعر اور لوگ بڑے بڑے لیڈروں کو سلام کرتے ہیں۔ میں تجھے سلام کہتا ہوں۔ تو نے ایک بھولے جاٹ کے مضبوط سینے پر گولی کھائی ہے تو نے اسی سے پیار کیا ہے اس کا ساتھ دیا ہے۔ زندگی میں اور موت میں اور اس وقت جب ملک کے بڑے بڑے چاہنے والے اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ تجھ پر ہزاروں سلام اے میری وطن کی وسیع غریبی کی طرح پھٹی پرانی قمیص تو نے اپنے آغوش میں ایک معصوم کاشتکار کے دل کی دھڑکنیں چھپائی ہیں۔ اور اب تو ایک ہریجن ان کے دودھ کی عزت اور اس کے ننھے بیٹے کی جان کی حفاظت کرے گی۔ انھیں بھی اپنی زندگی کی سادہ روی بخش۔ انھیں بھی اپنی دھرتی کا پیار دے، اپنی روح کا وہ صادق جذبہ کہ جس سے ہمکنار ہو کر ہم سب بیری کیڈ پر آ گئے مل جائیں اسی طرح ہوا میں لہراتی رہ۔ تو حسن سچائی اور نیکی کی تصویر ہے۔ تو اس آنے والے طوفان کی تنویر ہے۔ جب زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور آدمی محبت کرنے لگتے ہیں۔

(۴)

اس طرح یہ تینوں گنڈے مر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ فساد کے دنوں میں ہوا لیکن اب وہ ہنگامہ ختم ہو چکا ہے۔ اب چاروں طرف سکون ہے امن و امان ہے۔ گنڈے مر چکے ہیں یا گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دئے گئے ہیں اور اب شہر میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے ہسپتال کے وارڈ زخمیوں اور لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اب جلن ہی نہیں ہے۔ اب کالی رات ہے۔ خاموشی ہے۔ میں ہسپتال سے تھکا ماندہ آ رہا ہوں اور نہا دھو کے کھانا کھا کے بستر کے قریب لیمپ روشن کئے دیوان پر بیٹھا ہوں۔ اور اخبار پڑھ رہا ہوں۔ اخبار میں لکھا ہے کہ مسٹر اور مسز بھینی اور مسٹر بندی گر اور مسٹر ستاوان اور دوسرے معزز شہری ایک انگریزی جہاز پر مدعو کئے گئے ہیں جو ساحل پر اس لئے لنگر انداز ہوا ہے تاکہ جہازی ملاحوں کی بغاوت کا سد باب کر سکے مسٹر بندی گر برات کے دولہا معلوم ہوتے ہیں۔ مسٹر بھینی نے ایک ہلکے رنگ کی نیلی قمیص پہن رکھی ہے اور مسز بھینی کی ساری کا رنگ پگھلے ہوئے یاقوت کی طرح ہے۔ یہاں امن اور قانون اور ترقی، اور دستوری انقلاب کے جام پیئے جا رہے ہیں اور میں اخبار پھینک دیتا ہوں۔ اور پھر ایک سے ایک کتاب نکال کر پڑھتا ہوں۔ انسان کی تاریخ از۔ ایچ۔ جی۔ ویلز۔ اور میری آنکھوں کے سامنے بیری کیڈ ناچنے لگتے ہیں آدمی نے ہزاروں سال پہلے بھی یہ بیری کیڈ بنائے تھے۔ ظلم اور جہالت اور گناہ کو مغلوب کرنے کے لئے بیری کیڈ میری نگاہوں کے آگے ناچ رہے ہیں۔ بدھ۔ محمدؐ۔ مسیحؑ۔ . . . پھر روشنی کی مشعل کا زاویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ مارکس پیرس میں گلوتین۔ . . . . کمیون۔ . . . . آکتوبر۔ . . . میڈرڈ۔ . . آج بھی بیری کیڈ کھڑے ہو رہے ہیں۔

مراکو میں . . . . . الجیریا میں۔ . . مصر میں . . . ہندوستان میں . . . یہ طوفان ہے اسے کون روکے گا۔ . . . یہ طوفان ہے طوفان اسے کون روکے گا۔ . . . . یہ انقلاب ہے انقلاب اسے کون چھیڑے گا۔ یہ قمیص ہے قمیص . . . آدمی کی قمیص . . . ہوا میں لہراتی ہوئی۔ اسے گولیوں سے چھلنی کر دو۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو اسے بموں اور ٹینکوں سے اڑا دو۔ یہ پھر ثابت

د سالم ہو جائے گی ۔ یہ قمیص مر نہیں سکتی ۔ یہ آدمی کی روح ہے ۔

ساحر لدھیانوی

یہ کس کا لہو ہے

اے رہبرِ ملک و قوم بتا
آنکھیں تو اٹھا نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

دھرتی کی سلگتی چھاتی سے بے چین شرارے پوچھتے ہیں
تم لوگ جنھیں اپنا نہ سکے وہ خون کے دھارے پوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چلاتی ہے ساگر کے کنارے پوچھتے ہیں
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

وہ کون سا جذبہ تھا جس سے فرسودہ نظامِ زیست ہلا
جھلسے ہوئے ویراں گلشن میں اک آس امید کا پھول کھلا
جنتا کا لہو فوجوں سے ملا، فوجوں کا لہو جنتا سے ملا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

کیا قوم و وطن کی جے گا کر مرتے ہوئے راہی غنڈے تھے
جو دیش کا پرچم لے کے اٹھے وہ شوخ سپاہی غنڈے تھے
جو بارِ غلامی سہہ نہ سکے وہ مجرم شاہی غنڈے تھے
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

اے عزمِ فنا دینے والو! پیغامِ بقا دینے والو
اب آگ سے کیوں کتراتے ہو شعلوں کو ہوا دینے والو

طوفان سے اب ڈرتے کیوں ہو موجوں کو صدا دینے والو
کیا بھول گئے اپنا نعرہ
اے رہبر ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

سمجھوتے کی امید سہی - سرکار کے وعدے ٹھیک سہی
ہاں مشق ستم افسانہ سہی، ہاں پیار کے وعدے ٹھیک سہی
اپنے کے کلیجے مت چھید و اغیار کے وعدے ٹھیک سہی
جمہور سے یوں دامن نہ چھڑا
اے رہبر ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزل آزادی کی قسم، ہر منزل پہ دہرائیں گے
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبر ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

سردار جعفری

کشمیر

دیکھ ہندوستان کے سیاح — آج کشمیر کی بہار ہے اور
وادیاں گونجتی ہیں نغموں سے — ساز و آہنگ آبشار ہے اور

قافلہ انقلاب کا ہے رواں — بج رہی ہے خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہے زمین — لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سلگ اٹھی ہے انقلاب کی آگ — برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم اور جبر کے اندھیرے میں — سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

جن کو کچلا گیا ہے صدیوں سے آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں سے اگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

ان حسیں زعفران زاروں میں یوں تو ہر سال پھول آتے ہیں
اس برس کاسنی شگوفوں میں زخم ہی زخم مسکراتے ہیں

جھیل ہے یہ کنول کے پھولوں کی پاک اور صاف اس کا پانی ہے
مل گیا ہے لہو شہیدوں کا آج ہر موج ارغوانی ہے

بہہ رہے ہیں جوان جسموں سے سرخ اور گرم خون کے دھارے
پھوٹتے ہیں افق کے سینے سے روشنی کے طلسمی فوارے

یہ انھیں عورتوں کی لاشیں ہیں جن کے چہروں پہ رنگ تھا نہ نکھار
آج دامن میں کھل رہے ہیں چمن آنچلوں میں ٹنکی ہوئی ہے بہار

خاک پر سو رہے ہیں جو بچے اپنی ہی خون میں نہائے ہوئے
ڈوگروں کو شدید نفرت ہے دیکھتے ہیں نظر جمائے ہوئے

یہ ہیں وہ لال جو نشانی تھے اپنے ماں باپ کی محبت کے
آج سے یادگار ہیں لیکن قوم کشمیر کی شجاعت کے

مجھ سے کیوں پوچھتا ہے اے سیاح باغ کشمیر کا ہے تحفہ کیا
اس دہکتے ہوئے گلستاں سے
ایک دو سرخ پھول لیتا جا

خواجہ احمد عباس

زعفران کے پھول

آؤ، مسافر، یہاں اس چنار کے درخت کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں ۔ ۔ ۔ وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمہاری ۔ ۔ ۔ انجن بگڑ گیا ہے ۔ ۔ ۔ کوئی بات نہیں۔ اندھیرا ہونے سے پہلے شری نگر پہنچ جاؤ گے۔ اب بیس کوس کی تو بات ہی ہے ۔ ۔ ۔ نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہیے، اور پھر پیسے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون؟ ۔ ۔ ۔ اکیلی جان ہوں۔ زیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں۔ چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں۔ دھان کوٹ دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے، دو مٹھی چاول کھانے کو مل ہی جاتے ہیں۔ ساٹھ اوپر پانچ عمر ہونے کو آئی۔ اور چاہیے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم بھی کہتے ہو گے کس بکواسن سے پالا پڑ گیا ہے ۔ ۔ ۔

کیا کہا تم نے بیٹا؟ ۔ ۔ ۔ نہیں، نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے ۔ ۔ ۔ ٹھیک کہتے ہو۔ زعفران کے پھول پہ تم کا سنی ہی ہوتے ہیں اندر زعفرانی رنگ کا ہوتا ہے۔ اب بھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پر یہاں اس سال سرخ پھول ہی کھلے ہیں ۔ ۔ ۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے۔ اور کہانی ادھوری رہ جائے گی۔ موٹریں تو اس سڑک پر سے گذرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا۔ پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دستر خوانوں سے مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوانی بڑھیا نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے! ۔ ۔ نا؟ ۔ ۔ ۔ پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟ ۔ ۔ ۔ یا ابھی تمہاری موٹر درست ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟ ۔ ۔ ۔ خیر جو بھی ہو سننا چاہتے ہو تو سنو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول، تو اسی سال ہی کھلے ہیں۔ پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی اگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار آ جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلہن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گذرتیں۔ ان کی دھول کے بادلوں میں بھی یہ خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں رنگی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

تمہاری طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا۔ کئی برس کی بات ہے۔ جب یہ کاسنی رنگ کے پھول ہی کھلا کرتے تھے۔ کوئی بہت ہی سیدھا معلوم ہوتا تھا۔ بیچارہ۔ کھیت میں جا کر پھولوں کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ اور لگا نتھنے پھلا پھلا کے ناک سے سانس لینے۔ جیسے پھولوں کو سونگھ نہ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا: "عجیب بات ہے۔ کوئی بھی نہیں آئی!" میں نے پوچھا "کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو؟" تو جواب ملا "ہنسی۔ ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو ۔ ۔ ۔ " تو جانا تب پتہ چلا کہ وہ بیچارہ کتابوں میں پڑھ کر آیا تھا۔ کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پہ

لکڑیوں کا گٹھا رکھے ہوئے زعفرانی آگئی میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھل کھلا کر ہنسنے . . . اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا سا ہوگیا مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ ہنسنے ۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی اور بعد میں وہ اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پڑا ہوا کیوں کہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور ہم تینوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا ۔

میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی . . . . . . بیٹا ، بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہا ۔ بات بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں ۔ ہاں تو زعفرانی . . . . . . کیا کہا زعفرانی کون ؟ . . . . . . ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی . . . . . . نہیں بتایا تھا ؟ . . . . . . تو بھول گئی ہوں گی ۔ لو دیکھ لو یاد کا حال ہے ، بیٹا . . . . . . ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی ۔ لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ دن بھر کدال مچایا کرتی تھی ۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا زیادہ وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے ۔ زعفرانی ! زعفرانی ! تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں ۔ ہاں تو جب وہ جوان ہوگئی تو گاؤں کے جوان کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے ۔ اس کی رنگت زعفران کے پھول کی طرح ہے ۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں ۔ مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی وبصورتی نظر نہیں آتی تھی ۔ ایک تو دبلی تھی ۔ جیسے چشمے کے کنارے اگے ہوئے بید مجنوں ۔ میں کہتی بھلا ایسی دھان پان لڑکی بچے کیسے جنے گی ؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو ۔ دیدے پھٹے ہوئے ۔ اوپر سے یہ تہبند نام کو نہیں ۔ نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا ۔ بس ہر وقت دھاچوکڑی سے مطلب ۔ میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی ۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی ۔ وہ بھی دو سے چھوٹی ۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا ۔ میں سوچتی ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا ۔ پر وہاں تو جسے دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا . . . . . . تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا ۔

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے ۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے بھی اپنے لڑکے کا پیغام دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا ۔ بھلا ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا بر کون مل سکتا تھا ؟ تم ہی کہو . . . . . . میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کھل گئی ۔

نہیں بیٹا ۔ بیاہ کہاں ہوا ؟ وہاں تو خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔ اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ سیکڑوں چل بسے گھر والا بھی خدا کو پیارا ہوگیا ۔ خدا اسے جنت نصیب کرے ۔ اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پہ آفتیں آنی شروع ہوگئیں ۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا ۔ اس میں زمین کی قرقی ہوگئی اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی ۔ تین بیٹے تھے نہ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے ۔ میری اصلی پونجی تو یہ میری اولاد ہے ۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم لڑکی کو کون بیاہے گا ۔

سیکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آتے ہیں ۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بری ۔ کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں ۔ کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں ۔ کبھی برف اور پالے میں تباہ ہوجاتی ہیں ۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں ۔ کبھی دوسرے کی ۔ قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے ۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں ۔ پر راجا پرجا کا کیا مقابلہ ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جاتی ہے مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ ۔ اس میں جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے . . . . . . ہاں تو کئی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا ۔ کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ منجھلا بیٹا نورو چلاتا ہوا آیا " ماں ۔ ماں ۔ شیر کشمیر آئے ہیں ، شیر کشمیر " بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا ۔ میں چلاتی ہی رہ گئی ۔ کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جائے کہ بندوق لے کے آویں ۔ تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے ۔ بھاگے چلے جارہے ہیں ۔ چلو ۔ میں بھی تماشہ دیکھوں ۔

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے ۔ گاؤں کے اس سرے پر ۔ ارے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے ۔ ایک اسکول ہے ۔ اب تو مڈل

تک کا ہو گیا ہے۔ پر تب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی۔ ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اس اسکول کے سامنے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں اور سامنے نہ شیر نہ چیتا۔ ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لو جی یہ تھا وہ شیر کشمیر، میں نے کہا۔ خوامخواہ مجھے ڈرا دیا۔ خیر۔ . . شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔ بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا۔ اس سے میں سمجھی کہ ضرور یہ جائے بیچنے والا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا توار کھ کے بھونپو والا باجا بجائے گا، اور جائے کی پڑیاں مفت سب کو بانٹے گا۔ اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہو گئی۔ پر یہ تو کشمیری بول رہا تھا۔ اور اگر یہ جائے والا تھا۔ تو اس کی جائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے تو دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ۔ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے آپس میں ایک ہو جانا چاہیے۔ لڑکوں لڑکیوں کو پڑھانا چاہئے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ مترے بچارے زعفرانی بھی ایک کونے میں اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں تو اس کا ہاتھ پکڑ گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی۔ کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے۔ ایسی خطرناک جگہ پیر دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں۔

تم تو جانتے ہی ہو تلاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو، سارے پانی میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا۔ جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام چین، صلح، شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین، جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت۔ ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں۔ اس کو بدلنے پر تلا ہوا۔ میں کہتی، ارے تمہارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمریں انھی راجوں، مہاراجوں افسروں کے ظلم سہتے سہتے روکھی سوکھی کھا کر صبر و شکر سے کاٹ دیں۔ تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو الٹ پلٹ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ پر میری کون سنتا ہے بیٹا۔ وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو کر دیا۔ ایسا کیا تھا کہ . . . . . . تم میری باتوں سے اکتا گئے نا؟ . . . وہ زعفرانی کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں ہاں بیٹا اسی کی بات تو کر رہی ہوں، تم بھی کہتے ہوگے یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے ٹھہرے، شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے۔ . . . . . . یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم تو بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہاں تو ہمارے گاؤں میں اس کی تقریر ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتوں کو بھول جائیں گے اور وادی میں صبر و شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پر تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں ہے اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے میرے ہی لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذرا بلا یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

جب تک باپ زندہ رہا تب تک تو بیٹے کچھ قابو میں رہے۔ اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اٹھا چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی بڑا لڑکا غلام نبی کہنے لگا۔ میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا اس سے تو بہتر ہے۔ سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اٹھا کر لے جانے کا کام کروں اس طرح دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اسی کا۔ چھ مہینے کے بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ہاتھ

تو تب بھی چاہئیں ۔ زمین ، زیور ، یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے تک بک چکے تھے ۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ بھی مل جاتا ۔ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی ۔ کہ ایک دن ایک آدمی آیا ۔ شکل وصورت سے بیچارہ کوئی قلی معلوم ہوتا تھا ۔ نہ ہی ماتھے پہ پیٹے کا نشان ۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی ۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا ۔ کہنے لگا ۔" غلام نبی نے بھیجا ہے ۔ میں اس کا دوست ہوں ۔ محمدو " یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی ۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری ۔ گنے تھے تو ساٹھ اوپر پانچ روپے اور دس آنے ہوئے ۔ وہ بولا " غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں "۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا ۔ پر محمدو کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا ۔ اور غلام نبی کا کیا حال ہے ؟ وہ نہیں آیا ؟"۔ محمدو کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ ٹھہر ٹھہر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو ۔" ماں جی ! غلام نبی تو چل بسا ۔ اسے دق ہوگئی تھی "، اور بس چپ ہوگیا ۔

بیٹا تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کے نکال لیا ہو ۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا ۔ دودھ پلاتی ہے ۔ بچہ اس کے خون ، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے ۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے اور سب سے بری موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے ۔

میرا تو جو حال ہوا سو ہوا ، زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی اور بھی فکر پڑ گئی ۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار رہتی کہ پڑھ ، تختی لکھ ، مدرسے کا کام کر ، گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی ۔ جیسے اسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار ہی دن میں پوری ہو جائے ۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اسے نہ جانے کیوں ۔

ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری دنوں کا سب حال کرید کرید کر پوچھا ۔ کب اور کیسے بیمار پڑا ، علاج ہوا یا نہیں ؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے ؟ اور جب محمدو نے کہا " ہاں بہت سوں کو "، تو نہ جانے ۔ کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا " تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے ۔ ؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے ؟ " نہ جانے کیوں ۔

میرے کہنے سے محمدو ہمارے ہاں تین دن اور ٹھہرا ۔ جس روز وہ جا رہا تھا ۔ میں نے اس سے پوچھا " کیوں رے محمدو ۔ جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا ؟ " وہ بولا ۔ " چھوڑ کر کیا کروں گا ۔ ماں جی ۔ اور کوئی کام آتا نہیں ہے ۔ اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے ۔ نہ ماں نہ باپ . . . "۔ میں نے جلدی سے پوچھا " اور بیوی ؟ " اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا " کب کی مر گئی "، . . . پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں ۔ پر میں نے کہا ۔ پھر دوسری کیوں نہیں کر لیتا ؟ " اس کو تین دن میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا ۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ہوئی ۔ اور اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھریاں پڑ گئیں ۔ مجھ سے کون بیاہ کرے ہے ، ماں جی . . . ۔ تو بیٹا ، یوں زعفرانی کا بیاہ محمدو سے طے پایا ۔

کیا کہا ؟ زعفرانی کی رائے ؟ بیٹا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں ۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیس کو محمدو اسے بیاہنے آئے گا ۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ خوش ہوگئی ـــــ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں ـــــ پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا ۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہوگئی ہو ۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے ۔ ہاں ، بیٹا ۔ آخر ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے ۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں ۔ جس دن محمدو آنے والا تھا ۔ اس دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اپنا نہلا دھلا شادی کا جوڑا پہنا دیا ۔ گلابی رنگ کا

گھاؤ جیسا گہرا گڈھا ۔ جہاں بوجھا سنبھالنے کو مزدور پٹہ باندھتے ہیں اور رات بھر کھانستا ۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا ۔ میں نے کہا ۔ یہ کیا حالت ہو گئی تیری ۔ کیا بیمار ہے ؟ بولا نہیں ماں ۔ بوجھ اٹھانے والوں کے ماتھے پر ایسا گڈھا تو پڑا ہی رہتا ہے ۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن ٹنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا ۔ بیچ میں بارش آگئی ۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے ۔ چار دن کے بعد جب ٹنگ مرگ گیا تو منجھلا نور دین بھی ساتھ ہولیا ۔ کہنے لگا ماں ، میں بھی شہر جاکر مزدوری کروں گا ۔ میں نے کہا جو چاہے کرو ۔ جب تم لوگوں میں ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ ۔ نور دو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے ۔ کہ ذیلدار نے شہر سے آکر کہا ۔ غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے ۔ تمہارا منجھلا بیٹا نور دین شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے ۔ دن بھر کشتی چلاتا ہے ۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جاجا کر تقریریں کرتا ہے ۔ میں نے کہا بی میڈی کو بھی زکام ہوا ہے ۔ کشیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے ۔ اس کسان کے جھونپڑے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے ۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا ہے کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا ۔ نہ وہ میرا بیٹا نہ میں اس کی ماں ۔

زعفرانی ؟ لو اس کا تو ذکر کرنا بھول ہی گئی تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون ؟ بس میں ، زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا ۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی ۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں اور یہاں ، وہاں تو آمدنی ہی صفر تھی ادھر سنا سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہو گئی ۔ تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھو ۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے ۔ کبھی کسی کے کھیت پر ۔ کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے ۔ کبھی پانی بھرتے ، کبھی اون کاتتے ، تب جاکے دو وقت چولہا جلتا ۔ میں نے کہا ، غفورا دس برس کا ہو گیا ۔ لاؤ اس کو بھی کام پر لگا دیں ۔ گھر میں چار پیسے زیادہ آئیں گے ۔ تو شاید کچھ بچت ہو جائے اور زعفرانی کے بیاہ کی کوئی صورت نکل آئے ۔ پر اس نے جو سنا تو بولی نہیں ماں ہم تو غفورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے ۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے پر وہ ایک نہ مانی ۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسے داخل کر آئی ۔ جوان برابر کی لڑکی ۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دکھ تھا ۔ اس واسطے میں چپ ہو گئی ۔ مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے ۔ اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی ۔ پر بیٹا اس لونڈیا پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا ۔ دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ۔ مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر پڑھ ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے یہاں جا ۔ یہ کر وہ کر ۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے ۔ جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے ۔ بیٹا وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں ۔۔۔ ۔۔۔ ہیں اکیس برس کی لڑکی ۔ پھر شکل و صورت میں جو بری تھی نہیں تو کانی بھینگی ، چیچک منہ داغ بھی نہیں تھی ۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے ۔ شہر جاکے سنیما ، بائیسکوپ ، ناچ رنگ اور نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کتنے آوارہ ہو گئے ہیں ۔ ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی ۔ کہ کیا دیکھتی ہوں ۔ خالی ہاتھ واپس چلی آ رہی ہے زار و قطار روتی ہوئی ۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا تو کچھ جواب نہیں ، بس روئے چلی جا رہی ہے ۔ اری کمبخت کچھ کہے گی بھی کہ کیا ہوا ۔ کسی نے مارا ، گالی دی ، چوٹ لگ گئی ۔ آخر ہوا کیا ؟ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی ۔ بیٹا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے نہ سنی ہو گی ۔ کہنے لگی " ماں میرا بیاہ کر دو " اور پھر لگی رونے ۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی ۔ کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا تھا ۔ ادھر آنکلا ۔ لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اول فول بکنے ۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ بدارادے سے لگا اپنی طرف گھسیٹنے ۔ بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بیچاری مگر اس بدمعاش کی ہول بیٹھی ہوئی تھی دل میں ابھی تک اور جب ہچکیاں ذرا رکیں تو یہی کہتی " ماں میرا بیاہ کر دو ، نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی " ۔

اب تم ہی بولو ، بیٹا ، غریب عورت کرے تو کیا کرے ۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے ۔ پھر بھی میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی سے بیاہ کر لے تو یہ فکر تو دور ہو جائے ۔ مگر پچاس ساٹھ روپے

پیراہن اور اس کے نیچے سبز بھیوار اچھینٹ کی شلوار ہم پرانے زمانے کی کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اس شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی۔ کہ ماں شلوار پہنو، نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر و یر سے ڈرے میری بلا۔ پر اور بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ میں نے سوچا۔ میں ہی کیوں نکو بنوں سو میں نے بھی سلوا لی۔

اتنا غصہ آتا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا۔ شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے؟ مجھے کیا پتہ سرکار نے کیوں اسے پکڑا تھا۔ میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے اسے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا۔ پھر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب کے اس شیر نے ببر شیر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی۔ یہ سوچ کر کہ شاید محمد وا اور اس کے ساتھی برات لے کر آئے ہوں۔ مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں لئے "شیر کشمیر زندہ باد" "ڈوگرا راج مردہ باد" کہتے پھر رہے تھے اور ہمارا غفورا چند اینٹوں کا چبوترہ بنائے اس پر چڑھا دیوار پر سفید کھریا سے کچھ لکھ رہا تھا۔ زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا ک۔ش۔م۔ی۔ر۔چھ۔ و۔ڑ۔ د۔ "کشمیر چھوڑ دو" اور زعفرانی دروازے پر کھڑی غفورا کو یہ لکھتے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی۔ جیسے اس نے کوئی بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

ہاں تو میں ابھی اندر جا کر بیٹھی ہی تھی۔ کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ بھاگ کر باہر آگئی۔ اور دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی۔ اور اس میں سے کود کر سپاہی بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے۔ میں اس دیوار کی طرف دوڑی۔ جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا کھریا سے لکھ رہا تھا۔ پھر غفورا وہاں نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی۔ اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بیہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا۔ جس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا۔ میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی۔ اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انھیں حرفوں کو دہراتے رہے جن کو وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ک۔ش۔م۔ی۔ر اور ابھی نہیں کہہ پایا تھا کہ گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی۔

اور اس کے بعد کیا ہوا بیٹا یہ مجھے ایسا یاد ہے۔ جیسے کوئی ڈراونا خواب ہو۔ جس میں اس خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا ایک پہاڑ اٹھتا چلا جائے۔

زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول کے کھلے ہوئے پھول سے ملتی جلتی ہوا کرتی تھیں۔ اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں۔ آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت اس میں سلگ رہی تھی۔

اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں۔ اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ۔ اور یہ سارا مجمع گاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں بالکل اسی جگہ تمہاری موٹر کھڑی ہے سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

کالی رنگت اور بڑی بڑی مونچھوں والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف، ان عورتوں کی طرف! زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

یہ جو آگ ان بندوقوں کی اندھی آنکھوں میں تھی اس سے کہیں زیادہ خطرناک آگ اس وقت زعفرانی کی آنکھوں میں تھی۔ زعفرانی

جب بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ایک۔ تڑاخ۔ دو تڑاخ۔ دس تڑاخ۔ بندوقیں آگ اگل رہی تھیں۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو ہاتھ سے سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن گرے۔ ٹپے رہیں ادھر بھاگی پر جب تک بیوچن زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی۔ عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کی بجائے خون کی دھار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خون مٹی میں مل رہا تھا۔ اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پر مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا "میرا بیاہ ہو گیا ماں۔ ۔ ۔" یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گل لالہ کی طرح سرخ زعفران کے پھول کھلے دیکھتے ہو۔

سنی بیٹا، تم نے میری کہانی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر تم کہاں ہو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلے گئے نا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہ کہتی تھی، کہ ابھی تمہاری موٹر درست ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے۔ اور کہانی نہ سن پاؤ گے۔ ۔ ۔ ۔ موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں۔ بیٹیا۔ پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں۔ تو پھر دھول کے بادل کی طرح چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے تنکوں نے سکھا کر دساور کو بھیج دئے جائیں گے۔ اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں، اور کس کس کے دسترخوان سے مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

بھاگو لندن جاؤ

پریم دھون

اب بھاگو لندن جاؤ ۔۔ کاہے سو سو مکر بناؤ
تمری نیت کھوٹی، تمرا ہر وعدہ ہے جھوٹا
لڑنے مرنے کی باتوں میں ظالم کیسا سودا
خون کا بدلہ خون ہے سن لو آزادی کا بھاؤ
اب بھاگو لندن جاؤ

کیسے بھولیں جلیانوالہ باغ کو کیسے بھولیں
کیسے بھولیں اس کشمیر کی آگ کو کیسے بھولیں
ایک نہیں ہمرے سینے پر لاکھوں ہی ہیں گھاؤ
اب بھاگو لندن جاؤ

برسوں چپکے چپکے تم نے جیب ہماری کاٹی
سونے کا گھر لوٹ لوٹ کے آج کیا ہے ماٹی
جاگ اٹھے گھر کے رکھوالے اپنی خیر مناؤ
اب بھاگو لندن جاؤ

نیتا رک سکتے ہیں، پر جنتا نہ آج رکے گی
نیتا جھک سکتے ہیں پر جنتا نہ آج جھکے گی
ایک مشن کیا چاہے اپنے لاکھوں ڈھونگ رچاؤ
اب بھاگو لندن جاؤ

بچہ بچہ آج ہتھیلی پر سر رکھ کر آیا
پگ پگ پر ہندو مسلم نے مل کر خون بہایا
اب اس خون میں ڈوب رہی ہے آخر تمری ناؤ
اب بھاگو لندن جاؤ

یہ بھاڑے کے ٹٹو راجے یہ ماٹی کے مادھو
ان کے بھی دن بیتے اب ان کا بھی بستر باندھو
صاحب اپنے سنگ یہ اپنے کتے بھی لے جاؤ
اب بھاگو لندن جاؤ

۲۔ سامراجی چالیں اور ہندو مسلم فساد

منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہیں دیکھو
افق دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

کیفی اعظمی

جوش ملیح آبادی

وزارتی وفد کا فریب

بہت ہی طاق ہیں طول امل میں اہل مشن — بلا کے تیز ہیں رد و بدل میں اہل مشن
وطن کو پیس رہے ہیں کھرل میں اہل مشن — چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہل مشن
شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں

کبھی ڈرے ہی نہ تھے جو کسی تباہی سے — شدید تر تھے جو دنیا کے ہر سپاہی سے
کبھی دبے ہی نہ تھے شان کجکلاہی سے — جو سر کبھی نہ جھکے تھے جلال شاہی سے
حضور حضرت ویول جھکائے جاتے ہیں

بشر کے واسطے ظالم نہیں جو ظلم ہیں — دلوں کے خون سے رنگین جن کے پرچم ہیں
زمیں پہ جو بھڑکتے ہوئے جہنم ہیں — وہ والیان ریاست جو ننگ عالم ہیں
نظر بچا کے گلے سے لگائے جاتے ہیں

دراز زلف کے لچھوں میں طرفہ دام نہاں — اس التفات فراواں پہ جان و دل قرباں
عجیب ناز ہے اس ناز کا جواب کہاں — سر حیات پہ چپکے سے رکھ کے کوہ گراں
گلے سے کائی کے ریشے ہٹائے جاتے ہیں

نگاہ ناز میں راز و نیاز آزادی — ہر ایک حرف میں سوز و گداز آزادی
کھلی ہے دوش پہ زلف دراز آزادی — بجا رہے ہیں بلندی پہ ساز آزادی
ولٹو کی ہانک بھی لیکن لگائے جاتے ہیں

ہر ایک خم میں نہاں بے پناہ شمشیریں — ہر ایک موج میں گرداب کی ہیں تصویریں
ہر ایک لوچ پہ پیچیدگی کی تحریریں — ہر ایک لٹ میں بٹی جا رہی ہیں زنجیریں
نئے اصول سے گیسو بنائے جاتے ہیں

زہے تبسم رنگین شاہد تہذیب — جو طرفہ ناز تو دلداریاں عجیب و غریب
انوکھی چال نرالی روش نئی ترکیب — مدبّران کہن سال کو پئے ترغیب
طرح طرح کے کھلونے دکھائے جاتے ہیں

زمیں سے پھوٹ رہے ہیں دغاؤں کے سوتے — وہ دے رہے ہیں جو سب کچھ، وہ کچھ نہیں کھوتے
خلوص ہوتا تو فتنوں کے بیج کیوں بوتے — دیار ہند میں گوروں کی فوج کے ہوتے
سریر امن پہ کالے بٹھائے جاتے ہیں

کیفی اعظمی

قومی رہنما

اے کہ تم درد غلامی کی دوا بھول گئے — کھا کے دلی کی ہوا عہد وفا بھول گئے
دوست سے روٹھ کے غیروں کی جفا بھول گئے — باہمی جنگ میں دشمن کا گلا بھول گئے
اتنا ٹکرائے ہو آپس میں کہ خود کانپتے ہو
یونین جیک کے سائے میں کھڑے ہانپتے ہو

یاد تو ہوگا تمہیں بھی وہ غلامانہ چلن — گھر کے جھگڑوں میں رہا کرتے تھے تم دونوں مگن
آگیا عین لڑائی میں جو لندن سے مشن — شملہ رو ہو کے جھکا دی گئی فوراً گردن
ورد بول پہ ہری اور غنی ایک ہوئے
اس کی سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

وہی فوجیں، وہی سنگینیں، وہی شمشیریں — وہی فرمان وہی جور، وہی تعزیریں
وہی جلاد، وہی دار، وہی زنجیریں — تم نے آزادی کی دیکھی ہیں کہاں تصویریں
زخم سینے کا ہنسی میں نہ چھپاؤ ہم سے
رہبرو آج نگاہیں تو ملاؤ ہم سے

مادر ہند کے ہونٹوں پہ فغاں ہے کہ نہیں — روئے ملت پہ غلامی کا دھواں ہے کہ نہیں
روح کو آج بھی احساس زیاں ہے کہ نہیں — پاؤں میں آج بھی زنجیر گراں ہے کہ نہیں
جہد و قربانی و ایثار کا حاصل ہے یہی
کیا جہاں دوڑ کے تم بیٹھے ہو منزل ہے یہی

تم نے سر سامنے دشمن کے جھکایا کیسے — اپنے جے کاروں کو نعروں کو بھلایا کیسے
فتح کا تاج لٹیروں کو پہنایا کیسے — بڈھے جلاد کو سینے سے لگایا کیسے

جبر یہ صلح پہ کہنا تھا بہر طور نہیں
تم نمائندے ہمارے ہو کوئی اور نہیں

جنبشِ لب در دشمن پہ صدا کی توہین　　　غیر سے دوست کی فریاد وفا کی توہین
تکیہ ابلیس پہ عرفانِ خدا کی توہین　　　صلح جلاد سے خونِ شہدا کی توہین

منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہیں دیکھو
افقِ دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

اشک لو دینے لگے رقصِ شرر سے پہلے　　　آگ دوڑی رگِ احساس پہ گھر سے پہلے
تھی ہمیں فکر رفو زخمِ جگر سے پہلے　　　چونک چونک اٹھے ہی ہم صبحِ عذر سے پہلے

خواب یہ بھی اثرِ سلسلۂ خواب نہیں
اپنی تاریخ میں غفلت کا کوئی باب نہیں

ذکرِ ماضی نہ سنو حال کے تیور دیکھو　　　کوندتے ہیں خس و خاشاک میں خنجر دیکھو
ہاں نہتوں سے کبھی آنکھ ملا کر دیکھو　　　ایک اک شیر ہے بپھرا ہوا لشکر دیکھو

تم رہے جاتے ہو پیچھے وہ بڑھے جاتے ہیں
نوجواں موت کے سینے پہ چڑھے جاتے ہیں

عصمت چغتائی

دھانی بانکیں

تیسرا منظر

(پردہ اٹھتا ہے تو تینوں عورتیں غافل سوتی نظر آتی ہیں۔ اسٹیج پر ہیبت ناک تاریکی پھیلی ہوئی ہے صرف دو دیے صحن میں رکھے ہوئے ٹمٹما رہے ہیں۔ صرف روشنی کا دائرہ، روپا کے اوپر آہستہ آہستہ دائرہ چھوٹا ہونا شروع ہوتا ہے۔ روپا کے چہرے پر کرب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پیر میں تشنج ہوتا ہے اور درد سے کراہتی ہے۔ جیسے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ دائرہ گھٹ کر صرف چہرے پر رہ جاتا ہے۔ روپا کے کانوں میں دور سے وہی ڈراؤنی پکار گونجتی ہے جو آہستہ آہستہ قریب آجاتی ہے۔ روپا تڑپ کر اٹھ بیٹھتی ہے اور ہاتھ پھیلا کر دوڑتی ہے۔)

روپا - (خواب کی حالت میں) نہیں، نہیں، نہ مارو میرے لال کو . . . . . . بچاؤ . . . بچاؤ . . . بھگوان کے لئے دیا کرو . . . . . (بری طرح کلیجہ مسوستی ہے) نہ مارو، چھوڑ دو (گڑگڑا کر) اسے چھوڑ دو۔ یہ ہندو نہیں، یہ مسلمان نہیں، یہ تو مجھ ابھاگن کا بیٹا ہے۔ میرا بیٹا . . . دیکھو . . . دیکھو . . . میری طرف دیکھو . . . یہ میرے کلیجہ کا ٹکڑا ہے

اس نے کبھی کسی کو نہیں مارا ، میں نے بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ بہاؤ اس کا لال لال خون ، مٹی پر نہ پھینکو یہ ماں کا دودھ ہے ، ماں ۔ تمہاری بھی تو ماں ہے ؟ جس نے تمہیں جنم دیا ۔ میں نے بھی اس کو جنم دیا ہے ۔ میں نے بڑے دکھ جھیل کر اسے پالا ہے ۔ یہ دکھو سلائی کرتے کرتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں ، چکی پیستے پیستے ہتھیلیوں میں گھٹے پڑ گئے ۔ (بےکسی سے خیالی ہیبر کو روکتے ہوئے) ٹھیرو ۔ ۔ ۔ پرمیشور کے لئے دیا کرو ۔ ۔ ۔ نہ مارو ، نہ مارو میرے لال کو ۔ ۔ ۔ آہ ۔ ۔ ۔ آہ (دونوں ہاتھوں سے خیالی سورج کو بچاتی ہے ، ایک کرسی سے ٹکرا جاتی ہے)

عائشہ (سوتے میں کانپتی ہے)

ردیا (زمین پر گر کر سسکیاں بھرتی ہے) مار ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مار ڈالا میرے بچے کو ۔ ۔ ۔ ۔ آہ

عائشہ (کے چہرے پر روشنی کا دائرہ پڑتا ہے ۔ سوتے میں اس کے کان میں بھی وہی موت کی ہیبت پکار گونجتی ہے اور کرب سے بےچین ہو کر عائشہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھتی ہے) مار ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظالمو ۔ ۔ ۔ تم نے میرے خورشید کو مٹی میں ملا دیا ۔ ۔ ۔ (ہیبت زدہ جیسے لاش کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہی ہے ۔ تم نے اس کے سینہ میں چھرا گھونپ دیا ۔ آہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی آنتیں باہر نکل پڑیں ۔ (پاگلوں کی طرح کچھ جھک کر سمیٹنے لگتی ہے) تم نے مجھ ادھ مری بڑھیا کا سہارا لوٹ لیا (چیخ کر) انھیں بے رحم ہاتھوں سے تم نے میرا سہاگ لوٹا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا سہاگ ، ملیا میٹ کیا تھا ۔ آج انھیں ہاتھوں سے میرا کلیجہ نوچ کر پیروں تلے مسل ڈالا ۔ واہ کیا سورما ہو ، واہ واہ کیا کہنے ، (اپنی طرف اشارہ کرکے ، ہڈیوں کے ڈھانچے سے مقابلہ کرتے ہو ۔ ۔ ۔ بتاؤ کیوں ؟ ۔ ۔ ۔ کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے (لجاجت سے ، تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے میرے گھر کا چراغ بجھا دیا ۔ میں نے تم سے کیا چھینا تھا جو تم نے میرا سب کچھ چھین لیا ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اندھا کر دیا ۔ اب بتاؤ میں کہاں جاؤں ، کسے ڈھونڈوں کسے پکاروں ۔ کس سے انصاف مانگوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا خدا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر) تو دیکھ رہا ہے ؟ تو بتا میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو یوں میری ساری زندگی کو دوزخ بنا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس نے (خیالی لاش کی طرف اشارہ کرکے ، اس معصوم نے کونسا گناہ کیا تھا ۔ ۔ ۔ (جھک کر خیالی لاش کو پیار سے چھوتی ہے) میرا خورشید یہ تیرا لال لال خون (ہاتھ میں لے کر گال پر ملتی ہے) میرا خون ، بےکس اور لاچار کا خون ، ۔ ۔ ۔ ۔ یہ درندے پی گئے ۔ ۔ ۔ اب تو ان کے کلیجے ٹھنڈے ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ پیاس بجھ گئی (بھیڑ کو ڈھکیلتی آگے بڑھتی ہے) ہٹو ۔ ۔ ۔ میں اپنے لال کی لاش اٹھا لوں ۔ ۔ ۔ نہیں تو اسے کتے نوچیں گے ۔ گدھ ۔ ۔ ۔ گدھ (سہمی ہوئی چاروں طرف دیکھتی ہے) ملک الموت کے چوبدار میرے بچے کی لاش پر تاک لگائے بیٹھے ہیں (چارپائی پر لڑکھڑا کر گرتی ہے اور پیار سے تکیہ پر ہاتھ پھیرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خورشید چل تجھے دولہا بناؤں رجب میں تیرا بیاہ ہونے والا تھا نا تو یہ تیری بارات آ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لال لال خون کی مہندی رچ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خورشید ۔ ۔ ۔ میرے کلیجے کے ٹکڑے (آہستہ آہستہ آواز ڈوب جاتی ہے اور منہ کے بل گر کر سو جاتی ہے)

اب اکیلی لکشمی سو رہی ہے ۔ روشنی کا دائرہ اور ڈراونے کالے کالے سایے ، اسے چاروں طرف سے گھورتے ہیں اور وہی آواز ، مارو ۔ ۔ ۔ ۔ مارو ۔ ۔ ۔ آہستہ اور پھر بلند کانوں میں گھستی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لکشمی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی چوڑیاں چھپا لیتی ہے)

لکشمی (کسی خیالی شے سے بچتی چوڑیاں چھپائے بھاگتی ہے) نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ نہ توڑو ۔ ۔ ۔ ۔ نہ توڑو میری دھانی بانکیں

میں نے آج ہی تو پہنی ہیں۔ یہ تو کانچ کی ہیں۔ دو کوڑی کی بھی نہیں۔ تمہارے کس کام آئیں گی۔ پر میرا تو ان سے سہاگ بندھا ہوا ہے ...
. آہ نہ توڑو . . . . . . (ایک دم اپنی مانگ چھپا لیتی ہے) میری مانگ نہ اجاڑو۔ یہ چاول بھر لال کم کم تمہارے کس کام کی ... آہ
مار ڈالا (بیکسی سے چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے اور گھٹی گھٹی آواز سے رو پڑتی ہے) آہ . . . تم نے . . . تم نے انھیں
مار ڈالا۔ اے چوڑی چھاتی والے جوان، میں تو تمہاری بہن سری کی ہوں، تم نے بہن کا سہاگ لوٹ لیا (دوسرے خیال کردار سے)
تم . . . اے لمبی داڑھی والے بابا . . . . . . تم نے اپنی بیٹی کی مانگ نوچ ڈالی۔ تم نے۔ ایک نربل لڑکی کو زندہ چتا پر پھونک
دیا (آواز گھٹ کر بھیانک ہو جاتی ہے) وہ موا! . . . . آہ وہ موا۔ میں ودھوا ہوں۔ اب کیا ہوگا؟ (بھیانک صورت ہو جاتی
ہے) بولو . . . اب میں کہاں جاؤں . . . کیا کروں؟ یہ پہاڑ سا جیون کیسے بتاؤں۔ (ایک دم جوش سے) تو پھر مجھے بھی
مار ڈالو . . . میرے پتی کے خون میں لتھڑی تلوار کو میرا خون بھی چٹا دو، (پاگلوں کی طرح ہنستی ہے) ہاں، ہاں . . . پھر میں ان سے
جا ملوں گی . . . . دیکھتے کیا ہو۔ مارو (آنسو بھر رہے ہیں مگر مسکراتی ہے) اور آنکھیں بند کر کے منتظر کھڑی ہو جاتی ہے
تھوڑی دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتی ہے۔ آنکھوں میں نیا استقلال چمکنے لگتا ہے۔ چہرے پر غرور اور
خود داری جگمگا اٹھتی ہے۔ حقارت سے خیالی بھیڑ کو دیکھتی ہے اور زور سے ڈانٹتی ہے) خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا . . . میں گربھ وتی
ہوں (غرور سے تن کر) گربھ وتی دیوی ہوتی ہے۔ دیوی کا اپمان نہ کرنا۔ اگر تم نے میرے خون کی ایک بوند بھی دھرتی پر ٹپکائی تو
سدا کے لئے بانجھ ہو جائے گی۔ میرا خون پی کر مٹی اناج اگلنا چھوڑ دے گی۔ میرے خون کے دھبے تمہارے ہاتھوں سے دھوئے
نہ چھوٹیں گے۔ میں نئی دنیا کو جنم دینے والی ہوں، میں نئی آشا کی ماں ہوں۔ اگر تم نے مجھے مار دیا تو تمہارا ناس ہو جائے گا
دنیا جنم جنم تک تمہاری صورتوں پر پھٹکار بھیجے گی۔ تمہارا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ دور ہو جاؤ۔ تمہاری تلواریں میرا بال بھی بیکا نہیں
کر سکتیں۔ تمہارے خنجر میری طرف نہیں اٹھ سکتے۔ میں نئی دنیا کو جنم دوں گی (چہرے پر اطمینان اور سکون چھا جاتا ہے)

احمد عباس

اجنتا

(طویل کہانی کا ایک اقتباس)

ہنہ - یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصور یہ بھی تو اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں،
کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو سو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟

"تمہارا کیا خیال ہے، بھارتی . . . ؟"

پر بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی غلام گردش میں
گھوم پھر کر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا۔ اور بھارتی گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے
کہ ممکن ہے وہ تنگ آ کر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی تھی وہ

کالی پڑ چکی تھی۔ شاید آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ . . . . . . ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لئے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لئے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے جو آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کی کسی جیب میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے، منڈے ہوئے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لئے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں اور ہتھوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہو گئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تاکہ جب دیوار اکھڑ جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں اور غار پتھر پہ لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تو نرمل اس پرحیرت منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ اس سنگ تراش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

معاف کیجئے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں سمجھتا تھا۔ کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہی ہے اور یہ ادھورا ہی رہے گا۔"

"دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے۔ مگر ان کی تکمیل ہونی ہی چاہئے۔"

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا

"آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"نو سو برس سے۔"

"نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر . . . . . "

"میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ، ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

"آپ کا نام؟" نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

"میرا نام؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں۔"

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصور کا نام کھدا ہوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"پھر آپ کس لئے اتنا کام کرتے ہیں؟"

"کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا۔ انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے۔"

"تو یہ کام کب ختم ہوگا؟"

"کون جانتا ہے؟"

"اس غار کو . . . ."

"پورا ہونے میں دو سو برس لگیں گے۔ اس کے بعد دوسرا غار، اور اس کے بعد تیسرا . . . . . ؟"

"تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟"

"ہوگی —— جب انسان کی تکمیل ہوگی"

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آ گئی۔ اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مہربانی کر کے مجھے سمجھائیے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لئے؟ یہ پہاڑ کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لئے؟

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آ گیا۔

بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے، آپ لوگوں نے سنگتراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لئے بنائے ہیں، یہ غار دنیا سے، اصلیت سے سچائی سے فرار سکھانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

سنگتراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پرسکون مسکراہٹ تھی۔ جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک، اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

"نہیں"

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اس کے صبر اور سکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟"

"سنو" اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف پتھر پر لوہا پڑنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ اجنتا کا پیغام سنائے گا۔ مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ صرف اس کی چھینی کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پتر چھل کر فرش پر گرتے رہے۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام . . . . . ؟" مگر دفعتاً نرمل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ یہی تھا اجنتا کا پیغام جسے وہ بھکشو نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے مسکرایا، اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا اور نرمل

کو ایسا معلوم ہوا جیسے اسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آب حیات، اکسیر، اس قیمتی نسخے کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی اسے اچھا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک۔ وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر کی دیوار پر پڑتی تھی۔ نرمل کو معلوم ہوتا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہی ہے۔

عمل! عمل! عمل! کام! کام! کام۔ محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح پگھلایا جاتا ہے۔ عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گلکاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی کا رنگ بھرا جاتا ہے عمل سے انسان انسان بنتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے۔ عمل خود عمل کا انعام ہے . . . . .

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز، آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں۔ یہ پتھر ضرور پگھل کر، تمدن کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں۔ ہزاروں مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کی منزل کمال فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں انسان کی فطرت کے پتھر پگھل کر اترتی گے۔ حسن اور خوبصورتی۔ فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں۔ ہزاروں لاکھوں، کروڑوں، تمام انسان مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ اس کی منزل تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز، نرمل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑی۔ زخم سے لال لال لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھریلی فرش پر گر رہی تھیں۔

اور دفعتاً نرمل کو وہ تمام تصویریں یاد آگئیں جو اس نے ان تمام غاروں میں دیکھی تھیں۔ ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ کتنے شاداب تھے ان کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا۔ کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنی جیتی جاگتی ہیں۔ جبھی ان میں اتنی زندگی ہے . . . . .

شاید وہ سو گیا۔ شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا۔ تو غار طلوع آفتاب کی دھیمی دھیمی ترچھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا۔ نہ وہ سنگ تراش تھے۔ نہ مصور، نہ مشعلیں۔

تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا؟ . . . . . . شاید . . . . کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا

"ہاں خواب ہی ہوگا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہو"

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گزرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھلا ہوا ہے جو کل نہیں تھا۔ یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آکر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہونچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا۔ اور اسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لئے پہنچنا ضروری تھا۔ بمبئی سے، فساد سے، زندگی سے، کوئی فرار ممکن نہیں تھا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔

"آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟"

اور نرمل نے جواب دیا

"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!"

۳۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء

میں اسے پی نہ سکوں گا ساقی

نیاز حیدر

جوش ملیح آبادی

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء

شعلوں سے بنایا ہے بصد فکر جمیل
شاطر نے بہ خس خانہ گلزار خلیل
لوہے کی مہیب بیڑیوں کو ہنس کر
چاندی کے کڑوں میں کر دیا ہے تبدیل

نوبہار

یہ بیونت اور یہ کتر، یہ کانٹ چھانٹ ابتری — شناوروں کی ڈبکیاں، مجاہدوں کی بے پری
یہ کوہکن کی کپکپی، یہ پیر زن کی تھرتھری — لباس بزل وجود میں چھپی ہوئی ہے قیصری
شگفتہ برگ ہائے گل کی تہہ میں نوک خار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

یہ مقبلوں کی دشمنی، یہ مفلسوں کی جانکنی — یہ امن سوز شیخیت، یہ کینہ در پرچمی
بدی، برائی۔ بے رخی، بگاڑ بحث بدظنی — کشیدگی، رمیدگی، عناد، بغض، دشمنی
غضب کا خلفشار ہے، بلا کی گیرودار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

قتال و خون و جنگ ہے، جنون جبر و قہر ہے — گرج ہے بات بات میں فساد شہر شہر ہے
فضا پہ رقص مرگ ہے، زمیں پہ موج زہر ہے — سیاہیوں کا زور ہے، تباہیوں کی لہر ہے
کماں میں تیر حرب ہے کمیں میں شہر یار ہے
خزاں کہیں گے ہم کسے اگر یہی بہار ہے

یہ لٹیں، یہ رہزنیں، یہ بگڑیاں، یہ چوریاں — یہ شرمناک چوریاں، اور اس پہ سینہ زوریاں
سبک گراں فروشیاں، ذلیل نفع خوریاں — ادھر خلا ہے بھوک کا ادھر بھری ہیں بوریاں

نہ پیٹ میں نوالہ ہے نہ تن پہ ایک تار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

ادھر مہاجنت ہیں، ادھر کبیر امام ہیں
وہ تنگیوں میں پختہ ہیں یہ وسعتوں میں خام ہیں

مصیبتوں میں آج تک عوام کا شمار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

جگر مرادآبادی

غزل

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصل بہاراں ہے آج کل

جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں
فسطائیت حقیقت عریاں ہے آج کل

کیسا خلوص کس کی محبت، کہاں کا درد
خود زندگی متاع گریزاں ہے آج کل

جو کچھ زبان پر وہ ہوا بن کے اڑ گیا
جو دل میں تھا حقیقت عریاں ہے آج کل

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر
کیا خوب اہتمام گلستاں ہے آج کل

ہے زخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

کہتے ہیں جس کو صورت آزادیٔ وطن
در اصل ایک پیکر بے جاں ہے آج کل

کچھ رہبران خاص جو مخلص ہیں واقعی
ان کا چراغ بھی تہ داماں ہے آج کل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
جو مصلحت کہ پیشہ مرداں ہے آج کل

ساحر لدھیانوی

مفاہمت

نشیب ارض میں ذروں کو مشتعل پاکر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیض وقت وہ دامن کے چاک سل ہی گئے

جہاد ختم ہوا دور آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجوم تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شراب ہوس کے پیمانے

یہ جشن جشنِ مسرت نہیں تماشا ہے — نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں — یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسیں فانوس

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے — اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی، تو نئی فصلِ گل کے آنے تک — ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

فیض احمد فیضؔ



سحر

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر — چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل — کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے — چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے — پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے

بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن — بہت قریب تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور — سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور

جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن — کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی — ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی — نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

سردار جعفری

فریب

ناگہاں شور ہوا — لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آپہونچی

انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہزن ہار گئے
راہرو جیت گئے۔
قافلے دور تھے منزل سے، بہت دور مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چن لیا راہ کے روڑوں کو خزف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہزن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں
ہمنشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبر قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگیٔ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گرد سر راہ کو محمل جانا
گردش حلقۂ گرداب کو ساحل جانا
اب جدھر دیکھو ادھر موت ہی منڈلاتی ہے
در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے

خواب زخمی ہیں امنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول
خوں میں لتھڑے ہوئے پھول
ہیں جنھیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبرو ——— راہزنو
اپنے ایوان حکومت سجا لو ان کو
اپنے گلدان سیاست میں لگا لو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موج پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموس شہیدان وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

(۲)

کون آزاد ہوا
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادر ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کے لئے

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح
قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لئے

کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں ان کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی
اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے

اور سونے کے چمکتے سکے
ڈنک اٹھائے ہوئے پھن پھیلائے
روح اور دل پہ چلا کرتے ہیں
ملک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمائے کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی، گیہوں کے سنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ہم کہاں جائیں، کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں غلامی کے گنہگار ہیں ہم
طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو
اب بھی زندانِ غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

(۳)

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے ابھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور دیاؤں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سرخ پرچم افقِ صبح پہ لہراتے ہیں

کیفی اعظمی

مصالحت

کبھی جسے منہ پہ مل کے نکلے کبھی جسے خوب خوب اچھالا
وہ خوں شہیدوں کا آخرکار رہنماؤں نے بیچ ڈالا
منا چکے جشنِ کامرانی تو یہ حقیقت ہوئی نمایاں
فریب دے کر نجات کا لے لیا غلامی نے اک سنبھالا
اسے گدائی کہوں کہ شاہی نہ یہ گدائی ہے اور نہ شاہی
جبیں پہ کانٹوں کا تاج دستِ طلب میں سونے کا ہے پیالہ
ہزار سکوں میں تھی رقابت مگر بڑھایا جو ہاتھ ہم نے
سب اک تجوری میں جا چھپے ان میں کوئی گورا رہا نہ کالا
سحر کا مژدہ سنانے والو طلوع بے شک سحر ہوئی ہے
مگر وہ کس کام کی سحر جو چرا لے کٹیاؤں کا اجالا

مصالحت کے سکوت میں ہم ہے بغاوت کے ڈھل چکے ہیں
بدلنے اٹھے تھے جو مقدر وہ رہنما خود بدل چکے ہیں
کہاں مفادات حکمرانی، کہاں تقاضائے رہنمائی
بڑھیں گے ٹھکرا کے رہبروں کو وہ قافلے اب جو چل چکے ہیں
خود اپنے چکر میں پھنس گیا ہے نظام سکّے کی گردشوں کا
خود اپنی حدّت سے طوقِ زر کے تمام حلقے پگھل چکے ہیں
دہائی حبِ وطن کی دے کر انھیں کچلنا ہے غیر ممکن
یہ قحط و افلاس کے بھنور جو حکومتوں کو نگل چکے ہیں
مٹے نہ پیچھے نشاں لیڈرو کہ اب محافظ ہو تم نشاں کے
رکے نہ پائے طلب جوانوں کہ سارے کانٹے نکل چکے ہیں

قتیل شفائی

بہلاوے

یہی کفن اوڑھ لو، بدن پر سمور و سنجاب کو بھلا دو
جو تم نے مانگا ہے مل گیا ہے، ہر اک نئے خواب کو بھلا دو
بجھے چراغوں سے روشنی پا، دُمہر و مہتاب کو بھلا دو
اسی لحد میں جیو مرو گے لحد سے آگے محل نہیں ہے

یہ رہنماؤں کی تیز گامی جو ہاتھ مل مل کے رو رہی ہے
یہ اپنی منزل جو منہ لبورے ہوا کے دامن میں سو رہی ہے
یہ رہگذاروں کی دلفریبی جو خون کے بیج بو رہی ہے
نہیں تباہ ضمیرِ انساں انھیں سہاروں پہ جی رہا تھا

یہ زرد چہروں پہ ہانپتے کانپتے افق پار کے فسانے
یہ گرم پیشانیوں کی آنچیں یہ نرم زلفوں کے شامیانے
یہ سرد آہوں میں کسمساتے ہوئے ندامت کے تازیانے
افق کے اس پار جاتے جاتے اک اور منزل پہ آ گئے ہیں

ہزار وعدہ بھی تو کیا ہے بھلا کوئی یوں بہل سکا ہے؟
نگاہ کی خود فریبیوں سے کبھی زمانہ بدل سکا ہے؟
خلاؤں میں تیر مارنے سے کہیں برا وقت ٹل سکا ہے؟
افق کے اس پار جانے والو! مرے تجسس کے ہم خیالو

نیاز حیدر

تشنگی

یہ چھلکتا ہوا جام
میں اسے پی نہ سکوں گا ساقی
آزمائی ہوئی شے
ذائقہ تلخ نشہ پھیکا ہے
چند لمحوں کا سرور
جیسے اک ماہ جبیں دوشیزہ
مسکراتی ہوئی تیزی سے گذر جاتی ہے
چند لمحوں کا سرور
تشنگی ساغرِ مے سے بھی کہیں جاتی ہے
توڑ دے جام و سبو
تشنگی نام ہے جینے کا مجھے جینے دے

تشنگی روزِ ازل سے ہے رفیقِ دل و جاں
تشنگی وجہِ طلب ذوقِ طلب حسنِ طلب
تشنگی پہ ہے زمانے کا مدار
راتیں —— جو آنکھوں ہی آنکھوں میں بسر ہوتی ہیں
راتیں —— جو بجھے پھر اشکوں سے تر ہوتی ہیں
صبح ہوتی ہے تو پی جاتا ہے سورج ان کو
رات ڈھل جاتی ہے شبنم کے حسیں قطروں میں
صبح دم —— پھولوں کے لاکھوں ساغر
منتظر ہوتے ہیں سورج کے لئے
یہ صبوحی کہ جسے پی کے دمک اٹھتا ہے
روئے خورشیدِ جہاں تاب —— شعاعیں جس کی

ناگنیں بن کے ہر اک بوند کو پی جاتی ہیں
بوند۔ آنسو کی ہو یا شبنم کی
کرۂ ارض پہ باقی نہیں رہنے پاتی
خشک ہو جاتے ہیں سب
گل تر۔
دیدۂ تر
کوئی خورشید کی سفاک تپش پی جائے
رات کے چاند کا عالم دیکھو
چاند اک گھونٹ میں پی جاتا ہے سورج کی تپش
شبنم و اشک دعا کرتے ہیں
کہ زمانے میں سحر ہو نہ کبھی
اور یہ سلسلۂ تشنہ لبی
اے خدا دہر میں جاری ہے نہ جانے کب سے
کیسے مانوں لب لعلیں کے ہزاروں بوسے
روح کی پیاس بجھا سکتے ہیں
عشق سیراب نہیں ہو سکتا
یہ چھلکتا ہوا جام
میں اسے پی نہ سکوں گا ساقی

کرشن چندر

پشاور ایکسپریس

جب میں پشاور سے چلی، تو میں نے چھکا چھک اطمینان کا سانس لیا۔ میرے ڈبوں میں زیادہ تر ہندو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پشاور سے ہوتی مردان سے، کوہاٹ سے، چارسدہ سے خیبر سے، لنڈی کوتل سے، بنوں، نوشہرہ، مانسہرہ سے آئے ہوئے تھے اور پاکستان میں اپنے جان و مال کو محفوظ نہ پا کر ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر زبردست پہرہ تھا۔ اور فوج والے بڑی چوکسی سے کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو جو پاکستان میں پناہ گزین اور ہندوستان میں شرنارتھی کہلاتے تھے۔ اس وقت تک چین کا سانس نہ آیا۔ جب تک میں نے پنجاب کی رومان خیز سرزمین کی طرف قدم نہ بڑھائے یہ لوگ شکل و صورت سے بالکل پٹھان معلوم ہوتے تھے، گورے چٹے، مضبوط ہاتھ پاؤں۔ سر پر کلاہ اور لنگی اور جسم پر قمیص اور شلوار، یہ لوگ پشتو میں بات کرتے اور کبھی کبھی نہایت کرخت قسم کی پنجابی میں بات کرتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لئے ہر ڈبے میں دو سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے تھے۔ وجیہہ بلوچی سپاہی، اپنی پگڑیوں کے عقب میں مور کے چھتر کی طرح خوبصورت طرّے لگائے ہوئے، ہاتھوں میں جدید رائفلیں لئے ہوئے ان ہندو پٹھانوں اور ان کے بیوی بچوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے۔ جو ایک تاریخی خوف اور شر کے زیر اثر اس سرزمین سے بھاگے جا رہے تھے۔ جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے تھے جس کی سنگلاخ سرزمین سے انھوں نے توانائی حاصل کی تھی۔ جس کے برفاب چشموں سے انھوں نے پانی پیا تھا۔ جس کے حسین چمن زاروں سے انھوں نے انگوروں کا رس پیا تھا۔ آج یہ وطن یک لخت بیگانہ ہو گیا تھا۔ اور اس نے سینے کے کواڑ ان پر بند کر دئے تھے اور وہ ایک نئے دیس کے تپتے ہوئے میدانوں کا تصور دل میں لئے بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس امر کی مسرت ضرور تھی کہ ان کی جانیں بچ گئی تھیں۔ ان کا بہت سا مال و متاع اور ان کی بہوؤں، بیٹیوں، ماؤں، اور بیویوں کی آبرو محفوظ تھی۔ لیکن ان کا دل رو رہا تھا۔ اور آنکھیں سرحد کے پتھریلے سینے پر یوں گڑی ہوئی تھیں گویا اسے چیر کر اندر گھس جانا چاہتی ہیں۔ اور اس کے شفقت بھرے مامتا کے فوارے سے پوچھنا چاہتی ہیں۔ بول ماں۔ آج کس جرم کی پاداش، تو نے اپنے بیٹوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اپنی بہوؤں کو اس خوبصورت آنگن سے محروم کیا ہے۔ جہاں وہ کل تک سہاگ کی رانیاں بنی بیٹھی تھیں۔ اپنی البیلی کنواریوں کو جو انگور کی بیل کی طرح تیری چھاتی سے لپٹ رہی تھیں جھنجھوڑ کر الگ کر دیا ہے۔ کس لئے آج یہ دیس بدیس ہو گیا ہے۔ میں چلتی جا رہی تھی۔ اور ڈبوں میں بیٹھی ہوئی مخلوق اپنے وطن کی سطح مرتفع، اس کی بلند و بالا چٹانوں۔ اس کے مرغزاروں اس کی شاداب وادیوں، کنجوں اور باغوں کی طرف یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہر جانے پہچانے منظر کو اپنے سینے میں چھپا کے لے جانا چاہتی ہے۔ جیسے نگاہ

ہر لحظہ رک جائے اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس عظیم رنج والم کے بارے میں مقدم بھاری ہوئے جا رہے ہیں اور ریل کی پٹری مجھے جواب دیے جا رہی ہے۔

حسن ابدال تک سب لوگ یوں ہی مخزون، افسردہ، یاس و نکبت کی تصویر بنے رہے حسن ابدال کے اسٹیشن پر بہت سے سکھ آئے ہوئے تھے پنجہ صاحب سے، لمبی لمبی کرپانیں لئے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ بال بچے سہمے سہمے سے، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اپنی ہی تلوار کے گھاؤ سے یہ لوگ خود مر جائیں گے۔ ڈبوں میں بیٹھ کر ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا، اور پھر دوسرے سرحد کے ہندو اور سکھ پٹھانوں سے گفتگو شروع ہو گئی کسی کا گھر بار جل گیا تھا۔ کوئی صرف ایک قمیص اور شلوار میں بھاگا تھا۔ کسی کے پاؤں میں جوتی نہ تھی اور کوئی اتنا ہوشیار تھا کہ اپنے گھر کی ٹوٹی چارپائی تک اٹھا لایا تھا۔ جن لوگوں کا واقعی بہت نقصان ہوا تھا۔ وہ لوگ گم سم بیٹھے تھے۔ خاموش چپ چاپ، اور جس کے پاس کبھی کچھ نہ ہوا تھا۔ وہ اپنی لاکھوں کی جائداد کھونے کا غم کر رہا تھا۔ اور دوسروں کو اپنی فرضی امارت کے قصے سنا سنا کر مرعوب کر رہا تھا۔ اور مسلمانوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ بلوچی سپاہی ایک پروقار انداز میں دروازوں پر رائفلیں تھامے کھڑے تھے۔ اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرا اٹھتے تھے۔

ٹکشیلا کے اسٹیشن پر مجھے بہت عرصے تک کھڑا رہنا پڑا۔ نجانے کس کا انتظار تھا۔ شاید آس پاس کے گاؤں سے ہندو پناہ گزیں آ رہے تھے جب گارڈ نے اسٹیشن ماسٹر سے بار بار پوچھا تو اس نے کہا۔ یہ گاڑی آگے نہ جا سکے گی۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب لوگوں نے اپنا سامان خورد و نوش کھولا۔ اور کھانے لگے۔ سہمے سہمے بچے قہقہے لگانے لگے۔ اور معصوم کنواریاں دریچوں سے باہر جھانکنے لگیں اور بڑے بوڑھے حقے گڑگڑانے لگے تھوڑی دیر کے بعد دور سے شور سنائی دیا اور ڈھولوں کے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ہندو پناہ گزینوں کا جتھا آ رہا تھا شاید، لوگوں نے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ جتھا دور سے آ رہا تھا۔ اور نعرے لگا رہا تھا وقت گزرتا گیا جتھا قریب آتا گیا۔ ڈھولوں کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ جتھے کے قریب آتے ہی گولیوں کی آواز کانوں میں آئی اور لوگوں نے اپنے سر کھڑکیوں سے پیچھے ہٹا لئے۔ یہ ہندوؤں کا جتھا تھا۔ جو آس پاس کے گاؤں سے آیا تھا۔ گاؤں کے مسلمان لوگ اسے اپنی حفاظت میں لا رہے تھے۔ چنانچہ ہر ایک مسلمان نے ایک کافر کی لاش اپنے کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔ جس نے جان بچا کر گاؤں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ دو سو لاشیں نہایت اطمینان سے اسٹیشن پر پہونچ کر بلوچی دستے کے سپرد کیں۔ اور کہا کہ وہ ان مہاجرین کو نہایت حفاظت سے ہندستان کی سرحد پر لے جائے چنانچہ بلوچی سپاہیوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس بات کا ذمہ لیا۔ اور ہر ڈبے میں پندرہ بیس لاشیں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد مجمع نے ہوا میں فائر کیا۔ اور گاڑی چلانے کے لئے اسٹیشن ماسٹر کو حکم دیا۔ میں چلنے لگی تھی کہ پھر مجھے روک دیا گیا اور مجمع کے سرغنے نے ہندو پناہ گزینوں سے کہا کہ دو سو آدمیوں کے چلے جانے سے ان کے گاؤں ویران ہو جائیں گے۔ اور ان کی تجارت تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے وہ گاڑی میں سے دو سو آدمی اتار کر اپنے گاؤں لے جائیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ اپنے ملک کو یوں برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اس پر بلوچی سپاہیوں نے ان کی فہم و ذکا اور ان کی فراست طبع کی داد دی اور ان کی وطن دوستی کو سراہا۔ چنانچہ اس پر بلوچی سپاہیوں نے ہر ڈبے سے کچھ آدمی نکال کر مجمع کے حوالے کئے۔ پورے دو سو آدمی نکالے گئے۔ ایک کم نہ ایک زیادہ

لائن لگاؤ کافرو! سرغنے نے کہا۔ سرغنہ اپنے علاقے کا سب سے بڑا جاگیردار تھا۔ اور اپنے لہو کی روانی میں مقدس جہاد کی گونج سن رہا تھا۔

کافر پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ مجمع کے لوگوں نے انھیں اٹھا اٹھا کر ایک لائن میں کھڑا کیا۔ دو سو آدمی، دو سو زندہ لاشیں چہرے سُتے ہوئے۔ آنکھیں فضا میں تیروں کی بارش سی محسوس کرتی ہوئی۔

یہاں بلوچی سپاہیوں نے کی۔ پندرہ آدمی فائرنگ سے گر گئے۔
یہ ٹکسیلا کا اسٹیشن تھا
بیس اور آدمی کر گئے۔

یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب و تمدن کے گہوارے سے کسب فیض کرتے تھے۔

پچاس اور مارے گئے
ٹکسیلا کے عجائب گھر میں اتنے خوبصورت بت تھے، اتنے حسین سنگ تراشی کے نادر نمونے، قدیم تہذیب کے جھلملاتے ہوئے چراغ۔

پچاس اور مارے گئے
پس منظر میں سرکوپ کا محل تھا۔ اور کھیلوں کا امفی تھیٹر اور میلوں تک پھیلے ہوئے ایک وسیع شہر کے کھنڈر، ٹکسیلا کی گذشتہ عظمت کے پرشکوہ منظر۔

تیس اور مارے گئے
یہاں کنشک نے حکومت کی تھی۔ اور لوگوں کو امن و آشتی اور حسن و دولت سے مالامال کر دیا تھا۔
پچیس اور ختم ہو گئے
یہاں بدھ کا نغمۂ عرفاں گونجا تھا۔ یہاں بھکشوؤں نے امن و صلح و آشتی کا درس حیات دیا تھا۔
اب آخری گروہ کی اجل آگئی تھی۔

یہاں پہلی بار ہندوستان کی سرحد پر اسلام کا پرچم لہرایا تھا۔ مساوات اور اخوت اور انسانیت کا پرچم
سب مر گئے۔ اللہ اکبر۔ فرش خون سے لال تھا۔ اور جب میں پلیٹ فارم سے گذری تو میرے پاؤں ریل کی پٹری سے پھسلے جاتے تھے۔ جیسے میں ابھی گر جاؤں گی۔ اور گر کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی ختم کر ڈالوں گی۔
ہر ڈبے میں موت آگئی تھی۔ اور لاشیں درمیان میں رکھ دی گئی تھیں۔ اور زندہ لاشوں کا ہجوم چاروں طرف تھا۔ اور بلوچی سپاہی مسکرا رہے تھے۔ کہیں کوئی بچہ رونے لگا۔ کسی بوڑھی ماں نے سسکی لی۔ کسی کے لٹے ہوئے سہاگ نے آہ کی۔ اور میں چیختی چلاتی راولپنڈی کے پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوئی۔

یہاں سے کوئی پناہ گزین گاڑی پر سوار نہ ہوا۔ ایک ڈبے میں چند مسلمان پندرہ بیس برقعہ پوش عورتوں کو لے کر سوار ہوئے۔ ہر نوجوان رائفل سے مسلح تھا۔ ایک ڈبے میں بہت سا سامان جنگ لادا گیا۔ مشین گنیں اور کارتوس، پستول، اور رائفلیں۔
جہلم اور گوجر خاں کے درمیانی علاقے میں مجھے سگنل کھینچ کر کھڑا کر دیا گیا۔ میں رک گئی۔ مسلح نوجوان گاڑی سے اترنے لگے۔ برقعہ پوش خواتین نے شور مچانا شروع کیا۔ ہم ہندو ہیں۔ ہم سکھ ہیں۔ ہمیں زبردستی لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے برقعے پھاڑ دیئے اور چلانے لگیں۔ نوجوان مسلمان ہنستے ہوئے انھیں گھسیٹ کر گاڑی سے نکال لائے۔

ہاں یہ ہندو عورتیں ہیں۔ ہم انھیں راولپنڈی سے ان کے آرام دہ گھروں، ان کے خوشحال گھرانوں، ان کے عزت دار ماں باپ سے چھین کر لائے ہیں۔ اب یہ ہماری ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتے ہیں۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو انھیں ہم سے چھین کر لے جائے۔

سرحد کے دو نوجوان ہندو پٹھان چھلانگ مار کر گاڑی سے اتر گئے۔ بلوچی سپاہیوں نے نہایت اطمینان سے فائر کر کے انھیں ختم کر دیا۔ ہندو بیس نوجوان اور نکلے۔ انھیں مسلح مسلمانوں کے گروہ نے منٹوں میں ختم کر دیا۔ دراصل گوشت کی دیوار لوہے کی گولی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، نوجوان ہندو عورتوں کو گھسیٹ کر جنگل میں لے گئے اور میں منہ چھپا کر وہاں سے بھاگی۔ کالا، خوفناک سیاہ دھواں میرے منہ سے نکل رہا تھا۔ جیسے کائنات پر خباثت کی سیاہی چھا گئی۔ اور سانس میرے سینے میں یوں الجھنے لگی۔ جیسے یہ آہنی چھاتی ابھی پھٹ جائے گی اور اندر بھڑکتے ہوئے لال لال شعلے اس جنگل کو خاک سیاہ کر ڈالیں گے جو اس وقت میرے آگے پیچھے پھیلا ہوا تھا۔ اور جس نے ان ہندو عورتوں کو چشم زدن میں نگل لیا تھا۔

لالا موسیٰ کے قریب لاشوں سے اتنی مکروہ سڑاند نکلنے لگی کہ بلوچی سپاہی اسے باہر پھینکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے ایک آدمی کو بلاتے اور اس سے کہتے۔ اس لاش کو اٹھا کر یہاں لاؤ دروازے پر اور جب وہ آدمی ایک لاش اٹھا کر دروازے پر لاتا تو وہ اسے گاڑی کے باہر دھکا دے دیتے۔ تھوڑی دیر ہی میں سب لاشیں ایک ایک ہمراہی کے ساتھ باہر پھینک دی گئیں۔ اور ڈبے میں آدمی کم ہو جانے سے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ بھی ہو گئی۔

پھر لالہ موسیٰ گذر گیا اور وزیر آباد آگیا۔ وزیر آباد کا مشہور جنکشن، وزیر آباد کا مشہور شہر جہاں ہندوستان بھر کے لئے چھریاں اور چاقو تیار ہوتے ہیں۔ وزیر آباد جہاں کے ہندو اور مسلمان صدیوں سے بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ اور اس کی خوشیوں میں اکٹھے حصہ لیتے ہیں۔ وزیر آباد کا اسٹیشن لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ شاید یہ لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ لاشوں کا میلہ۔ شہر میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور اسٹیشن کے قریب انگریزی بینڈ کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ اور ہجوم کی پرشور تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آگیا۔ آگے آگے دیہاتی ناچتے اور گاتے آرہے تھے۔ اور ان کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم تھا۔ مادر زاد ننگی عورتیں۔ بوڑھی، نوجوان، بچیاں، دادیاں اور پوتیاں، مائیں اور بہوئیں اور بیٹیاں، کنواریاں اور حاملہ عورتیں، ناچتے گاتے ہوئے مردوں کے نرغہ میں تھیں، عورتیں ہندو اور سکھ تھیں اور مرد مسلمان تھے۔ اور دونوں نے مل کر یہ عجیب بیساکھی منائی تھی۔ عورتوں کے بال کھلے ہوئے تھے، ان کے جسموں پر زخموں کے نشان تھے اور وہ اس طرح سیدھی تن کر چل رہی تھیں۔ جیسے ہزاروں کپڑوں میں ان کے جسم چھپے ہوں۔ جیسے ان کی روحوں پر سکون آمیز موت کے دبیز سائے چھا گئے ہوں۔ ان کی نگاہوں کا جلال دروپدی کو بھی شرماتا تھا۔ اور ہونٹ دانتوں کے اندر یوں بھینچے ہوئے تھے۔ گویا کسی مہیب لاوے کا منہ بند کئے ہوئے ہیں۔ شاید ابھی یہ لاوا پھٹ پڑے گا۔ اور اپنی آتش فشانی سے دنیا کو جہنم زار بنا دے گا۔

مجمع میں سے آوازیں آئیں "پاکستان زندہ باد"!

اسلام زندہ باد۔ قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد

ناچتے تھرکتے ہوئے قدم پرے ہٹ گئے۔ اور اب یہ عجیب و غریب ہجوم ڈبوں کے عین سامنے تھا۔ ڈبوں میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے گھونگھٹ کاڑھ لئے اور ڈبے کی کھڑکیاں یکے بعد دیگرے بند ہونے لگیں۔

بلوچی سپاہیوں نے کہا۔ کھڑکیاں مت بند کرو، کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔ بلوچی سپاہیوں نے بندوقیں تان لیں، ٹھائیں ٹھائیں پھر بھی کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔ اور پھر ڈبے میں ایک کھڑکی کھلی نہ رہی۔ ہاں کچھ پناہ گزین ضرور مر گئے۔

ننگی عورتیں پناہ گزینوں کے ساتھ بٹھا دی گئیں۔ اور میں اسلام زندہ باد اور قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعروں کے درمیان رخصت ہوئی۔

گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک بچہ لڑھکتا لڑھکتا ایک بوڑھی دادی کے پاس چلا گیا۔ اور اس سے پوچھنے لگا "ماں تم نہا کے آئی ہو؟"

دادی نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا، ہاں ننھے، آج مجھے میرے وطن کے بیٹوں نے بے بہا بیٹوں نے ہلایا ہے۔

تمہارے کپڑے کہاں ہیں اماں؟

ان پر میرے سہاگ کے خون کے چھینٹے تھے بیٹا۔ وہ لوگ انھیں دھونے کے لئے لے گئے ہیں۔ وہ تنگی لڑکیوں نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور میں چیختی چلاتی آگے بھاگی۔ اور لاہور پہنچ کر دم لیا۔

مجھے نمبر ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا۔ نمبر ۲ پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ امرتسر سے آئی تھی۔ اور اس میں مسلمان پناہ گزین بند تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلم خدمت گار سبز ڈبوں کی تلاشی لینے لگے۔ اور زیور نقدی اور دوسرا قیمتی سامان مہاجرین سے لے لیا گیا۔ اس کے بعد چار سو آدمی ڈبوں سے نکال کر اسٹیشن پر کھڑے کئے گئے۔ یہ مذبح کے بکرے تھے۔ کیونکہ ابھی ابھی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر جب مسلم مہاجرین کی گاڑی آکے رکی تھی۔ اس میں چار سو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس مسلم عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں۔ اس لئے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکال لی گئیں اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تاکہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔

مسلم خدمت گاروں نے ایک دائرہ بنا رکھا تھا۔ اور چھرے ہاتھ میں تھے اور دائرے میں باری باری ایک مہاجر ان کے چھرے کی زد میں آتا تھا اور بڑی چابکدستی اور شائستگی سے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ چند منٹوں میں چار سو آدمی ختم کر دئے گئے اور پھر میں آگے چلی۔ اب مجھے اپنے جسم کے ذرے ذرے سے گھن آنے لگی تھی۔ اس قدر پلید اور متعفن محسوس کر رہی تھی میں جیسے مجھے شیطان نے سیدھا جہنم سے دھکا دے کر پنجاب میں بھیج دیا ہو۔ اٹاری پہنچ کر فضا بدل سی گئی۔ مغل پورہ ہی سے بلوچی سپاہی بدلے گئے تھے۔ اور ان کی جگہ ڈوگروں اور سکھ سپاہیوں نے لی تھی۔ لیکن اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرط مسرت سے باغ باغ ہوگئے آزاد ہندوستان کی سرحد آگئی تھی۔ ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا۔ اور جب میں امرتسر اسٹیشن پر پہنچی تو سکھوں کے نعروں نے زمین آسمان کو گونجا دیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر تھے اور ہندو، جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے تھے "کوئی شکار ہے" مطلب یہ کہ کوئی مسلمان ہے۔

ایک ڈبے میں چار ہندو براہمن سوار ہوئے۔ سر گھٹا ہوا، لمبی چوٹی، رام نام کی دھوتی باندھے، ہردوار کا سفر کر رہے تھے یہاں ہر ڈبے میں آٹھ دس سکھ اور جاٹ بھی بیٹھ گئے۔ یہ لوگ رائفلوں اور بلموں سے مسلح تھے۔ اور مشرقی پنجاب میں شکار کی تلاش میں جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے دل میں کچھ شبہہ سا ہوا۔ اس نے ایک براہمن سے پوچھا۔

براہمن دیوتا کدھر جا رہے ہو؟

ہردوار۔ تیرتھ کرنے

"ہردوار جا رہے ہو کہ پاکستان جا رہے ہو"

میاں اللہ اللہ کرو۔ دوسرے براہمن کے منہ سے نکلا

جاٹ ہنسا۔ تو آؤ اللہ اللہ کریں۔ او نتھا سنگھاں، شکار مل گیا آ او، آؤ رہیلا، اللہ بیلی کر لے۔ اتنا کہہ کر جاٹ نے بلم نقلی براہمن کے سینے میں مارا۔ یہ دیکھ کر دوسرے براہمن بھاگنے لگے۔ جاٹوں نے انھیں پکڑ لیا۔ ایسے نہیں براہمن دیوتا۔ ذرا ڈاکٹری معائنہ کراتے جاؤ۔ ہردوار جانے سے پہلے ڈاکٹری معائنہ بہت ضروری ہے نا

ڈاکٹری معائنے مراد یہ تھی کہ وہ لوگ ختنہ دیکھتے تھے اور جس کے ختنہ ہوا ہوتا اسے وہیں مار ڈالتے۔ چاروں مسلمان جو براہمن کا روپ بدل کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ وہیں مار ڈالے گئے اور میں آگے چلی۔

راستے میں ایک جگہ جنگل میں مجھے یک لخت کھڑا کر دیا گیا۔ اور لوگ یعنی مہاجرین اور سپاہی اور جاٹ اور سکھ سب نکل نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے سوچا کہ شاید مسلمانوں کی بہت بڑی فوج ان پر حملہ کرنے کے لئے آ رہی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ جنگل میں بہت سارے مسلمان مزارع اپنے بیوی بچوں کو لئے چھپے بیٹھے ہیں۔ ست سری اکال اور ہندو دھرم کی جے کے نعروں کی گونج سے جنگل کانپ اٹھا اور وہ لوگ نرغے میں آ گئے۔ آدھے گھنٹے میں سب صفایا ہو گیا۔ بڈھے، جوان، بچے اور عورتیں سب مار ڈالے گئے۔ ایک جاٹ کے نیزے پر ایک ننھے سے بچے کی لاش تھی، اور وہ اسے ہوا میں گھما گھما کر کہہ رہا تھا۔ آئی بیساکھی۔ آئی بیساکھی۔ جٹا لائے ہے ہے۔

جالندھر سے ادھر پٹھانوں کا ایک گاؤں تھا۔ یہاں پر گاڑی روک کر لوگ گاؤں میں گھس۔ سپاہی۔ مہاجرین اور جاٹ پٹھانوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں مارے گئے۔ بچے اور مرد ہلاک ہو گئے تو عورتوں کی باری آئی۔ اور وہیں اسی کھلے میدان میں جہاں گیہوں کے کھلیان لگائے جاتے تھے اور سرسوں کے پھول مسکراتے تھے اور عفت مآب بیویاں اپنے خاوندوں کی نگاہ شوق کی تاب نہ لا کر کمزور شاخوں کی طرح جھکی جھکی جاتی تھیں۔ اسی وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کی لافانی الفت کے ترانے گائے تھے۔ انھیں شیشم، سرس اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چکلے آباد ہوئے۔ پچاس عورتیں اور پانچ سو خاوند، پچاس بھیڑیں اور پانسو قصاب، پچاس سوہنیاں اور پانسو مہینوال شاید اب کوئی وارث شاہ کی ہیر نہ گائے گا۔ شاید اب مرزا صاحباں کی داستان الفت وعفت ان میدانوں میں کبھی نہ گونجے گی۔ لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر، اور ان کی آئندہ سات پشتوں پر، جنھوں نے اس خوبصورت پنجاب، اس البیلے، پیارے، سنہرے پنجاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے تھے۔ اور اس کی پاکیزہ روح کو گہنا دیا تھا اور اس کے مضبوط جسم میں نفرت کی پیپ بھر دی تھی۔ آج پنجاب مر گیا تھا۔ اس کے نغمے گنگ ہو گئے تھے اس کے گیت مردہ۔ اس کی زبان مردہ۔ اس کا بے باک، نڈر۔ بھولا بھالا دل مردہ، اور نہ محسوس کرتے ہوئے، اور آنکھ اور کان نہ رکھتے ہوئے بھی میں نے پنجاب کی موت دیکھی اور خوف سے اور حیرت سے میرے قدم اس پٹڑی پر رک گئے

پٹھان مردوں اور عورتوں کی لاشیں اٹھائے جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے اور سرحدی ہندو واپس آئے اور میں آگے چلی۔ آگے ایک نہر آتی تھی۔ ذرا ذرا وقفے کے بعد روک دی جاتی تھی۔ جوں ہی کوئی ڈبہ نہر کے پل پر سے گزرتا۔ لاشوں کو عین نیچے نہر کے پانی میں گرا دیا جاتا اس طرح جب ہر ڈبے کے رکنے کے بعد سب لاشیں پانی میں گرا دی گئیں تو لوگوں نے دیسی شراب کی بوتلیں کھولیں اور میں خون اور شراب اور نفرت کی بھاپ اگلتی ہوئی آگے بڑھی۔

لدھیانہ پہونچ کر لٹیرے گاڑی سے اتر گئے اور شہر میں جا کر انھوں نے مسلمانوں کے محلوں کا پتہ ڈھونڈ نکالا اور وہاں حملہ کیا اور لوٹ مار کی، اور مال غنیمت اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تین چار گھنٹوں کے بعد اسٹیشن پر واپس آئے۔ جب تک لوٹ مار نہ ہو چکتی جب تک دس بیس مسلمانوں کا خون نہ ہو چکتا جب تک سب مہاجرین اپنی نفرت کو آلودہ نہ کر لیتے۔ میرا آگے بڑھنا دشوار کیا ناممکن تھا۔ میری روح میں اتنے گھاؤ تھے، اور میرے جسم کا ذرہ ذرہ گندے ناپاک خونیوں کے قہقہوں سے اس طرح رچ گیا تھا۔ کہ مجھے غسل کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس سفر میں کوئی مجھے نہانے نہ دے گا۔

انبالہ اسٹیشن پر رات کے وقت میرے ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں۔ ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی اور بچے سوار ہوئے اسی ڈبے میں ایک سردار صاحب اور ان کی بیوی بھی تھی۔ فوجیوں کے پہرے میں مسلمان ڈپٹی کمشنر گاڑی میں سوار کرا دیا گیا اور فوجیوں کو ان کی جان و مال کی سخت تاکید کر دی گئی۔

رات کے دو بجے میں انبالے سے چلی اور دس میل آگے جا کر روک دی گئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اندر سے بند تھا۔ اس لئے

کھڑکی کے شیشے توڑ کر لوگ اندر آ گئے اور ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی اور بڑی خوبصورت۔ وہ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ دو ایک نوجوان نے سوچا اسے بچا لیا جائے۔ یہ حسن۔ یہ رعنائی، یہ تازگی۔ یہ جوانی کسی کے کام آ سکتی ہے اتنا سوچ کر انھوں نے لڑکی کو اور زیورات کے بکس کو سنبھالا، اور گاڑی سے اتر کر جنگل میں چلے گئے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

یہاں یہ کانفرنس شروع ہوئی۔ لڑکی کو چھوڑ دیا جائے یا مار دیا جائے۔

لڑکی نے کہا۔ مجھے مارتے کیوں ہو؟ مجھے ہندو کر لو۔ میں تمہارے مذہب میں داخل ہوئی جاتی ہوں۔ تم میں سے کوئی ایک مجھ سے بیاہ کر لے۔ میری جان لینے سے فائدہ!

ٹھیک تو کہتی ہے ایک بولا، میرے خیال میں

دوسرے نے قطع کلام کرتے ہوئے اور لڑکی کے پیٹ میں چھرا بھونکتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے چلو گاڑی میں واپس چلو۔ کیا کانفرنس لگا رکھی ہے تم نے۔

لڑکی جنگل میں گھاس کے فرش پر تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس کی کتاب اس کے خون سے تر بتر ہو گئی۔ کتاب کا عنوان تھا "اشتراکیت عمل اور فلسفہ از جان سٹریچی"۔ وہ ذہین لڑکی ہوگی۔ اس کے دل میں اپنے ملک و قوم کی خدمت کے ارادے ہوں گے۔ اس کی روح میں کسی سے محبت کرنے کسی کو چاہنے، کسی کے گلے لگ جانے، کسی بچے کو دودھ پلانے کا جذبہ ہوگا۔ وہ لڑکی تھی۔ وہ ماں تھی، وہ بیوی تھی۔ وہ محبوبہ تھی۔ وہ کائنات کی تخلیق کا مقدس راز تھی۔ اور اس کی لاش جنگل میں پڑی تھی۔ اور گیدڑ اور گدھ اور کوئے اس کی لاش کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

اشتراکیت، فلسفہ اور عمل — وحشی درندے انھیں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ اور کوئی نہیں بولتا۔ اور کوئی آگے نہیں بڑھتا اور کوئی عوام میں سے انقلاب کا دروازہ نہیں کھولتا۔ اور میں رات کی تاریکی آگ اور شرار دل کو چھپا کے آگے بڑھ رہی ہوں اور میرے ڈبے میں لوگ شراب پی رہے ہیں اور مہاتما گاندھی کے جے کارے بلا رہے ہیں۔

ایک عرصے کے بعد میں واپس بمبئی آئی ہوں، یہاں مجھے نہلا دھلا کر شیڈ میں رکھ دیا گیا ہے۔ میرے ڈبوں میں اب شراب کے بھپارے نہیں ہیں، خون کے چھینٹے نہیں ہیں۔ وحشی، خونی قہقہے نہیں ہیں، مگر رات کی تنہائی میں جیسے بھوت جاگ اٹھتے ہیں۔ مردہ روحیں بیدار ہو جاتی ہیں اور زخمیوں کی چیخیں اور عورتوں کے بین اور بچوں کی پکار، ہر طرف فضا میں گونجنے لگتی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اب مجھے کبھی کوئی اس سفر پر نہ لے جائے۔ میں اس شیڈ سے باہر نہیں نکلنا چاہتی۔ میں اس خوفناک سفر پر دوبارہ نہیں جانا چاہتی۔ اب میں اس وقت جاؤں گی جب میرے سفر پہ دو طرفہ سنہرے گیہوں کے کھلیان لہرائیں گے اور سرسوں کے پھول جھوم جھوم کر پنجاب کے رسیلے الفت بھرے گیت گائیں گے اور کسان ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کھیت کاٹیں گے۔ بیج بوئیں گے۔ ہرے ہرے کھیتوں میں نلائی کریں گے۔ اور ان کے دلوں میں دہرہ دفا اور آنکھوں میں شرم اور روحوں میں عورت کے لئے پیار اور محبت اور عزت کا جذبہ ہوگا۔

میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے۔ میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی۔ میں کوئلہ اور تیل اور لوہا لے کر کارخانوں میں جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لئے نئے حل اور نئی کھاد مہیا کروں گی۔ میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کے جاؤں گی۔ اور با عصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی، اور ان کے آنچلوں میں ننھے منے خوبصورت بچوں کے چہرے کنول کے پھولوں کی طرح کھلے نظر آئیں گے۔ اور وہ اس موت کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی جھک کر

سلام کریں گے۔ جب نہ کوئی ہندو رہے گا۔ نہ مسلمان ہوگا۔ بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے۔

عصمت چغتائی

جڑیں

سب کے چہرے فق تھے گھر میں کھانا بھی نہ پکا تھا۔ آج چھٹا روز تھا۔ بچے اسکول چھوڑے گھروں میں بیٹھے اپنی اور سارے گھر والوں کی زندگی وبال کئے دے رہے تھے۔ وہی مارکٹائی۔ دھول دھپا، وہی اودھم اور قلابازیاں جیسے پندرہ اگست آیا ہی نہ ہو۔ کمبختوں کو یہ بھی خیال نہیں کہ انگریز چلے گئے اور چلتے چلتے ایسا گہرا گھاؤ مار گئے جو برسوں رسے گا۔ ہندستان پر عمل جراحی کچھ ایسے لنجے ہاتھوں اور کھٹل نشتروں سے ہوا ہے کہ ہزاروں شریانیں کٹ گئی ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، کسی میں اتنی سکت نہیں کہ ٹانکہ لگا سکے۔

کوئی اور معمولی دن ہوتا تو کمبختوں سے کہا جاتا، باہر کالا منہ کرکے غدر مچاؤ۔ لیکن چند روز سے شہر کی فضا ایسی غلیظ ہو رہی تھی کہ شہر کے سارے مسلمان ایک طرح سے نظر بند بیٹھے تھے۔ گھروں میں تالے پڑے تھے اور باہر پولیس کا پہرا تھا۔ لہٰذا کلیجے کے ٹکڑوں کو سینے ہی پر کودوں دلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ویسے سول لائنس میں امن ہی تھا۔ جیسا کہ عام طور پر رہتا ہے۔ یہ تو گندگی اسی جگہ زیادہ اچھلتی ہے۔ جہاں چہ بچے ہوتے ہیں یا جہاں غربت ہوتی ہے۔ وہیں جہالت کے گھورے پر نام نہاد مذہب کے ڈھیر بچھاتے ہیں اور یہ ڈھیر کریدے جا چکے تھے۔ اوپر سے پنجاب سے آنے والوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی تعداد اقلیت کے دل میں دہشت بٹھا رہی تھی۔ غلاظت کے ڈھیر تیزی سے کریدے جا رہے تھے۔ اور عفونت رینگتی رینگتی صاف ستھری سڑکوں پر بھی پہنچ چکی تھی۔ دو چار جگہ تو کھلم کھلا مظاہرے بھی ہوئے۔ لیکن مارواڑ کی ریاستوں کے ہندو مسلمان کی اس قدر ملتی جلتی معاشرت ہے کہ انھیں نام صورت یا لباس سے بھی باہر والے مشکل سے پہچان سکتے ہیں۔ باہر والے اقلیت کے لوگ جو آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے۔ وہ تو پندرہ اگست کی بو پاکر ہی پاکستان کی حدود میں کھسک لئے تھے۔ رہے ریاست کے قدیم باشندے تو نہ ہی ان میں اتنی سمجھ اور نہ ہی ان کی اتنی حیثیت کہ پاکستان اور ہندستان کا دقیق مسئلہ انھیں کوئی بیٹھ کر سمجھاتا۔ جنھیں سمجھنا تھا وہ سمجھ چکے تھے۔ اور وہ محفوظ ہو چکے تھے۔ باقی کے جو یہ سن کر گئے کہ چار سیر کا گیہوں اور چار آنے کی ہاتھ بھر کی لمبی نان پاؤ ملتی ہے۔ وہ لوٹ رہے تھے۔ کیونکہ وہاں جا کر انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ چار سیر کا گیہوں خریدنے کے لئے ایک روپیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ کے لئے پوری چونی دینی پڑتی ہے اور یہ روپیہ اٹھنیاں نہ ہی کسی دکان پر ملیں اور نہ کھیتوں میں اگیں۔ انھیں حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا زندہ رہنے کی تگ و دو۔

لہٰذا جب کھلم کھلا علاقوں سے اقلیت کو نکالنے کی رائے ہوئی تو بڑی مشکل پڑی۔ ٹھاکروں نے صاف کہہ دیا کہ صاحب رعایا ایسی گتھی ملی رہتی ہے کہ مسلمانوں کو چن چن کر نکالنے کے لئے باقاعدہ اسٹاف کی ضرورت ہے جو کہ بے کار کا زائد خرچ ہے ویسے آپ اگر کوئی ٹکڑے زمین کے ترنار کھیتوں کے لئے خریدنا چاہیں تو وہ خالی کرائے جا سکتے ہیں۔ جانور تو رہتے ہی ہیں۔ جب کہئے جنگل خالی کرا دیا جائے۔

اب باقی رہ گئے چند گنے چنے خاندان، جو یا تو مہاراجہ کے چہیتے جانوٹوں میں سے تھے اور جن کے جانے کا سوال نہ تھا۔ وہ جو جانے کو تلے بیٹھے تھے۔ وہی بستر بندھ رہے تھے۔ ہمارا خاندان بھی اس فہرست میں آتا تھا۔ جب تک بڑے بھائی اجمیر سے نہ آئے تھے۔ کچھ ایسی جلدی نہ تھی۔ مگر انھوں نے تو آکر بوکھلا ہی دیا۔ پھر بھی کسی نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ تو شاید کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی اور برسوں اسباب نہ بندھ چکتا۔ جو اللہ بھلا کرے چھبا میاں کا وہ پینترا نہ چلتے۔ بڑے بھائی تو جانے ہی والے تھے۔ کہہ کہہ کر ہار گئے تھے۔ تو میاں چھبا نے کیا کیا کہ ایک دم اسکول کی دیوار پر "پاکستان زندہ باد" لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ودیہ منند جی نے بچوں نے اس کی مخالفت کی اور فوراً بگاڑ کر "اکھنڈ ہندوستان" لکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ چل گیا جوتا اور ایک دوسرے ہی

ہاتھ کو کچھ کو نگاتی تھیں۔ آج خالی تھی۔ کمرہ بڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وحشت زدہ ہو کر وہ لوٹ پڑیں مگر چھوٹے ہوئے تخیل کے قدم نہ رک سکیں وہ دوسرے کمرے میں جا کر کھڑا گئیں۔ یہیں تو زندگی کے ساتھی نے پچاس برس کے نباہ کے بعد منہ موڑا تھا۔ یہیں دروازے کے سامنے کفنائی ہوئی لاش رکھی تھی۔ سارا کنبہ گھیرے کھڑا تھا۔ خوش نصیب تھے وہ جو اپنے پیاروں کی گود میں سدھارے۔ پر زندگی کی ساتھی کو چھوڑ گئے۔ جو آج بے کفنائی لاش کی طرح لاوارث پڑی رہ گئی۔ پیروں نے جواب دے دیا اور وہیں بیٹھ گئیں۔ جہاں میت کے سرہانے دس برس ان کپکپاتے ہاتھوں نے چراغ جلایا تھا۔ پر آج چراغ میں تیل نہ تھا۔ اور بتی بھی ختم ہو چکی تھی۔

اور سامنے روپ چند اپنے برآمدے میں زور زور سے ٹہل رہے تھے۔ گالیاں دے رہے تھے۔ اور پھر زور زور سے ٹہل رہے تھے۔ سب کو گالیاں دے رہے تھے۔ اپنے بیوی بچوں کو نوکروں کو سرکار کو اور سامنے پھیلی ہوئی بے زبان سڑک کو، اینٹ پتھر کو اور چاقو چھری کو حتی کہ پوری کائنات ان کی گالیوں کی بمباری کے آگے سہمی دبکی بیٹھی تھی۔ اور خاص طور پر اس خالی گھر کو جو سڑک کے اس پار کھڑا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ جیسے خود انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی اینٹ سے اینٹ ٹکرا دی ہو۔ وہ کوئی چیز اپنے دماغ میں سے جھٹک دینا چاہتے تھے۔ ساری قوتوں کی مدد سے نوچ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ مگر ناکام سے جھنجھلا اٹھتے تھے۔ کینہ کی جڑوں کی طرح جو چیز ان کے وجود میں جم چکی تھی۔ وہ اسے پوری طاقت سے کھینچ رہے تھے مگر ساتھ ساتھ جیسے ان کا گوشت کھنچا چلا آتا ہو، وہ کراہ کر چھوڑ دیتے تھے۔ پھر ایک دم ان کی گالیاں بند ہو گئیں اور وہ موٹر میں بیٹھ کر چل دیے۔

رات کو جب گلی کی نکڑ پر سناٹا چھا گیا۔ تو پچھلے دروازے سے روپ چند کی بیوی دو پردہ سی ہوئی تھالیاں اوپر نیچے دھرے چوروں کی طرح داخل ہوئیں۔ دونوں بوڑھی عورتیں خاموش ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئیں، زبانیں بند رہیں۔ آنکھیں سب کچھ کہہ سن رہی تھیں دونوں تھالیوں کا کھانا جوں کا توں رکھا تھا۔ عورتیں جب کسی کی غیبت کرتی ہیں تو ان کی زبانیں کترنی کی طرح چل نکلتی ہیں۔ پر جہاں جذبات نے حملہ کیا اور منہ میں تالے پڑ گئے۔

رات بھر نہ جانے کتنی دیر پریشانیاں اکیلا پا کر سنجوں مارتی رہیں۔ نہ جانے راستے ہی میں تو سب نہ ختم ہو جائیں گے۔ آج کل تو اکا دکا نہیں پوری پوری ریلیں کٹ رہی ہیں۔ پچاس برس خون سے سینچ کر کھیتی تیار کی اور آج وہ دیس نکالا لے کر نئی زمین کی تلاش میں افتاں و خیزاں چل پڑی تھی۔ کون جانے نئی زمین ان پودوں کو راس آئے نہ آئے۔ کمھلا تو نہ جائیں گے یہ غریب الوطن پودے! چھوٹی بہو تو اللہ رکھے ان کا مہینہ ہے نہ جانے کسی جنگل میں زچہ خانہ بنے۔ گھر بار نوکری بیوپار سب کچھ چھوڑ کر چل پڑے ہیں۔ نئے وطن میں چل کر کون نے کچھ جوڑا بھی ہوگا۔ یا یہ منہ تکتے ہی لوٹ آئیں گے۔ اور جو لوٹ کر آئے تو پھر سے جڑیں پکڑنے کا بھی موقع ملے گا یا نہیں۔ کون جانے یہ بوڑھا ٹھونٹ بہار کے لوٹ آنے تک زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔

گھنٹوں سڑن باؤلیوں کی طرح دیوار پاکھوں سے لپٹ لپٹ کر نہ جانے کیا بکتی رہیں۔ پھر نڈھال ہو کر پڑ گئیں۔ نیند کہاں؟ ساری رات بوڑھا جسم جوان بیٹوں کی کٹی پھٹی لاشیں نوعمر بہوؤں کے برہنہ جلوس اور پوتوں نواسوں کے چیتھڑے دیکھ دیکھ کر تھرتھراتا رہا۔ نہ جانے کب غفلت نے حملہ کر دیا۔

کہ ایک دم ایسا معلوم ہوا دروازے پر دن بھر کا غدر ڈھے پڑا ہے۔ جان پیاری نہ سہی، پر بنا تیل کا دیا بھی بجھتے وقت کانپ تو اٹھتا ہی ہے۔ اور پھر سیدھی سادھی موت ہی کیا بے رحم ہوتی ہے۔ جو اوپر سے وہ انسان کا بھوت بن کر آئے۔ سنا ہے بڑھیوں تک کو بال پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھال چھل کر ہڈیاں جھلک آتی ہیں اور پھر وہیں دنیا کے وہ عذاب نازل ہوتے ہیں جن کے خیال سے دوزخ کے فرشتے بھی زرد پڑ جائیں۔

پراماں کا ٹرنک جوں کا توں رکھا رہا۔

"آپ کا ارادہ یہاں مرنے کا ہے تو کون روک سکتا ہے" بھائی صاحب نے آخر میں کہا۔

اور میری معصوم صورت کی بھولی سی اماں بھٹکتی آنکھوں سے گدلے آسمان کو تکتی رہیں جیسے وہ خود اپنے آپ سے پوچھتی ہوں کون مار ڈالے گا؟ اور کب؟

"اماں تو سٹھیا گئی ہیں اس عمر میں عقل ٹھکانے نہیں" منجھلے بھائی کان میں کھسپسائے۔

"کیا معلوم انھیں کہ کافروں نے معصوموں پر تو اور بھی ظلم ڈھائے ہیں، اپنا وطن ہوگا تو جان و مال کا تو اطمینان رہے گا"

اگر میری کم سخن اماں کی زبان تیز ہوتی تو ضرور کہتیں "اپنا وطن ہے کس چڑیا کا نام؟ لوگو بتاؤ تو وہ ہے کہاں اپنا وطن جس مٹی میں جنم لیا جس میں لوٹ پوٹ کر بڑھے پلے، وہی اپنا وطن نہ ہوا تو پھر جہاں چار دن کو جا کر بس جاؤ۔ وہ کیسے اپنا وطن ہو جائے گا۔ اور پھر کون جانے وہاں سے بھی کوئی نکال دے۔ کہے جاؤ نیا وطن بساؤ، اب یہاں چراغ سحری بنی بیٹھی ہوں۔ ایک ننھا سا جھونکا آیا اور وطن کا جھگڑا ختم۔ اور یہ وطن اجاڑنے اور بسانے کا کھیل کچھ دلچسپ بھی تو نہیں۔ ایک دن تھا مغل اپنا وطن چھوڑ کر نیا وطن بسانے آئے تھے۔ آج پھر چلو وطن بسانے، وطن نہ ہوا پیر کی جوتی ہو گئی۔ ذرا تنگ پڑی اتار پھینکی، دوسری پہن لی۔ مگر وہ خاموش رہیں اور ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ تھکا معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ صدیوں سے وطن کی کھوج میں خاک چھاننے کے بعد تھک کر آن بیٹھی ہوں اور اس تلاش میں خود کو بھی کھو چکی ہوں۔

سر آئے پھر گئے مگر اماں اپنی جگہ پر ایسے جمی رہیں جیسے برگد کے پیڑ کی جڑ آندھی طوفان میں کھڑی رہتی ہے۔

پر جب بیٹے بیٹیاں بہوئیں داماد پوتے پوتیاں۔ نواسے نواسیاں پورا کا پورا قافلہ بڑے پھاٹک سے نکل کر پولیس کی نگرانی میں لاریوں میں سوار ہونے لگا تو ان کے کلیجے کے ٹکڑے اڑنے لگے۔ بے چین نظروں سے انھوں نے خلیج کے اس پار بیکسی سے دیکھا۔ سڑک بیچ کا گھر اتنا دور لگا جیسے دور افق پر کوئی سرگرداں بادل کا ٹکڑا۔ روپ چندجی کا برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ دو ایک بار بچے باہر نکلے مگر ہاتھ پکڑ کر واپس گھسیٹ لیے گئے پر اماں کی آنسو بھری آنکھوں نے ان آنکھوں کو دیکھ لیا جو دروازوں کی جھریوں اور چقوں کے پیچھے نمناک ہو رہی تھیں۔ جب لاریاں دھول اڑا کر قافلہ کو لے کر سدھاریں تو ایک بائیں طرف کی مردہ چق نے سانس لی، دروازہ کھلا اور بوجھل قدموں سے روپ چندجی چوروں کی طرح سامنے کے خالی ڈھنڈھار گھر کو تاکتے نکلے اور تھوڑی دیر تک غبار کے بگولے میں بچھڑی ہوئی صورتوں کو ڈھونڈتے رہے اور پھر ان کی ناکام نگاہیں مجرمانہ انداز میں اجڑے دیار میں بھٹکتی ہوئی واپس زمین میں دھنس گئیں۔

جب ساری عمر کی پونجی کو خدا کے رحم و کرم کے حوالے کر کے اماں ڈھنڈھار صحن میں آ کھڑی ہوئیں تو ان کا بوڑھا دل ننھے بچے کی طرح سہم کر کمھلا گیا۔ جیسے چاروں طرف سے بھوت آن کر انھیں دبوچ لیں گے۔ چکرا کر انھوں نے کھمبے کا سہارا لیا۔ سامنے نظر اٹھی تو کلیجہ اچھل کر منہ کو آیا۔ یہی تو وہ کمرہ تھا جسے دولہا کی پیار بھری گود میں لانگ کر آئی تھیں۔ یہیں تو کمسن خوفزدہ آنکھوں والی بھولی سی دلہن کے چاند سے چہرے پر سے گھونگٹ اٹھا زندگی بھر کی غلامی لکھ دی تھی۔ وہ سامنے بازو کے کمرے میں پہلوٹھی کی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اور بڑی بیٹی کی یاد ایک دم سے ہوک بن کر کلیجے میں کوند گئی۔ وہ کونے میں اس کا نال گڑا تھا۔ ایک نہیں دس نال گڑے تھے۔ اور دس روحوں نے یہیں پہلی سانس لی تھی۔ دس گوشت و پوست کی مورتوں نے۔ دس افسانوں نے اسی مقدس کمرے میں جنم لیا تھا۔ اس مقدس کوکھ سے جسے آج وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جیسے وہ پرانی کینچلی تھی۔ جسے کانٹوں میں الجھا کر وہ سب سٹاسٹ نکلے چلے گئے۔ امن اور سکون کی تلاش میں۔ روپیہ کے چار سیر گیہوں کے پیچھے اور وہ ننھی ننھی ہستیوں کی پیاری پیاری غوں غوں سے کمرہ اب تک گونج رہا تھا۔ لپک کر وہ کمرے میں گود پھیلا کر دوڑ گئیں۔ پھر ان کی گود خالی تھی۔ وہ گود جسے سہاگنیں تقدس سے چھو کر

کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی فرمائی گئی، بات بڑھ گئی حتیٰ کہ پولس بلائی گئی اور جو چند گنتی کے مسلمان بچے تھے انھیں لاری میں بھر کر گھروں کو بھجوا دیا گیا
اب سنئے جوں ہی بچے گھر میں آئے ہمیشہ ہیضہ طاعون کے سپرد کرنے والی مائیں۔ امتا سے بے قرار ہو کر دوڑیں اور انھیں کلیجے سے
لگا لیا اور کوئی دن ہوتا اور روپ چندجی کے بچوں سے چھپا کر ڈکر آتا تو دلہن بھابی اس کی وہ جوتیوں سے مرہم پٹی کرتیں کہ توبہ بھلی اور اٹھا کر انھیں روپ چندجی
کے پاس بھیج دیا جاتا کہ پلائے اسے ارنڈی کا تیل اور کونین مکسچر، کیونکہ روپ چندجی ہمارے خاندانی ڈاکٹر ہی نہیں ابا کے پرانے دوست تھے۔ ڈاکٹر صاحب
کی دوستی ابا سے ان کے بیٹوں کی بھائیوں سے بہوؤں کی ہماری بھاوجوں سے اور نئی پود کی نئی پود سے آپس میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ دونوں خاندانوں
کی موجودہ تین پیڑھیاں ایک دوسرے سے ایسی گھلی ملی تھیں کہ شبہ بھی نہ تھا کہ ہندستان کی تقسیم کے بعد اس محبت میں پھوٹ پڑ جائے گی، حالانکہ دونوں
خاندانوں میں مسلم لیگی، کانگریسی، اور مہاسبھائی موجود تھے اور مذہبی اور سیاسی بحثیں بھی جم جم کر ہوتیں مگر ایسے ہی جیسے فٹ بال یا کرکٹ کے میچ ہوتے
ہیں۔ ادھر ابا کانگریسی تھے تو ادھر ڈاکٹر صاحب اور بڑے بھائی لیگی تھے تو ادھر گیان چند مہاسبھائی۔ ادھر منجھلے بھائی کمیونسٹ تھے تو ادھر گلاب چند سوشلسٹ
اور پھر اسی حساب سے مردوں کی بیویاں اور بچے بھی اسی پارٹی کے تھے۔ عام طور پر جب بحثا ہوتا تو کانگریس کا پلّہ بھاری پڑتا۔ کمیونسٹ، سوشلسٹ بھی
گالیاں کھاتے مگر کانگریس ہی میں گھس پڑتے۔ رہ جاتے مہاسبھائی اور لیگی۔ یہ دونوں ہمیشہ ساتھ دیتے۔ گو وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے۔ پھر بھی دونوں
مل کر کانگریس پر حملہ کرتے۔

لیکن ادھر کچھ سال سے مسلم لیگ کا زور بڑھتا گیا اور ادھر مہاسبھا کا۔ کانگریس کا تو بالکل بیڑا ہو گیا۔ بڑے بھائی کی سپاہ سالاری
میں گھر کی ساری نئی پود سوائے دو ایک غیر جانبدار قسم کے کانگریسیوں کو چھوڑ کر نیشنل گارڈ کی طرح ڈٹ گئی۔ ادھر گیان چند کی سرداری میں سیوک سنگھ کا چھوٹا
سا دل ڈٹ گیا اور محبت میں فتور نہ آیا۔

"اپنے للّو کی شادی تو منی ہی سے کروں گا۔" مہاسبھائی گیان چند منی کے لیگی باپ سے کہتے۔ "سونے کی پازیب لاؤں گا۔"

"یار ملمع کی نہ ٹھوک دینا۔" یعنی بڑے بھائی گیان چند کی ساہوکاری پر حملہ کرتے۔

اور ادھر نیشنل گارڈ دیواروں پر پاکستان زندہ باد لکھ دیتے اور سیوا سنگھ کا دل اسے بگاڑ کر اکھنڈ ہندوستان" لکھ دیتا
یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پاکستان کا لین دین ایک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ تھا۔

ابا اور روپ چندجی یہ سب کچھ سنتے اور مسکراتے اور سارے ایشیا کو ایک بنانے کے منصوبے باندھنے لگتے۔

اماں اور چاچی سیاست سے دور دھنیے ہلدی اور بیٹیوں کے جہیزوں کی باتیں کرتیں اور بہوئیں ایک دوسرے کے فیشن چرانے
کی تاک میں لگی رہتیں۔ نمک مرچ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے یہاں دوائیں بھی منگوائی جاتیں، روز کسی کو چھینک آئی اور دوڑا ڈاکٹر صاحب کے
پاس۔ یا جہاں کوئی بیمار ہوا اور اماں نے دال بھری روٹی یا دہی بڑے بنوانے شروع کیے اور ڈاکٹر صاحب سے کہلوا دیا کہ کھانا ہوں تو آجائیے۔ اب
ڈاکٹر صاحب اپنے پوتوں کا ہاتھ پکڑے آن پہنچتے۔

چلتے وقت بیوی کہتیں "کھانا نہ کھانا سنا"

"ہوں تو پھر فیس کیسے وصول کروں، دیکھو جی لالہ اور جنی کو بھی بھیج دینا۔"

"ہائے رام تمہیں تو لاج بھی نہیں آتی۔" چاچی بڑبڑاتیں

مزہ تو جب آتا جب کبھی اماں کی طبیعت خراب ہو جاتی۔ اماں کانپ جاتیں۔
"نا بھئی میں اس مسخرے سے علاج نہیں کراؤں گی۔" مگر پھر گھر کے ڈاکٹر کو چھوڑ کر کون شہر سے بلانے جاتا۔ لہٰذا سنتے ہی ڈاکٹر

صاحب دوڑے آتے۔

"اکیلی اکیلی پلاؤ زردے اڑاؤ گی تو آپ بیمار پڑو گی۔" وہ جلاتے

"جیسے تم کھاؤ ہو، ویسے ہی اوروں کو سمجھتے ہو۔" اماں پردے کے پیچھے سے بھناتیں۔

"ارے یہ بیماری کا تو بہانہ ہے، بھابی تم دیسے ہی کھلا دیا کرو میں آجایا کروں گا۔ یہ ڈھونگ کاہے کو رچاتی ہو۔" وہ آنکھوں میں شرارت جمع کرکے مسکراتے اور اماں جل کر ہاتھ کھینچ لیتیں اور صلواتیں سناتیں۔ ابا مسکرا کر رہ جاتے۔

ایک مریض کو دیکھنے آتے تو سارے گھر کے مرض اٹھ کھڑے ہوتے۔ کوئی اپنا پیٹ لئے چلا آرہا ہے تو کسی کی پھنسی نکل گئی۔ کسی کا کان پک رہا ہے تو کسی کی ناک سوجی ہوئی ہے۔

"کیا مصیبت ہے، ڈپٹی صاحب، ایک آدھ کو زہر دیدوں گا۔ کیا مجھے سلوتری سمجھا ہے کہ دنیا بھر کے جانور ٹوٹ پڑے۔" وہ مریضوں کو دیکھتے جاتے اور بڑبڑاتے۔

اور جہاں کوئی نئے بچے کی آمد کی اطلاع ہوتی۔ وہ جلے سا ان تخلیق کو گالیاں دینے لگتے۔

"ہنہ مفت کا ڈاکٹر ہے۔ پیدا کئے جاؤ کمبخت کے سینے پر کودوں دلنے کے لئے۔"

مگر جوں ہی درد شروع ہوتے وہ اپنے برآمدے سے ہمارے برآمدے کے چکر کاٹنے لگتے، یہ چیخ کھنکھار کے سب کو بوکھلا دیتے۔ محلہ ٹولے والیوں کا اناد شوار، بننے والے باپ کے آتے جاتے تڑاتڑ چپتیں اور حماقت احمقانہ پر پھٹکاریں۔

پر جوں ہی بچے کی پہلی آواز ان کے کان میں پہونچتی وہ برآمدے سے دروازے پہ اور دروازے سے کمرے کے اندر آجاتے اور ان کے ساتھ ساتھ ابا بھی ہاوے ہو کر آجاتے۔ عورتیں کوستی پیٹتی پردے میں ہوجاتیں۔ زچہ کی نبض دیکھ کر وہ اس کی پیٹھ ٹھونکتے "واہ میری شیرنی" اور بچے کا نال کاٹ کر نہلانا شروع کر دیتے۔ والد صاحب گھبرا گھبرا کر بھونڈ نرس کا کام انجام دیتے۔ پھر اماں چلانا شروع کر دیتیں۔

"لو غضب خدا کا یہ مردوے ہیں کہ زچہ خانہ میں پلے پڑتے ہیں۔"

اور معاملہ کی نزاکت محسوس کرکے دونوں ڈانٹ کھائے ہوئے بچوں کی طرح بھاگتے باہر۔

اور پھر جب ابا کے اوپر فالج کا حملہ ہوا تو دپ جندجی ہاسپٹل سے ریٹائر ہوچکے تھے۔ اور ان کی ساری پریکٹس ان کے اور ہمارے گھر تک محدود رہ گئی تھی۔ علاج تو اور بھی کئی ڈاکٹر کر رہے تھے مگر نرس کے اور اماں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ہی جاگتے اور جس وقت سے وہ ابا کو دفنا کر آئے۔ خاندانی محبت کے علاوہ انھیں ذمہ داری کا بھی احساس ہوگیا۔ بچوں کی فیس معاف کرانے اسکول دوڑے جاتے لڑکیوں بالیوں کے جہیز کے لئے گیان چند کا ناطقہ بند رکھتے۔ گھر کا کوئی خاص کام بغیر ڈاکٹر صاحب کی رائے کے نہ ہوتا۔ چھپا بازو کو تڑوا کر جب دو کمرے بڑھانے کا سوال اٹھا تو ڈاکٹر صاحب کی رائے سے دبا دیا گیا۔

"اس سے تو اوپر دو کمرے بڑھوالو،" انھوں نے رائے دی اور اس پر عمل ہوا۔ مجن ایف۔ اے میں سائنس لینے کو تیار نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب جوتا لے کر پل پڑے۔ معاملہ طے ہوگیا۔ فریدہ میاں سے لڑ کر گھر آن بیٹھی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا میاں پہونچا اور دوسرے دن اس کی بیوی گھر پہنچ گئی۔

منجھلی بہو شیلا جب بیاہ کر آئی تو دائی کا جھگڑا بھی ختم ہوگیا۔ بیچاری ہسپتال سے بھاگی آتی۔ فیس تو دور کی چیز ہے اوپر سے چھٹے دن کرتا ٹوپی لے کر آتی۔

پر آج جب چھپا لٹکا کر آئے تو ان کی ایسی آؤ بھگت ہوئی۔ جیسے مرد غازی میدان مار کر آیا ہے۔ سب نے ہی اس کی بہادری کی تفصیل پوچھی اور بہت سی زبانوں کے آگے صرف اماں کی زبان گنگ رہی۔ آج سے نہیں وہ ۱۵ اگست سے جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ترنگا جھنڈا اور اپنے گھر پر لیگ کا جھنڈا لگا تھا۔ اسی دن سے ان کی زبان کو چپ لگ گئی۔ ان دو جھنڈوں کے درمیان میلوں لمبی چوڑی خلیج حائل ہو گئی۔ جس کی بھیانک گہرائی کو وہ اپنی غمگین آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر لرز لرز اٹھتیں۔ پھر شرنارتھیوں کا غلبہ ہوا۔ بڑی بہو کے میکے والے بہاول پور سے مال لٹا کر اور بمشکل جان بچا کر جب آئے تو خلیج کا دہانہ چوڑا ہو گیا۔ پھر راولپنڈی سے جب نرملا کے سسرال والے نیم مردہ حالت میں آئے تو اس خلیج میں اژدہے پھنکاریں مارنے لگے۔ جب چھوٹی بھابی نے اپنے بچے کا پیٹ دکھانے کو بھیجا تو شیلا بھابی نے جلدی سے نوکر کو بھگا دیا۔

اور کسی نے اس معاملہ پر بحث مباحثہ نہیں کیا۔ سارے گھر کے مرض ایک دم گئے۔ بڑی بھابی تو اپنے ہسٹریا کے دورے بھول کر لپا جھپ اسباب باندھنے لگیں۔

"میرے ٹرنک کو ہاتھ نہ لگانا۔" اماں کی زبان آخر کو کھلی۔ اور سب ہکا بکا رہ گئے۔

"کیا آپ نہیں جائیں گی؟" بڑے بھیا ترشی سے بولے

"نوج موئی میں سندھیوں میں مرنے جاؤں، اللہ ماریاں بر کے پاجامہ پھڑکاتی پھرتی ہیں۔"

"تو سنجلے کے پاس ڈھاکہ چلی جائیے۔"

"اے وہ ڈھاکہ کاہے کو جائیں گی۔ کہیں گی موئی کالے بنگالی تو چاول ہاتھوں سے لیڑ لیڑ کے کھاویں ہیں۔" سنجلے کی ساس ممانی بی نے طعنہ دیا۔

"تو راولپنڈی چلو فریدہ کے یہاں۔" خالہ بی بولیں۔

"توبہ میری اللہ پاک پنجابیوں کے ہاتھوں کسی کی مٹی پلید نہ کرائے۔ ست گئے دوزخیوں کی تو زبان بولے ہیں۔" آج تو میری کم سخن اماں پٹاپٹ بول چلیں۔

"اے بوا تمہاری تو وہی مثل ہو گئی کہ اونچے کہ نیچے بھیڑئیے کے پیڑ تلے۔ بیٹی تیرا گھر نہ جانو۔ اے بی یہ کٹر گلہری کا کی طرح غمزہ مستیاں کہ بادشاہ نے بلایا تو بھی چھم چھم کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاتھی بھیجا کہ چک چک یہ تو کالا کالا، کہ گھوڑے بھیجا چک چک یہ تو لاتیں جھاڑے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

باوجود کہ فضا مکدر سی تھی۔ پھر بھی قہقہہ پڑ گیا۔ میری اماں کا منہ اور پھول گیا۔

"کیا بچوں کی سی باتیں ہو رہی ہیں۔" نیشنل گارڈ کے سردار اعلیٰ بولے۔ "جن کا سر نہ پیر کیا ارادہ ہے۔ یہاں رہ کر کٹ مریں۔"

"تم لوگ جاؤ، اب میں کہاں جاؤں گی۔ میرا آخری وقت۔"

"تو آخری وقت میں کافروں سے گت بنواؤ گی۔" خالہ بی پوٹلیاں گنتی جاتی ہیں اور پوٹلیوں میں سونے چاندی کے زیور سے لے کر ہڈیوں کا منجن۔ سوکھی میتھی اور ملتانی مٹی تک تھی۔ ان چیزوں کو اپنے کلیجے سے لگا کر لے جا رہی تھیں۔ گویا پاکستان کا اسٹرلنگ بیلنس کم ہو جائے گا تین دفعہ بڑے بھائی نے جل کر ان کی پرانے زہر کی پوٹلیاں پھینکیں پر وہ ایسی چنگھاڑیں گویا یہ دولت نہ گئی تو پاکستان غریب رہ جائے گا اور مجبوراً بچوں کے موت میں ڈوبی ہوئی گدیلوں کی روئی کے ملیدے باندھنے پڑے برتن بوروں میں بھرے گئے۔ پلنگوں کی پائے پٹیاں کھول کر جھلنگوں میں باندھی گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جا جا با گھر ٹیڑھی میڑھی گٹھریوں اور بقچوں میں تبدیل ہو گیا۔ جانو سامان کے پر لگ گئے ہیں۔ اور قلانچیں بھرتا پھرتا ہے ذرا سستانے کو بیٹھا ہے اور پھر اٹھ کر ناچنے لگے گا۔

دستک کی گھن گرج بڑھتی جا رہی تھی۔ ملک الموت کو جلدی پڑی تھی نا۔ اور پھر آپ سے آپ ساری چٹخنیاں کھل گئیں، بتیاں جل اٹھیں۔ دور کنوئیں کی تہہ سے کسی کی آواز آئی۔ شاید بڑا لڑکا پکار رہا تھا —— نہیں یہ تو چھوٹے سنجلے کی آواز تھی۔ دوسری دنیا کے معدوم سے کونے سے۔

تو مل گیا سب کو وطن؟ اتنی جلدی؟ سنجلا، اس کے پیچھے چھوٹا۔ صاف تو کھڑے تھے۔ گودوں میں بچوں کو اٹھائے ہوئیں۔ پھر ایک دم سے سارا گھر جی اٹھا —— ساری روحیں جاگ اٹھیں اور دکھیاری ماں کے گرد جمع ہو گئیں۔ چھوٹے بڑے ہاتھ پیار سے چھونے لگے۔ ایک دم سے خشک ہونٹ میں ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ دفور مسرت سے سارے حواس تتر بتر ہو کر تاریکی میں بھنور ڈالتے ڈوب گئے۔

جب آنکھ کھلی تو نبض پر جانی پہچانی انگلیاں رینگ رہی تھیں

"ارے بھابی مجھے ویسے ہی بلا لیا کرو چلا آؤں گا۔ یہ ڈھونگ کاہے کو رچائی ہو!" روپ چند جی پردے کے پیچھے سے کہہ رہے تھے "اور بھابی آج تو فیس دلوا دو، دیکھو تمہارے نالائق لڑکوں کو لونی جنکشن سے پکڑ کر لایا ہوں۔ بھاگے جاتے تھے بدمعاش کہیں کے۔ پولس سپرنٹنڈنٹ کا بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔"

پھر بوڑھے ہونٹ میں کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر دو گرم گرم موتی لڑھک کر روپ چند جی کے جھریوں دار ہاتھ پر گر پڑے۔

ممتاز حسین

سورج سنگھ

کہا جاتا ہے کہ سورج سنگھ جوانی کے دنوں میں بڑے رنگین مزاج تھے۔ ناچ گانے کی محفلوں میں جایا کرتے اور اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ انھیں رنگ رلیوں میں لٹا دیا۔ لیکن یہ تمام باتیں میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی ہیں تو انھیں صرف پندرہ برس کی عمر سے جانتا ہوں جب کہ وہ بھی چالیس کے لگ بھگ رہے ہوں گے۔ ان کا چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط کاٹھی بہت سے سورماؤں کو دہلا دینے کے لئے کافی تھی، اس کی مونچھیں بڑی گھنی اور موٹی تھیں جس کے کناروں کو وہ تکلوں کی طرح بٹ کر کھڑا رکھتے۔ ان کا کہنا یہ تھا، کہ مرد کی عزت صرف مونچھوں ہی سے ہے۔ پر جھکی تو بس منکا ڈھلا۔ پھر بھی اس عمر میں میں نے دیکھا کہ جب کبھی آس پاس کے گاؤں میں کوئی رنڈی پتریا آتی تو وہ اپنے گھر پر مجرا ضرور کراتے۔ لیکن ان کی بات ہی کچھ اور تھی۔ کیا مجال کہ چھیدی خاں پراچہ، مداری گنپت تیلی، سرجوان میں سے، کوئی بھی بدمعاش ذرا سی آنکھ مار دے یا ہائے جلیا کہہ دے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو عیش کو بھی آداب کا پابند کر دیتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ چھیدی کو بھلا اتنی سی بات پر کیوں مارتے کہ اس نے رمضان کنجڑے کی لڑکی کی صرف کلائی پکڑ لی تھی۔ ان کا جملہ مجھے اب تک یاد ہے "بدمعاش اگر شوق ہے تو رنڈی کے پاس جا" وہ غصے کے عالم میں فراٹے دار گالیاں بھی دیتے جیسے لچا۔ بدمعاش، جواری، الو کا پٹھا۔ بےشرم کہیں کا۔ لیکن ماں بہن اور لڑکی کی گالی دیتے انھیں کسی نے بھی نہیں سنا۔ گاؤں میں لڑائی جھگڑے تو ہوا ہی کرتے ہیں لیکن وہ ان معاملوں میں کبھی بھی نہ پڑتے۔ جب تک کہ انھیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ ایک آدمی پر دس آدمی ٹوٹ پڑے ہیں۔ یا کسی بزدل نے کسی غریب کا کھلیان پھونک دیا ہے۔ پھر تو انھیں چین نہ آتا اور نہ اپنے زمیندارانہ ٹھاٹھ ہی کا خیال رہتا۔ انصاف اور عدل کے انھیں جھگڑوں میں ان کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بھی ٹوٹ چکی تھیں۔ اور جب کبھی وہ ایسی لڑائیوں سے لوٹ کر آتے تو ہندو مسلمان سب کے گھر سے تیل اور ماش کا بچھاور جاتا۔ تیل تو وہ اپنی مالش کے لئے رکھ لیتے لیکن ماش ایک مسلمان بیوہ کے گھر بھیج دیتے۔ اسی تیل کی مالش میں وہ چھیتو پہلوان سے کافی ہل مل گئے۔ جب چھیتو پہلوان انھیں چار دن شانے بٹ لٹا کر اپنی مضبوط کلائیوں اور کہنیوں کی رگڑ دیتا تو وہ دھیرے دھیرے کراہنے لگتے، اور اپنے

خیال کی رو کو بے لگام چھوڑ دیتے۔ چھٹو اب اس زمانے میں بہادری نہیں رہی۔ براہیما اپنی ہی گاؤں کی لڑکیوں کو تکتا ہے اور تیلی کا بچہ گنپت اس نے اپنی بھاوج ہی کو دکھ لیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ اپنی ماں ہی کو نہ رکھ لیں۔

"استاد کیا بک رہے ہو" چھٹو کی کلائیاں زور سے چلنے لگتیں اور وہ پھر دھیرے دھیرے کراہنے لگتے۔ چھٹو میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ جوان بہوؤں کو چھیڑا جائے۔ آج بہو ہے تو کل ماں" چھٹو پہلوان اسی طرح کی باتیں اس کے بارے میں برابر سناتا رہتا تھا میں کو سن کر ہمارے دلوں میں ایسا ڈر سما جاتا کہ پھر کسی چھیڑ چھاڑ کی ہمت نہ پڑتی۔

یوں تو ان سے گاؤں کا بچہ بچہ پریم کرتا اور ڈرتا بھی لیکن ان کی یہی دھاک صرف ایک موقعے پر بیٹھی تھی۔ تب سے وہ گاؤں کے سورما اور دیوتا سبھی کچھ ہو گئے۔ تالاب گنگو سے تھوڑی ہی دور پر انگریزی پلٹن کا ڈیرا پڑا ہوا تھا۔ ایک دن یہ خبر مشہور ہوئی کہ لہیا کو یعنی بدھو چمار کی لڑکی کو، دو گورے اٹھا لے گئے۔ معلوم نہیں انھیں یہ خبر کب مل گئی تھی۔ کہ وہ اسے راستے ہی چھڑا لائے۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے کہ سورج سنگھ اور اصغر علی جو رشتے میں میرے ماموں تھے دونوں ہی ننگی تلواریں لے کر دوڑے تھے۔ اصغر علی تو گولی کھا کر شہید ہو گئے لیکن سورج سنگھ نے ایک گورے کو زخمی بھی کیا۔ گاؤں کی زندگی میں یہ ایک ایسا سانحہ تھا جو شاید پیڑھیوں تک یاد رکھا جائے گا۔ کیونکہ میرے نانا نے جس جواں ہمتی کے ساتھ اس سانحے کا مقابلہ کیا وہ قرآن یا وید کی چھاپ کی طرح ابھی تک زندہ ہے۔

لوہیا کی ماں میر کرامت علی کے پیروں پر گر پڑی۔ نانا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تیری لڑکی کی عزت میری لڑکی کی عزت تھی اگر میرا لڑکا شہید ہو گیا تو نہ صرف میں بلکہ میرا خدا بھی خوش ہے۔" اگر گاؤں کی زندگی میں یہ لوگ اتنا گھل مل کے نہ رہتے تو سورج سنگھ کیوں میری خالہ کو اپنے بچوں سے زیادہ پیار کرتے۔ شہلا سورج سنگھ کی لاڈلی تو بچپن ہی سے ہو گئی تھی۔ گول مٹول جاپانی بوے کی طرح دوڑتی دوڑتی آتی اور ان کی گود میں جھم سے چڑھ جاتی اور اپنا پہلا ہی وار ان کی مونچھوں پر کرتی۔ سورج سنگھ اپنی مونچھ کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ وہ زور سے اس کے دونوں ہاتھ کو پکڑ لیتے وہ چلاتی اور چیختی یہاں تک کہ وہ پھر چھوڑ دیتے۔ آنکھ بچی نہیں کہ اس نے ایک کونا گرایا اور زور سے چلائی "مونچھ گرادی۔ مونچھ گرادی"

"ہوں بھلا یہ مونچھ گر سکتی ہے۔ میر کرامت علی سنتے ہو" وہ گردن اٹھا کر پھر اینٹھنے لگتے اور اس ذلت کو مٹانے کے لئے شہلا کو اتنا اچھالتے اور اس قدر پیار کرتے کہ خود میر کرامت علی کو رشک آ جاتا۔ میں نے انھیں یہ بھی کہتے سنا تھا کہ بھائی تمہارے یہاں تو چھوت چھات ہے نہیں کیوں نہ اس کی پرورش میرے ذمے کر دو۔"

"ہم تم کہیں دور رہتے ہیں؟" میرے نانا ہنس کر ٹال دیتے۔

اگر میرے ذہن میں سورج سنگھ کی یہ پوری تصویر نہ ہوتی تو میں ہندستان کے اس وحشیانہ دور میں تالاب گنگو نہ جاتا اور نہ اپنے نانا کے خاندان کی فکر ہی کرتا۔ بس یہ سوچ کر رہ جاتا کہ جس طرح اور لوگ مر گئے ہیں وہ بھی مر گئے ہوں گے۔ لیکن سورج سنگھ کے ہوتے ہوئے وہ لوگ تباہ ہو سکیں میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے اسی بھلاوے میں جب تانگے والے سے کہا کہ سورج سنگھ کے یہاں لے چلو تو وہ اچنبھے کے ساتھ بولا۔

"سورج سنگھ؟"

میں نے ڈر کر کہا "کیوں؟"

"میرا مطلب ہے وہ اب گھر پر نہیں رہتے ہیں۔"

"تو پھر کہاں رہتے ہیں؟"

"انھوں نے گاؤں کے باہر ایک مٹھ بنا لیا ہے۔"

"اچھا تو اسی مٹھ میں لے چلو" میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

جب میں مٹھ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ سورج سنگھ ایک کتے کے منہ سے منہ لگائے ہوئے پیار کر رہے ہیں اور جیسے کوئی سادھو الاپ رہے ہوں وہ ماں اور بہن کی گالیوں کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ میں بھی خاموش رہا۔

"میں شرمندہ ہوں" انھوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر وہ چیخ کر بولنے لگے۔ خدا کے لئے۔ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ" ان کا لہجہ پھر دھیما ہو گیا۔ تاکہ میری شرم دور ہو سکے۔"

میں پھر خاموش ہو رہا۔

"نہیں نہیں تمہارے گھر کا اب کوئی شخص بھی زندہ نہیں ہے" وہ چلانے لگے

"سورج سنگھ کیا میری بڑھیا نانی بھی نہیں ہے۔

"نہیں نہیں کوئی نہیں"

"اور . . . . ؟"

"بس نام نہ لینا"

"مجھ میں ایک پرانا ڈر باقی تھا۔ میں اس کے کہنے سے رک گیا۔

"اور آپ کا گھر؟"

"میں نے اپنے انھیں ہاتھوں سے اپنے بیٹے کا خون کیا ہے" وہ انگلیاں پھیلا کر دکھلانے لگے۔

"کبیر سنگھ؟"

"ہاں ہاں وہی کبیر سنگھ" ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں "تمہارا ساتھی اور بچپن کا دوست اس کے ایسے لاکھ دو لاکھ انسانوں کو اب بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔ تم ڈرو نہیں اب میرے ہوش وحواس بے کار ہو چکے ہیں۔ پھر وہ کچھ اس طرح بولنے لگے جیسے خود اپنے ہی سے باتیں کر رہے ہوں۔

"لیکن اتنا یاد رہے کہ جب دنگے کی خبر گاؤں گاؤں میں پھیلنے لگی تو معلوم نہیں کبیر سنگھ کہاں سے ہتھیار جمع کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ گاؤں کی رکھشا بھی تو ضروری ہے۔ کچھ اسی لئے ہوگا۔ لیکن مجھ سے چوک ہو گئی۔ جس دن گاؤں میں آگ لگی ہے تو میں سب سے پہلے تمہارے نانا کے گھر دوڑا تھا لیکن ظالموں نے ان کا کام تمام کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کبیر سنگھ بھی اس بلوے میں موجود تھا۔ اور جیسا کہ میں نے سنا ہے کہ اس نے عورتوں کی بے عزتی میں بھی حصہ لیا۔ میں اس وقت تو سیدھا گھر لوٹ آیا لیکن جب وہ مکان میں داخل ہوا تو میں نے بندوق کا نشانہ بناتے ہوئے کہا "حرامزادے اگر آج تو نے اپنی ماں کے ساتھ زنا نہ کیا تو مار ڈالوں گا۔ سورج سنگھ کی آنکھیں پھر دہکنے لگیں۔ وہ خاموش رہا۔ میں نے تین بار کہا اور پھر گولی داغ دی۔ میں شاید دیوانہ ہو کر سب کو مار ڈالتا بچے، عورتیں اور مرد سب میرے راستے سے بھاگنے لگے۔ میں نے اس گھر کو اب چھوڑ دیا ہے۔ کیا میں قاتل ہوں؟" انھوں نے اس طرح کہا جیسے۔ وہ پوچھنا چاہتے ہوں" صرف یہی ایک کتا رہ گیا ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں"

"لیکن" میں نے بے تاب ہو کر کہا "یہ کتا تو خالہ کا ہے"

"ہاں یہ کتا انھیں کا ہے" اس کے گاؤں کی خبر یہاں تک آئیں اور یہ میرے مونچھ کے بال چباتا ہے" یہ بات انھوں نے اس طرح کہا جیسے زہر کی کلّی بھر آئی ہو اور وہ تھوک دینا چاہتے ہو . . . . میں نے جب غور کیا تو دیکھا کہ ان کی مونچھوں کے بال بہت ہی کم ہو چکے تھے

منیب الرحمٰن

مہاتما گاندھی کی موت پر

اے وطن، اے مرے اجداد کی عظمت کے نشاں
آج تو سوگ میں ہے تا بہ کمر ڈوبا ہوا
اٹھ گیا تجھ سے وہ درویش ملوکانہ صفات
جس کا ہر لفظ تھا تیرے لئے پیغامِ حیات
اس نے گایا تری وسعت میں وہ نغمہ جس کو
آبشاروں نے سنا
لہلہاتے ہوئے کھیتوں نے سنا
آسماں بوس پہاڑوں نے سنا
ساری دھرتی نے سنا
اور وہ سب بہ یک آواز یہ چلا اٹھے
یہ ہے فطرت کے دھڑکتے ہوئے دل کا نغمہ
جس کو اک آدمِ خاکی نے زباں دے دی ہے

اس کا یہ نغمہ، محبت کا حسیں نغمہ تھا
اک ہمہ گیر محبت، جو نہیں ہو سکتی
فرقہ و مذہب و ملت کی حدوں میں محصور
جلوہ گر ہے یہ ہر اک شے میں، ہر اک ذرے میں
اس کی طاقت نہیں محتاج سنان و شمشیر
آ نہیں سکتا زوال اس کی شہنشاہی کو
ہم نے دیکھا ہے گھٹتے ہوئے انسانوں کو
شہر کی گونجتی پر پیچ گذرگاہوں پر
جن کو یہ مژدۂ امید دیا کرتا ہے
ہم نے دیکھی ہیں سیہ خانۂ غم میں محبوس
عورتیں لاتا ہے جن تک یہ مسرت کی کرن
اور ہر چند نہیں اب وہ مغنی ہم میں
پھر بھی اس گیت سے ہیں ساری فضائیں لبریز
گونجتے ہیں اسی آواز سے یہ کون و مکاں
سنو! قائم ہے محبت پہ نظامِ ہستی
اور دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

عبدالمتین عارف

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء

ہوا کا جھونکا
ہوا کا تند اور تیز جھونکا
بجھا گیا شمعِ زندگی کی حسین لو کو
حسین لو جس کی نرم تنویر
موت کی اژدہا صفت انجمن کے شانے ہلا رہی ہے

ہوا کا تند اور تیز جھونکا ہے سخت ناداں
پلٹ کے اک بار بھی نہ دیکھا
افق سے خورشیدِ زندگی
سرخ پرچموں کی حسین چھاؤں میں بڑھ رہا ہے
یہ موت کی اژدہا صفت انجمن ابھی جگمگا اٹھے گی
ذرا نہ سوچا
یہ شمعِ ہستی تو اپنا کارِ عظیم انجام دے چکی ہے
تمام شب جگمگا چکی ہے

اسے بجھانے سے فائدہ کیا   خرامِ خورشیدِ زندگی تو نہ رک سکے گا۔

عبد المجید سالکؔ

ادب کے نئے مسائل

رفیقانِ قلم! یہ ایک پرانا شیوہ ہے کہ انجمنیں یا جماعتیں جس شخص کو اپنے کسی اجتماع کا صدر منتخب کرتی ہیں وہ اپنے خطبے کے پہلے فقرے میں یہ کہہ کر ان کے انتخاب کی توہین کر دیتا ہے کہ میں تو اس اعزاز کے قابل نہ تھا۔ آپ حضرات نے زبردستی مجھے اس مسند پر بٹھا دیا لیکن کم از کم میں آپ کے کارکنوں کی توہین کا مرتکب نہیں ہو سکتا بلکہ ان کو داد دیتا ہوں کہ انھوں نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ بالکل صحیح انتخاب کیا میں یقیناً اس اعزاز کا اہل تھا۔ اس لئے کہ عمر میں بھی شاید آپ سب سے سینیئر ہوں اور قلم کی گھس گھس میں بھی مجھے کم و بیش پینتیس سال گذر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ جلیل القدر ادیبوں اور شاعروں کے اس وقیع اجتماع میں اپنے مقام کا اندازہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اتنا عرض کرنے کی اجازت ضرور دیجئے کہ آپ میں بیسیوں حضرات موجود ہیں جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے اس اعزاز کا استحقاق مجھ سے ہزار درجے زیادہ رکھتے تھے۔

رفیقو! اب ان بحثوں کو چھیڑنا بے وقت کی شہنائی ہے کہ ترقی پسند ادب کیا ہے اس کے تقاضے کیا ہیں۔ ترقی پسند ادیب کمیونسٹ ہوتے ہیں یا نہیں، مذہب کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے، وہ دہریے ہیں یا خدا پرست، ان کی عریاں نویسی جنسی بھوک، بدوضعی کا نتیجہ ہوتی ہے یا کوئی بلند مقصد ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ان تمام بحثوں کے تار و پود پوری طرح بکھیرے جا چکے ہیں۔ ادب کے متعلق صرف ایک ہی نظریہ صحیح ہے کہ ادب زندگی کے لئے ہونا چاہئے۔ محض ادب کے لئے نہیں۔ ادب کو زندگی کے حقائق کا آئینہ بنایئے، زندگی کو بہتر اور بلند کرنے کا آلہ بنایئے اس کے بعد پڑھنے والوں کو پسند یا ناپسندی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ تاثر یا عدمِ تاثر پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ جو ادب بلند معیار ہو گا۔ وہ باقی رہ جائے گا اور نتائج پیدا کرے گا۔ جو ناقص اور سقیم ہو گا۔ وہ خود بخود گردشِ روزگار میں پس کر فنا ہو جائے گا۔ میرے نزدیک ترقی پسند مضامین کے نتائج افکار اپنی افادی حیثیت اور بقا کی صلاحیت کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اختلافی بحثیں کرنا حماقت نہیں، تو ضیعِ اوقات ضرور ہے۔

رفیقانِ قلم! ہندوستان کی سرزمین پر دو ایسے ہنگامے برپا ہوئے ہیں جنھوں نے انسانی ضمیر کی بنیادوں تک کو ہلا دیا ہے ایک بنگال کا قحط۔ دوم پنجاب کی حالیہ مصیبت۔ مختلف روایات کے مطابق بنگال میں پچیس تیس لاکھ انسان محض بھوک سے ہلاک ہو گئے۔ کرڑیل جوان ہڈیوں کا پنجر بن کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مائیں اپنے بچوں کو اپنی سوکھی ہوئی چھاتیوں سے لپٹا کر مر گئیں۔ نوجوان عورتوں نے مٹھی بھر چاول کی خاطر اپنی عصمتیں بیچ ڈالیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب بنگال کے شہروں میں کھانے پینے کی چیزوں کی افراط تھی۔ ہوٹل اور ریستوران اور بازار گوناگوں نعمتوں سے لبریز تھے اور سرمایہ داری کا شیطان اپنی ابلیسانہ مسرت کے نشے میں سرشار ہو کر ناچ رہا تھا۔ جب دنیا نے لاکھوں انسانوں کی تباہی کو دیکھا تو اسے یہ حقیقت صاف نظر آ گئی کہ سرمایہ دارانہ نظام نے آدم کی اس اولاد کو اتنا نامرد بنا دیا ہے کہ وہ بھوک سے صرف مر جانا جانتے ہیں اور رکھنے والوں اور دولت مندوں سے اناج چھین کر کھانا نہیں جانتے حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ آفت محض سرمایہ دار حکومت منافع پرست تاجروں اور بددیانت افسروں کی ملی بھگت اور فایوچی پن سے پیدا ہوئی ہے۔ جنھوں نے اپنی تجوریوں کو بھرنے کے لئے چاول کے نرخ اس قدر بڑھائے کہ یہ جنس بنگال کے دیہات میں بے نشان ہو کر رہ گئی اور غریب کسی قیمت پر بھی اپنا پیٹ پالنے کے قابل نہ رہا۔ یہ حیرت انگیز معا کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ کہ گو بنگالی کو بھوک کی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس نے پولس کی گولی کی موت سے ڈر کر اپنا ہاتھ ذخیرہ داروں کے گھر اور اناج پر

زبردستی قبضہ نہ کیا۔ نفسیات غلامی کی اس بحث کو چھیڑ دو۔ لیکن لاکھوں بنگالیوں نے اپنی جانیں دے کر سرمائے اور استبداد کی لعنتوں کے خلاف جو مواد پیدا کر دیا۔ وہ برسوں کے پروپگنڈے سے بھی فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اور لاکھوں دل و دماغ پر وہ اثرات مرتب نہ ہو سکتے تھے جو اس قحط نے چند ہفتوں کے اندر پیدا کر دئے۔

دوسرا ہنگامہ وہ ہے جو چند مہینوں سے پنجاب میں برپا ہے، تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے کہ آٹھ دس ہفتوں کے اندر چالیس لاکھ انسان ایک علاقے سے اور ساٹھ لاکھ دوسرے علاقے سے نقل مکانی کر گئے۔ اور اس جبری تبادلۂ آبادی میں لاکھوں بے گناہ قتل ہو گئے۔ کروڑوں کی املاک آتش زنی سے تباہ کر دی گئی۔ بیشمار عورتیں اٹھالی گئیں جو معلوم نہیں کس حال میں ہیں۔ ان میں سے کتنی خود کشی کر گئیں۔ کتنی بھاگنے کی کوشش میں جانیں دے چکیں اور کتنی راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ گئیں۔ درندوں نے چیخ دپکار کی۔ مخلص انسانوں نے کہا۔ پاکستان قائم ہونے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ اس کا قیام ضروری ہے اس لئے کہ ہر قوم کو اپنی کلچر کے مطابق زندہ رہنے اور ترقی و خوشحالی حاصل کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ لیکن انقطاع اور علیحدگی امن و اماں کے ساتھ بھی ہو سکتی تھی درندوں کی طرح ایک دوسرے کو بھاڑ کھانے کے لئے لیکنا ہرگز انسانیت کا تقاضا نہیں تھا۔ لیکن انگریزوں، رجواڑوں، نواب زادوں، سیوک سنگھ والوں ہندو مہا سبھائیوں اور اکالیوں، غرض تمام رجعت پسند جماعتوں نے جمہوریت کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا۔ یہ تمام اسی ناپاک اتحاد کے کرشمے ہیں لاکھوں بے گناہوں کا خون سرمایہ داری اور فاشزم کے انہی شیاطین کے سر ہے جنھوں نے بیداریٔ جمہور میں اپنے اقتدار کی موت دیکھ کر ایک آخری جدوجہد کے لئے کمر باندھ رکھی ہے اور ان کے آلہ کار اور نمک خوار یعنی بے ایمان وزراء، بددیانت اور رشوت خور افسر اور اہلکار حق نمک ادا کرنے میں دن رات ایک کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ناجائز رشوت ستانی اور لوٹ مار سے اپنے گھروں کو بھر رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ جس ان دیکھی اور ان بوجھی طاقت نے مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب میں دولت مند مسلمانوں اور غیر مسلموں کو پل بھر میں داراؤں سے نادار بنا دیا۔ وہ ان لٹیرے داراؤں کو بھی اسی طرح نادار بنا سکتی ہے، اور بنا کر رہے گی۔ کیونکہ یہ تمام طبقے اپنی کشتی کو اس قدر لبالب بھرتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ ڈوبے بغیر نہ رہے گی۔

انگریزوں۔ رجواڑوں۔ رئیس زادوں۔ سیوک سنگیوں، مہندو مہا سبھائیوں اور اکالی لیڈروں کے اندیشے بالکل صحیح ہیں۔ تقسیم ہند اور حکومت خود اختیاری کے قیام کے بعد سوراج اور پاکستان کی تحریکیں ختم ہو چکیں۔ نہ کانگریس فعال رہی۔ نہ مسلم لیگ کے لئے کوئی بڑا کام باقی رہ گیا۔ ہندوستان میں مسلمان اور پاکستان میں ہندو اور سکھ بہت قلیل رہ گئے۔ اب نہ ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں کو لڑایا جا سکتا ہے۔ نہ نیشنلسٹ اور یونینسٹ محاذ قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اب تو ہندوستان اور پاکستان کے اندر کوئی کشمکش ہوگی تو وہ نہ سیاسی ہوگی، نہ فرقہ وار ہوگی۔ بلکہ خالص طبقاتی آویزش ہوگی جس میں "دارا و نادار" ٹکرائیں گے اور اس آویزش کا فیصلہ ہی ہماری قسمت کا آخری فیصلہ ہوگا۔

رفیقو! پنجاب میں تباہی، تخریب اور انہدام کا جو ہنگامہ ہوا بعض لوگ اسے انقلاب کہتے ہیں حالانکہ یہ انقلاب نہیں ہے۔ البتہ انقلاب کا پیش خیمہ ضرور ہے۔ خیالات وعقائد میں انقلاب آچکا ہے۔ وہ عصبی ہیجان اور وہ اینٹھن جو سماجی نظام میں انقلاب کی پیش رو ہوتی ہے صاف صاف رونما ہو چکی ہے۔ پنجاب کے بڑے بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کی تباہی کے بعد سرمائے اور دولت کی ناکارگی۔ اور محنت مزدوری کی صلاحیت ہر شخص پر واضح ہو چکی ہے۔ ہر شخص محسوس کر چکا ہے کہ انفرادی دولت ایک لمحے میں نابود ہو سکتی ہے۔ لیکن مزدور کے بازو کی قوت۔ کاریگر کی کاریگری ذی علم انسان کا کوئی علم چھین نہیں سکتا اور آخر وہی معاش کا ضامن اور کفیل ہو سکتا ہے۔ انقلاب اس حالت کو کہتے ہیں جب انسانی معاشرے کی پرانی مجلسی اور اقتصادی بنیادیں فرسودہ ہو کر گر جائیں اور ان کی جگہ ایک صالح نظام کی اساس استوار ہونے کی گنجائش پیدا ہو جائے جس میں کسی شخص کو اس کے حق سے نہ کم ملے نہ زیادہ بلکہ پورا حق حاصل ہو جائے اور یاد رکھئے کہ وہ مبارک وقت قریب آگیا۔ آفتاب تازہ ابھی بطن گیتی سے پیدا تو نہیں ہوا لیکن ستاروں کی تنک تابی اس کے طلوع کا پتہ ضرور دے رہی ہے۔

لیکن رفیقان محترم! اس بات کو کبھی فراموش نہ کیجئے کہ فاشی، سرمایہ دار اور غرض پرست طبقات آسانی سے میدان نہیں چھوڑ جائیں گے۔ عوام کو انقلاب کی جنگ میں ایک دفعہ ابتلا و آزمائش کی بھٹی میں سے گزرنا پڑے گا۔ آپ حضرات پر بہت بڑا فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ عوام کو طلوع ہونے والے آفتاب کے استقبال کے لئے تیار کریں۔ قحط بنگال اور ہنگامۂ پنجاب زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی بے کرانی کے مواج سمندر ہیں جن میں ہمارے ادیبوں، افسانہ پردازوں اور شاعروں کے لئے فکر و خیال کے کبھی ختم نہ ہونے والے ذخیرے پوشیدہ ہیں۔ سیاسی کشمکش کا خاتمہ ہو گیا۔ فرقہ پرستی کا دور ختم ہو گیا۔ پاکستان قائم ہے اور اس میں خوش قسمتی سے وہ ملت آباد ہے جو اپنے مذہب اور کلچر کے اعتبار سے غیر سرمایہ پرست اور جمہوریت پسند واقع ہوئی ہے۔ اگرچہ یہاں بھی فاشیت اور سرمایہ داری ایک دفعہ پھر مذہب کے نام کو استعمال کریں گی۔ لیکن ملت اب بیدار ہو چکی ہے۔ وہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی تعمیل سے واقف ہے۔ اب اس ملت میں سلاطین و امراء اور سرمایہ داروں کی دال نہیں گل سکتی۔ یہ ملت نہ صرف آپ کے نتائج افکار کی قدر کرے گی بلکہ آپ کو نئے نئے موضوع مہیا کرے گی۔

رفیقو! میں مسلمان ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اقتصادی اور معاشرتی مساوات کے لئے زندقہ و الحاد ضروری نہیں بلکہ اس مقصد کے لئے خدا پرستی اور بلند ترین اخلاقی اقدار کی ضرورت ہے۔ اسلام ایک صحت مند سماج قائم کرنے میں دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ مصیبت صرف یہ ہوئی کہ پہلے چند ہی سال گذر جانے کے بعد یہ دین سلاطین و امراء کے چنگل میں ایسا گرفتار ہوا کہ اس کی وہ خوبیاں جو ان کے مقدس بانی کے پیش نظر تھیں، اب تک عملی دائرے میں پوری طرح اجاگر نہ ہو سکیں۔ حالانکہ مساوات جمہور اور مخالفت جمہور اسلام کی معاشرت اور اقتصاد کے بنیادی پتھر تھے۔ تاہم اس ملت کی ترکیب میں ایسی اہلیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ سیاسی معاشرتی اور اقتصادی جمہوریت و مساوات کے بلند ترین تصورات کو باآسانی اختیار کر سکتی ہے۔

عزیزو! فضا تیار ہو چکی ہے وقت صالح ہے۔ اسباب مہیا ہیں۔ آپ حضرات قلم کے دھنی ہیں اپنے موجودہ سکون و جمود کو ترک کیجئے اور معاشرے کو آئندہ انقلاب کی تیاری میں وہ امداد دیجئے۔ جو ایک آزاد خوددار قوم کے ادیبوں اور شاعروں کے شایان شان ہو۔ اگر آپ کمر ہمت باندھ لیں تو اس برصغیر میں از سر نو ایسے حالات پیدا کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ حفیظ جالندھری گلیوں اور ساحر لدھیانوی کے بازاروں میں آزادانہ گھوم سکیں۔ اسی طرح کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی، دوبارہ لاہور کے ادبی حلقوں کو آباد کر سکیں اور ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو اتنی طاقت اور توفیق حاصل ہو جائے کہ وہ اپنے فاشی دشمنوں کی مہلک سازشوں کو ناکام بنا کر زندگی کو حقیقی ترقی و خوشحالی کا گہوارہ بنا دیں

۴- آزادی کی منزل

نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو

ساحر لدھیانوی

جگر مراد آبادی

غزل

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہوائیں ہیں آج بھی طرب زا درخت ہیں سایہ دار اب بھی
مگر وہ انساں کہ جس کے چھونے سے جلتے ہیں برگ و بار اب بھی

انھیں خبر کیا نہیں ہے اس کی انھیں میں ہیں فتنہ کار اب بھی
مگر وہ ہیں وقت و مصلحت کے قدیم و تازہ شکار اب بھی

اگرچہ آزادیٔ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل
مگر خود اہل وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناساز گار اب بھی

خود اپنی بدنیتی کے ہاتھوں برے نتیجے بھگت رہے ہیں
صداقتوں سے حقیقتوں سے وہی ہے لیکن فرار اب بھی

یہ زندگی غیر مطمئن سی شکوک و شبہات کی یہ دنیا
مگر وہ فرمائے جا رہے ہیں کہ رشتہ ہیں استوار اب بھی

زمین بدلی زمانہ بدلا مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی وہی ہے بردے کار اب بھی

کوئی یہ چپکے سے ان سے پوچھے کہاں گئے آپ کے وہ دعوے
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دست سرمایہ دار اب بھی

سفارشیں ظالموں کے حق میں پیام رحمت بنی ہوئی ہیں
نہیں ہے شائستہ سماعت دکھی دلوں کی پکار اب بھی

اسی کا ہے نام اگر ترقی ہم اس ترقی سے باز آئے
کہ خون مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی

ہمیں ملا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک
ہماری خاک لحد کے ذرے ہیں ان کے دامن پہ بار اب بھی

کہاں کی دلداری و محبت تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا
حقوق پامال کر رہے ہیں حقوق کے پہرہ دار اب بھی

جو محو جشن نظام نو ہیں، پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
یہ جان ہے سوگوار اب بھی یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی

منافرت کی ہزار باتیں وہ سنتے رہتے ہیں اور خوش ہیں
مگر صداقت کی صاف و سادہ سی بات ہے ناگوار اب بھی

نہ وہ مروت نہ وہ محبت نہ وہ صداقت نہ وہ شرافت
رہین خوف و خطر ہیں یعنی سکون دامن و قرار اب بھی

زبان و دل میں نہ ربط صادق نہ زندگی میں خلوص کامل
جو تھے غلامانہ زندگی میں وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

غلط یہ جمہوریت کے دعوے دروغ یہ زندگی کے نقشے
دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہیں تنگ و تار اب بھی

یہ جشن آزادیٔ وطن ہے مگر اسی جشن و سرخوشی میں
بہت ہیں سینہ فگار اب بھی بہت ہیں بے روزگار اب بھی

یہی جو سادہ سے قہقہے ہیں یہی جو پھیکے سے ہیں تبسم
انھیں کی تہہ میں بہت سے اشکوں کے ہیں رواں آبشار اب بھی

یہ رشوتوں کی یہ سازشوں کی یہ نفع اندوزیوں کی لعنت
وہ خود ہی انصاف سے یہ کہہ دیں نہیں وہ کچھ ذمہ دار اب بھی

ہزارہا انقلاب دیکھے ہزارہا تجربوں سے گذرے
خرد میں تنگی عمل میں لغزش جنوں ہے ناپختہ کار اب بھی

انھیں کے حلقوں سے خود انھیں کی مخالفت عام ہو رہی ہے
ہماری جانب سے لیکن ان کی نظر ہے بیگانہ وار اب بھی

کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی مسرت آزادیوں کی حاصل
کہ عام انسانیت کی دنیا ہے تشنہ و بیقرار اب بھی

وسیع مسلک رفیع فطرت خلوص نیت خلوص ایماں
انھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

خلوص نیت سے صرف اپنی ہی زندگی پہ کریں توجہ
خلوص نیت کی منتظر ہے سعادت کردگار اب بھی

کبھی کبھی غور کرتے رہیے جگر کا مصرعہ یہ پڑھتے رہیے
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

سردار جعفری

خون کی لکیر

(ہندوستان کے شرنارتھیوں اور پاکستان کے مہاجرین کے نام)

میں سن رہا ہوں
وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں داغ غم بن کے رہ گئی ہیں
وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے
دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں
وہ چیخیں جو مادر وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جا کے کھو گئی ہیں
وہ گیت جو نوحہ و فغاں کے
سیاہ خانوں میں چھپ گئے ہیں
وہ قہقہے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بیکار کر چکا ہے
وہ وعدے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اتر چکا ہے
وہ عہد و پیماں
کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پر
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

(۲)

یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خون ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے راگ بدلے
قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے
بہار کے سرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے

سحر کی رنگیں وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھوئیں کے سیہ کفن میں سلگ رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی باہوں سے راہ روکے کھڑے ہوئے ہیں

جلے ہوئے گاؤں کے جنازے قدم قدم پر پڑے ہوئے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جواں لاشیں
چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خون بن کے رس رہا ہے

(۳)

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ خواب ہے کس قدر پریشاں
ہزاروں سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں سسکتی پلکیں
اندھیری شب میں
کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈھتی ہیں
مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے
شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے؟

میں جانتا ہوں
تمہارے سینے میں دل میں، زخموں میں کتنے آنسو بھرے ہوئے ہیں
تم ان کی بوندوں سے آسمان و زمیں کا دامن بھگو چکی ہو
تم اس تلاطم میں وندھیا اور ہمالیہ کو ڈبو چکی ہو
مگر یہ خونابہ بار آنکھوں کی بہتی گنگا
زمیں پہ پھیلے ہوئے لہو کے سیاہ دھبّے نہ دھو سکے گی
یہ جھلملاتے ہوئے دیے ہیں
جو ظلم کے جھکڑوں مصیبت کی آندھیوں میں نہ جل سکیں گے
تم ان کی مدھم سی روشنی میں
حسین انصاف کے فرشتے کو کب تلک ڈھونڈھتی رہو گی

کہ وہ بھی اس مقتل وطن میں
تمہاری ہی طرح زخم خوردہ ہے اور آوارہ پھر رہا ہے

(۴)

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو
یہ کس کو آواز دے رہی ہو
تم اپنے زخموں کی داستاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو
تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساط شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزاروں چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر جلا رہے ہیں

یہی تو ہیں جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
تمہارے سینے پہ خون ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انھیں نے محفل کے ساز بدلے
انھیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمہارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
تمہاری عصمت، تمہاری عزت، تمہاری غیرت چرا رہے ہیں

یہ قصر وہ ہے
کہ جس کے دیوار و در میں صدیوں کی لعنتیں بس کے رہ گئی ہیں
یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے

جہاں فرنگی کے بھوت دن رات جل رہے ہیں
یہاں شہیدوں کا خون چھلکتا ہے موج و رنگ شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے دردِ دل کا سرود چنگ و رباب بن کر
یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمہیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے
یہ ظالموں کا محل ہے، یہ قاتلوں کا مسکن ہے، لیڈروں کی انجمن ہے

(۵)

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رہے ہیں۔
ملوں سے کھیتوں سے اور کھانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں

وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں عدل و انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
جو ظالموں کے محل کی جانب لپک رہی ہے
اندھیری شب سے پرے شفق کی سنہری مینا چھلک رہی ہے

وہ اپنے سینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

آزادی کے بعد

منتشر پتیاں خیالوں کی — پیچ کھاتی ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح ٹوٹ کے تمام نجوم — یک بیک اڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے — جن کی حدت سے تپ رہے ہیں چمن
بن رہے ہیں گلے سڑے پتے — کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

روٹیاں بوٹیوں سے تلتی ہیں — عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے — خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پلٹ کے تکتی ہے — اپنے بچپن کے رہگزاروں کو
جیسے معزول شہریار گنے — اپنی عظمت کی یادگاروں کو

زندگی عزمِ زندگی سے ہٹی — کارواں کے غبار میں گم ہے

زاہد کہنہ سال کی مانند مقبروں کے شمار میں گم ہے

ایک آفاق گیر سناٹا "زندگی! زندگی!" پکارتا ہے
سپٹپاتا ہے اپنے ہونٹوں سے خون کی پیڑیاں اتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں ––– یہ خلا کی رقاصہ
آدم نو کے انتظار میں ہے

ساحر لدھیانوی

نیا سفر ہے، پرانے چراغ گل کر دو

فریب جنت فردا کے جال ٹوٹ گئے حیات اپنی امیدوں پہ شرمسار سی ہے
چمن میں جشن ورود بہار ہو بھی چکا مگر نگاہِ گل و لالہ سوگوار سی ہے

فضائیں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے افق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہر منوّر، کہاں کی تنویریں کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکست تمنا وہی غم ایام نگار زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا

بھٹک کے رہ گئیں، نظریں خلا کی وسعت میں حریم شاہد رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہگزر ختم ہو گئی لیکن ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو پرانے راہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوع صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے

کیفی اعظمی

قومی حکمراں

سامراجی فضا شناسوں نے وقت کے تیوروں کو بھانپ لیا

منتخب کر کے جانشیں ناگاہ — منہ ترنگے سے اپنا ڈھانپ لیا

رہزنوں سے مفاہمت کر کے — راہبر قافلہ لٹاتے ہیں
لینے اٹھے تھے خون کا بدلہ — ہاتھ جلاد کا بٹاتے ہیں

شہر کے شہر ہو گئے برباد — جب کہیں بس سکا ہے راج محل
سیکڑوں داستاں سناتا ہے — ماؤں بہنوں کا خوں بھرا آنچل

کس طرف جائیں خانماں برباد — بٹ کے جیسے سکڑ گئی ہے زمیں
جس شجر کو لہو سے سینچا ہے — اس میں کانٹے ہیں لاکھ چھاؤں نہیں

کتنے کھلیان لوٹے جاتے ہیں — نفع خوروں کی بوریوں کے لئے
قطرہ قطرہ نچوڑا جاتا ہے — خون بوجھل تجوریوں کے لئے

فکر پابند ہے عمل پابند — ڈھال رکھی ہیں کتنی زنجیریں
باب زنداں پہ لکھی جاتی ہیں — آج جمہوریت کی تقریریں

بے گناہوں کی خون کی بارش ہیں — بزم عشرت سجا کے بیٹھے ہو
اٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں — جن پہ مسند بچھا کے بیٹھے ہو

جب بھڑکتی ہے انقلاب کی آگ — کوئی اس کو بجھا نہیں سکتا
کام جو بیٹھ رونے سونپا ہے — تم سے انجام پا نہیں سکتا

کرشن چندر

بت جاگتے ہیں

یہ کہانی جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ کل تک نہ ہوئی تھی۔ کل رات کے دو بجے تک اس کہانی کے ہونے کا کوئی امکان نہ تھا کل رات کے دو بجے تک جب میں سوچتا سوچتا تھک گیا۔ اور یہ کہانی نہ آئی۔ تو میں اس کی تلاش میں گھومتا گھومتا جوہاٹی کی طرف نکل گیا یہاں اس وقت ایک عجب سناٹا سا تھا۔ سمندر کا شور بہت دھیما تھا۔ اور وہ کہیں دور افق کے سینے سے لگ کر مدھم مدھم سروں میں بلک بلک کر رو رہا

تھا۔ اور کنارے کچھ ریت بھی لاکھوں انجانے قدموں کے گھاؤ اپنے سینہ میں لئے آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔ ساری فضا پر ایک عجیب کربناک تھکن کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اور میں اس عجیب سی فضا کے اذیت ناک تاثر کو قبول کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یکایک میرے کانوں میں آواز آئی "تلک بھگوان"

میں نے گھبرا کر دیکھا، سامنے تلک مہاراج کا بت تھا۔ جو عجب شان و تمکنت سے سر پر غرور اٹھائے فضا میں تک رہا تھا۔ ان کے قدموں میں میں نے اک پرچھائیں سی دیکھی۔ اس کا چہرہ تو میں صاف صاف نہیں دیکھ سکا۔ کیونکہ اس کی پشت میری طرف تھی۔ ہاں اتنا ضرور دیکھا کہ وہ اک ادھیڑ عمر کا ٹھگنے قد کا گندمی رنگ کا مرہٹہ ہے۔ اس کی قمیض اور دھوتی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے پاؤں ننگے تھے اور ٹانگوں پر گہرے زخموں کے نشان تھے۔ اسے دیکھ کر میرے قدم وہیں رک گئے اور میں اس کی باتیں سننے کے لئے وہیں ریت پر لیٹ گیا۔ تاکہ وہ یہی سمجھے کہ یہ شخص ریت پر سو رہا ہے میری باتیں نہیں سن رہا ہے۔

اس آدمی نے پھر کہا "تلک بھگوان!"

تلک بھگوان کے بت نے کہا۔ "کہو کیا کہتے ہو؟"

آپ کو شاید اچنبھا ہوگا کہ کہیں پتھر کا بت بھی بول سکتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہر اماوس کو چاروں طرف گھور اندھیرا ہوتا ہے اور آدھی رات کا وقت ہوتا ہے، اس وقت بت جاگتے ہیں اور جاگتے ہی نہیں باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں بلائے اور ان سے کچھ پوچھے تو اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ آپ کو یہ بات شاید معلوم نہیں۔ مجھے ایک عرصے سے معلوم تھی۔ مگر میں نے کبھی بات نہیں کی۔ اوّل تو دنیا کے کاموں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ آدمی رات کے ۱۲ بجے ان سے بات کرنے جائے۔ پھر بمبئی میں جتنے بت ہیں، اتنے بڑے بڑے لوگوں کے ہیں کہ آدمی سوچتا ہے کہ ان قابل احترام ہستیوں سے آدمی بات کس طرح سے کرے۔ نہ معلوم کون سی بات ناگوار خاطر ہو۔ پھر آزادی سے پہلے تو یہ بھی اندیشہ تھا کہ خفیہ پولس کہیں اس جرم میں گرفتار نہ کر لے کہ یہ آدمی بال گنگا دھر تلک کے بت سے بات کر رہا تھا۔ اور نہ جانے برطانوی حکومت کے خلاف کیا کیا سازشیں عمل میں لا رہا تھا۔ اور آج کل یہ ڈر رہتا ہے کہ پولس اس لئے نہ پکڑے کہ دیکھئے یہ آدمی اپنی ہی حکومت کے خلاف اپنے ملک کے لیڈر بال گنگا دھر تلک سے شکایت کر رہا تھا۔ انھیں باتوں کو سوچ کے ہم نے آج تک کسی بڑے لیڈر کے بت سے کبھی بات نہیں کی۔ گو اس دوران میں کئی اندھیری راتیں آئیں اور چلی گئیں۔ لیکن ہم بالکل خاموش رہے۔ آج اپنی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی شیر مرد کو تلک بھگوان کے بت سے باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ میں ریت پر لیٹا لیٹا آگے گھسٹنے لگا۔ تاکہ اچھی طرح اور اطمینان سے ان کی باتیں سن سکوں۔

مرہٹہ کہہ رہا تھا "میرا نام انم راؤ کھانڈیکر ہے۔ میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا تھا۔"

تلک مہاراج بولے "میں بھی اسی زمانے میں پیدا ہوا تھا۔"

کھانڈیکر بولا "میں پونا کے ایک اسکول میں استاد تھا۔ مجھے اتہاس سے بڑی دلچسپی تھی۔"

تلک مہاراج بولے "مجھے بھی تاریخ سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔"

کھانڈیکر بولا "جن دنوں آپ نے وہ نعرہ بلند کیا۔ آزادی میرا پیدائشی حق ہے۔ میں ان دنوں میں اسکول میں ٹیچر تھا۔ میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھیں۔ آپ کی بہت سی تقریریں سنیں۔ میں بچوں کو اتہاس پڑھاتا تھا۔ اتہاس پڑھاتے پڑھاتے میرے دل میں نئی نئی امنگیں پیدا ہونے لگیں۔ عجیب عجیب سے خیال میرے دل و دماغ پر چھانے لگے۔ میں نے بچوں کو تاریخ اک بالکل نئے ڈھنگ سے پڑھانا شروع کر دیا اور جب میں پڑھاتے پڑھاتے غدر پر آیا تو۔

تلک مہاراج نے کہا "نہیں بھائی یہ بات نہیں ہے۔ مگر دراصل یہ جگہ میری۔ یہ چبوترہ میرا ہے۔ یہ بت میرا ہے"
کھانڈیکر بولا :- "تو میری جگہ کہاں ہے۔ تاریخ میں نہیں، چوپاٹی کے کنارے نہیں۔ لوگوں کے دلوں میں نہیں تو میں کہاں جاؤں"
تلک مہاراج بولے :- "میونسپل کارپوریشن کے پاس جاؤ۔ وہ لوگ تمہارے لئے ایک بت بنا دیں گے"
کھانڈیکر بولا :- "مگر وہ تو آدمی ہیں۔ اور آدمی آجکل کہاں دوسروں کی آواز سنتے ہیں۔"
تلک مہاراج بولے :- "تم جاؤ تو سہی۔ اور دیکھو جلدی جاؤ۔ وہ پولس کا آدمی آرہا ہے۔ کہیں تم کو گرفتار نہ کرے اور سنو اپنا بت کسی اچھی جگہ بنوانا۔ یہاں نہیں میرے قدموں میں ریت ہے تپتی ہوئی۔ اور سر پر آسمان اور دھوپ ہے سر میں شدید درد ہونے لگتا ہے اور سارا جسم دکھنے لگتا ہے۔ اور دن بھر تماشائیوں کا غل غپاڑہ رہتا ہے۔ اور بدتمیز لوگ دہی بڑے کی چاٹ کھا کھا کر جھوٹے پتل میری طرف پھینکتے۔ کسی اچھی جگہ اپنا بت بنوانا"

لیکن وہ پرچھائیں پولس کے ڈر سے غائب ہو چکی تھی۔ میں بھی جلدی سے اٹھ کر وہاں سے بھاگ آیا۔ بھاگتا بھاگتا چرچ گیٹ اسٹیشن تک آگیا۔ یہاں آکر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اور چلتے چلتے ہاکی گراونڈ کے پاس آنکلا اور یہاں ایک برگد کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں میرے کانوں نے سنا کوئی کہہ رہا ہے۔
"گوکھلے مہاراج"
"میں نے گھوم کر دیکھا" سامنے چبوترے پر گوکھلے مہاراج کا بت ہے۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے۔ اور ایک آدمی کوٹ پتلون پہنے ہوئے اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب وہ چبوترے کے اوپر چڑھ گیا۔ اور آگے بڑھنے لگا تو گوپال کرشن گوکھلے کے بت نے پریشان ہو کر کہا۔
"تم آگے بڑھے تو میں پولس کو بلاؤں گا"
"کیوں؟"
"میں قومی بت ہوں۔ تم میری بے حرمتی کر رہے ہو"
"بے حرمتی نہیں دوست" کوٹ پتلون پہنے ہوئے آدمی نے جواب دیا "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں"
"گوکھلے کا بت بولا "تو ذرا دور رہ کر تمیز سے بات کرو، کون ہو تم؟"
کوٹ پتلون پہنے ہوئے شخص نے جواب دیا "میرا نام کرتار سنگھ سرابھا ہے"
گوکھلے بولا "سکھ اور پنجابی۔ جب ہی اس قدر بدتمیزی سے پیش آ رہے ہو۔ جانتے نہیں ہو۔ میں امپیریل کونسل کا ممبر رہ چکا ہوں"
کرتار سنگھ نے کہا "دوست مجھے اسی حکومت کے حاکم اعلیٰ نے پھانسی کی سزا دی تھی۔ جس کی کونسل کے تم رکن رہ چکے ہو"
گوکھلے نے کہا "اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے حتی المقدور اپنی زندگی میں اپنے دیس کی سیوا کی ہے"
کرتار سنگھ نے کہا "کبھی جیل گئے ہو؟"
"نہیں"
"کبھی بھوک ہڑتال کی ہے"
نہیں

"تو کیا ہوا؟" تلک بھگوان نے پوچھا۔

"تو مجھے اسکول سے نکال دیا گیا۔"

افسروں نے کہا غدر غدر تھا۔ آزادی کی تحریک نہ تھی۔ میں جھوٹا تھا اور سازشی تھا۔ اور بچوں کا اخلاق خراب کر رہا تھا۔ اور ملک معظم کی حکومت کے خلاف نفرت پھیلاتا تھا۔ اس لئے مجھے اسکول سے باہر نکال دیا گیا۔ اور مجھ پر روزی کے سارے دروازے بند کر دئے گئے۔

"پھر تم نے کیا کیا" تلک بھگوان نے پوچھا

"پھر میں نے روزگار کے لئے ہر دروازہ کھٹکھٹایا جہاں سے دیش بھگتی کے طفیل مجھے روٹی ملنے کی اُمید تھی۔ کہیں پر بھی کچھ نہ ہو سکا۔ اس میں کسی کا قصور نہ تھا۔ حکومت کا رعب اس قدر غالب تھا کہ کوئی کسی کی مدد کے لئے تیار نہ تھا۔ پھر میں ملکی تحریک میں زور شور سے حصہ لینے لگا۔ اور میری بیوی نے لڑکیوں کے اسکول میں ملازمت کر لی۔ لیکن جب مجھے پہلی بار قید ہوئی تو اس کی وہ نوکری بھی چھوٹ گئی۔ ہمارے دو بچے تھے، وہ فاقوں کی نذر ہو گئے۔ میری بیوی اپنے میکے چلی گئی۔ جہاں گاؤں گاؤں کے پٹیل نے اسے اپنے ماں باپ کے گھر سے نکالی گئی تو اس کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ رنڈی بن کر گذارہ کر سکتی تھی مگر اس کی روح نے یہ گوارا نہ کیا اور وہ ندی میں ڈوب کر مر گئی۔ جب میں جیل سے رہا ہوا تو میں بالکل آزاد تھا۔ اب مجھ پر گھر بار کا کوئی بوجھ نہ تھا۔ میں نے بڑی مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا کسانوں میں۔ اور جب یہ تحریک چلی کہ لگان نہ دیا جائے۔ اس وقت میں جندن واڑی کے گاؤں میں یہی تحریک چلا رہا تھا۔ پہلے افسروں نے پھر فوج نے ہم سے لگان وصول کرنا چاہا۔ لیکن میں نے گاؤں والوں سے لگان نہ وصول کرنے دیا۔ اور اس لئے مجھے گولی مار دی گئی اور میں مر گیا۔ یہ نشان دیکھئے میرے جسم پر کم از کم بیس گولیوں کے نشان ہیں۔

"ہمیں بہت افسوس ہے" تلک مہاراج بولے "کیا نام بتایا تم نے؟"

"ہم راؤ کھانڈیکر"

"کبھی سنا نہیں یہ نام"

کھانڈیکر بولا "میرا نام کوئی نہیں جانتا۔ میری بیوی کا نام بھی کوئی نہیں جانتا جو ندی میں ڈوب مری تھی۔ میرے ان دو بچوں کے نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ جو فاقے کرتے کرتے مر گئے۔ تاریخ میں ہمارا کہیں نام نہیں ہے۔ پٹا بھی سیتا رامیہ نے کانگریس کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں بھی ہمارا کہیں نام نہیں ہے۔ اب ہمارا نام کہیں نہیں ہے۔ پونا والے، گاؤں والے سارا مہاراشٹر مجھے بھول چکا ہے۔"

"تو اب تمہیں کیا پریشانی ہے؟" تلک مہاراج نے پوچھا۔

"پریشانی نہیں ایک خواہش ہے۔ اسے پورا کرانے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"تلک مہاراج بولے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو پتھر کا بت ہوں"

کھانڈیکر بولا "بس میں بھی یہی بننا چاہتا ہوں۔ ایک پتھر کا بت، اپنے مرنے کے بعد آج تک حیران و پریشان ہو کر یہاں کی فضا میں گھومتا رہا ہوں، اب چاہتا ہوں کہ میں بھی آپ کی طرح ایک پتھر کا بت بن جاؤں۔ ذرا تھوڑی سی جگہ دے دیجئے!"

اور میں نے دیکھا کہ وہ پرچھائیں چبوترے پر چڑھنے لگی۔

تلک مہاراج گھبرا کر بولے "کیا کر رہے ہو؟"

کھانڈیکر نے کہا "میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی جگہ چاہئے آرام کے لئے۔ میں آپ کے پہلو میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ میں نے زندگی بھر آپ کے پہلو بہ پہلو کام کیا ہے۔ کیا موت کے بعد روح کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے؟"

"کبھی جیلروں اور وارڈروں سے پٹے ہو جتی کہ تمہاری پیٹھ زخموں سے چھلنی ہو گئی ہے۔ اور چابکوں کے آتشیں لمس نے تمہارے گوشت کو قیمہ بنا دیا ہے۔ اور تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ پانی مانگ رہا ہے۔ اور تمہاری زبان حلق سے باہر نکلی پڑتی ہے اور تمہیں ایک قطرہ پانی پینے کو نہیں دیتا"

"نہیں۔ اس قسم کا وحشیانہ تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا"

"اس لذت کی دوامی کیفیت سے میں آگاہ ہوں" کرتار سنگھ بولا۔ اور اس نے اپنا کوٹ اتار پھینکا اور اپنی قمیص بھی۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ پر سے لہو بہہ رہا ہے۔ اور چابکوں کے نشان اندر ریڑھ کی ہڈی تک چلے گئے ہیں۔ اور اس کے گلے میں ایک رسی ہے جسے اس نے ایک ٹائی کی طرح باندھ رکھا ہے۔

"یہ کیا ہے؟" گوکھلے مہاراج نے اپنی ناک پر رومال رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پھانسی کی رسی ہے۔ جسے میں آج تک گلے میں ڈالے ہوئے ہوں۔ اسی رسی نے میرا گلا گھونٹا تھا۔ اس وقت میں جوان تھا۔ اور طاقت ور تھا۔ اور خوش تھا۔ اور میں کلکتہ سے لے کر میرٹھ اور سامرت سر فوجیوں میں گھومتا تھا۔ تاکہ ان کو برطانوی حکومت سے بغاوت کے لئے آمادہ کروں۔"

گوکھلے بولا "تشدد آمیز بغاوت میرا مسلک نہیں۔ میں تو جوابی تعاون میں یقین رکھتا ہوں۔"

کرتار سنگھ نے اس کی بات ان سنی کر کے کہا "لیکن ہماری بغاوت کامیاب نہ رہی۔ ہماری تنظیم اچھی نہ تھی۔ ہمیں کچل کے رکھ دیا گیا۔ اور گولیوں کی باڑھ پر ہمارے جذبۂ آزادی کو بھون کے رکھ دیا گیا۔"

گوکھلے بولا "اب تم کیا چاہتے ہو"

کرتار سنگھ نے کہا "ذرا پرے سرک جاؤ۔ اس چبوترے پر مجھے تھوڑی سی جگہ دے دو۔ اس پر میرا بھی حق ہے۔ جانتے ہو پندرہ اگست کو جب تمہارے گلے میں ہار ڈالے گئے تھے۔ میں بھی اس چبوترے کے پاس کھڑا تھا۔ کسی نے مجھے ہار نہیں پہنائے۔ کسی نے میری پھانسی کی رسی کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی نے میری پیٹھ کے رستے ہوئے زخموں کو نہیں دیکھا۔ کسی نے میرے جسم کو نہیں دیکھا۔ جو بھوک ہڑتال کرتے کرتے سوکھ گیا۔ میری روح کو نہیں دیکھا جس نے آزادی کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ اپنی جوانی کی ساری بہار بھی، ساری آرزوئیں۔ ساری امنگیں۔ لوگوں نے تمہیں ہار پہنائے۔ اور کسی نے میری طرف ایک پھول بھی نہیں پھینکا۔ درست میں نے وطن کی خاطر امپیریل کونسل میں تقریریں نہیں کی ہیں۔ لیکن اپنے وطن کی خاطر موت کی رسی کو اپنے گلے سے ضرور باندھا ہے۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تمہاری عظمت کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن اب میں تھک چکا۔ اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پتھر کا بت بن جانا چاہتا ہوں تمہاری طرح۔ ذرا تھوڑی سی جگہ دے دو۔"

گوکھلے مہاراج بولے "بھئی میں مجبور ہوں۔ تمہیں جگہ نہیں دے سکتا اپنے پاس۔ کیونکہ میں تو جوابی تعاون میں یقین رکھتا ہوں اور تم تشدد آمیز بغاوت میں۔ ہمارا مسلک الگ الگ ہے۔ اور پھر تم کیوں نہیں میونسپل کارپوریشن کے یہاں درخواست کرتے۔ وہاں چلے جاؤ۔ ممکن ہے تمہارا کام ہو جائے اور اگر ہو گیا تو دیکھو، ادھر کہیں آس پاس میں اپنا بت نہ بنانا۔ میں اس جگہ سے خود بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ یہ قریب میں بڑ کا درخت ہے۔ یہاں سے پرندے میرے سر پہ بیٹ کرتے ہیں۔ اور یوں تو لوگ کبھی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ ہاں جب ہاکی گراؤنڈ میں لڑکیوں کا میچ ہوتا ہے تو ان کی ننگی ٹانگیں دیکھنے کے لئے مجھے یوں چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں کہ میرے لئے اپنی جگہ پر کھڑا ہونا دشوار ہو جاتا ہے اور رات کو بارہ بجے اس چبوترے کے نیچے پر طوائفوں اور تماش بینوں دہ چھا چالی ہوتی ہے!"

لیکن اس سے آگے گو کھلے مہاراج کچھ نہ کہہ سکے۔ کیونکہ پولس کا سپاہی گشت کرتا ہوا آرہا تھا۔ اور کرتار سنگھ سرابھا اسے دیکھتے ہی بھاگ گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے بہت دوڑا، بہت بھاگا۔ مگر وہ اتنی تیزی سے آگے نکل گیا کہ میں اسے پا نہ سکا۔ دوڑتے دوڑتے جب میرا دم پھول گیا تو میں یکایک ٹھٹک گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوشنما، پرفضا باغیچہ سا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر فرشتوں کے بت پھیلائے ہوئے کھڑے ہیں اور ان کے بیچ میں ایک بڑے چبوترہ پر دادا بھائی نوروجی کا عظیم بت پدرانہ شفقت سے سارے ہندستان کو تک رہا ہے۔

میں دیر تک ہندستانی قومیت کے پدر اعلیٰ کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں کسی نے کہا۔ "دادا بھائی!"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک لانبے قد کا سیاہ رنگ کا آدمی تھا۔ وہ سفید قمیص اور خاکی نیکر پہنے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بھی بند تھے۔ صرف اس کے ماتھے میں ایک سوراخ تھا۔ اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر آواز آئی۔ "دادا بھائی!"

یقیناً یہ وہی آدمی بول رہا تھا۔ لیکن نہ معلوم اس کے ہونٹ نہ ہلتے ہوئے بھی کس طرح بات کر رہے تھے۔

نوروجی بولے۔ "کیا بات ہے بیٹا؟"

"دادا بھائی،" وہ لانبا آدمی بولا۔ "مل مجدور ہوں!"

دادا بھائی نے بڑی شفقت سے پوچھا۔ "یہاں بمبئی میں کس مل میں کام کرتے ہو؟"

"نہیں دادا بھائی میں امل نیر میں تھا۔ میرا نام پاٹل ہے۔ میرے تین بچے ہیں۔ ایک بڑھیا ماں ہے ایک بڈھا باپ ہے۔ ان سب کا خرچہ میرے اوپر ہے اور میں یہ خرچہ تھوڑی سی مجوری میں پورا نہیں اٹھا سکتا۔ میرے مالک!"

"تو تم کیا چاہتے ہو؟" دادا بھائی بولے۔ "تنخواہ میں اضافہ؟"

"ہاں مالک۔ مہنگائی بہت ہے اور خرچہ زیادہ ہے۔ اور جندگی مصیبت ہے!"

"تو مل مالک سے کیوں نہیں کہتے؟"

"بہت کہا، مالک انھوں نے نہیں سنا!"

"تو سرکار سے کہو، اپنی سرکار سے کہو، اب تو اپنی سرکار ہے!"

"اپنی سرکار نے بھی نہیں سنی، انھوں نے ہمیں گولی مار دی ہے۔ مالک، یہ ماتھے پر گولی کا نشان ہے۔ میں امل نیر کا مل مجدور ہوں میرے تین بچے ہیں۔ ایک بیوی ہے۔ ایک بڈھی ماں ہے۔ ایک بڈھا باپ ہے اور سب کا خرچہ مجھ پر ہے اور مجھے مار دیا گیا ہے اور سب لوگ بھوکے ہیں۔ اور میں نے ہمیشہ کانگرس کو چندہ دیا ہے اور آجادی کے لئے ہڑتال بھی کی ہے مگر اب آجادی آگئی ہے۔ اور اس کی پہلی گولی میرے ماتھے پر ہے مالک!"

"تو تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں مجھے اپنی چھتر چھایا میں تھوڑی سی جگہ دے دو۔ میں ساری دنیا کے سامنے کھڑا ہو کے، تمہارے نزدیک کھڑا ہو کے اپنے ماتھے کا لال نشان دکھانا چاہتا ہوں۔ اور بھائی کیا میرے ماتھے کا خون کبھی بند نہ ہوگا۔ میرے بڈھے باپ کو کوئی روٹی نہ دے گا۔ میری بیوی کو کوئی عزت نہ دے گا۔ میری ماں کی ممتا کیا سدا پیاسی رہے گی۔" دادا بھائی بولو۔ دادا بھائی بولو۔ تم تو پارلیمنٹ میں شیر کی طرح گرجتے تھے۔ اب چپ کیوں ہو؟

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں آگے کچھ نہ سن سکا اور وہاں سے چلا آیا۔ اور روتے روتے اے آئی سی سی پنڈال کے باہر پہنچ گیا۔ جہاں مہاتما گاندھی کا بت کھڑا تھا۔ اے آئی سی سی کا اجلاس ختم ہوگیا تھا۔ اور تماشائی رخصت ہو گئے تھے۔ اور اب پنڈال توڑا جا رہا تھا

ٹھیلا نیچے لاتے بالس لاریوں میں بھر بھر کر واپس لے جائے جارہے تھے۔ میں بت کے پاس چلا گیا۔ اور رندھے ہوئے گلے سے بولا۔

"باپو دیکھ تو سہی۔ تیرے راج میں کتنا اندھیرا ہے۔ لنگوٹی والے باپو، آ میں تجھے دکھاؤں کہ تیرے فدائی تیرے نام پر کیا کر رہے ہیں۔"

اور سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے اور جب روشنی ہو جاتی ہے تو بت نہیں بولتے۔ میرے پاس ایک مزدور کھڑا تھا۔ وہ بولا۔ "اس چبوترے سے پرے ہٹ جاؤ۔ اس بت کو یہاں سے اٹھانا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا:۔ "اسے ایک مل مالک نے خرید لیا ہے۔ یہ بت آج اس کے گھر اٹھ جائے گا۔"

کیفی اعظمی

تلنگانہ

ضعیف مائیں، جوان بہنیں جھکے ہوئے سر اٹھا رہی ہیں
سلگتی نظروں کی آنچ میں بھیگی بھیگی پلکیں سکھا رہی ہیں
لہو بھری چولیوں، پھٹے آنچلوں سے پرچم بنا رہی ہیں
ترانۂ جنگ گا رہی ہیں

ذرا پکار دو بے چین نوجوانوں کو
ذرا جھنجھوڑ دو کچلے ہوئے کسانوں کو
ادھر سے قافلۂ انقلاب گذرے گا
بچھا دو سینۂ گیتی پہ آسمانوں کو

سفید پلکوں کھچی ہوئی جھریوں میں شعلے مچل پڑے ہیں
جواں نگاہوں، جواں دلوں سے، ہزار طوفاں ابل پڑے ہیں
بھرے ہوئے دامنوں میں پتھر گھروں سے بچے نکل پڑے ہیں
سب ایک ہی سمت چل پڑے ہیں

جتا دو قصر حکومت کے سب مکینوں کو
بچا سکیں تو بچا لیں گے شہ نشینوں کو
ترستے رہتے ہیں جو ہاتھ آستینوں کے لئے
جلال میں وہ الٹ دیتے ہیں زمینوں کو

چمک رہے ہیں گنڈیلے شانوں پہ پھاوڑے، بیلچے، کدالیں
اڑا رہی ہیں ہوا میں چنگاریاں تفنگوں کی گرم نالیں
وہ گولیاں بے جھجک ہو میں جو بادشاہوں کے بھی نہالیں
وہ گو پھنیں تاج جو گرا لیں

یہ جست روس کے میدان نے سکھائی ہے
یہ فوج چین سے ہوتی دکھن میں آئی ہے
وہ اٹھ کھڑے ہوئے دھرنا دئے جو بیٹھے تھے
کہ آج شاہ کے ایوان پر چڑھائی ہے

یہ شہریاری یہ تاج داری وجود پہ بار ہو گئی ہے
جفا کی خوگر غریب دنیا جفا سے بیزار ہو گئی ہے
زمین ہر چھاونی نگلنے پہ آج تیار ہو گئی ہے
کہ بھوک بیدار ہو گئی ہے

نہ صرف خاص کی حد بندیاں نہ جاگیریں
ہر ایک گام پہ ٹوٹی پڑی ہیں زنجیریں
وہ کھیت کون اجاڑے گا۔ کون لوٹے گا
اُگی ہوئی ہوں منڈوں پہ جن کی شمشیریں
عوام کا اضطراب ہے یہ عوام کا پیچ و تاب ہے یہ
ستم سے دبنا ہے غیر ممکن کہ ہر ستم کا جواب ہے یہ
سمجھتے ہو سستیہ گرہ اس کو ارتقاء کا عتاب ہے یہ
جھکا دو سر انقلاب ہے یہ

کہاں سوالی کہاں جدوجہد کی منزل
مفاہمت نہیں باقی جہاد کا حاصل
ہوائے تند نے گوندھی ہے زلف آزادی
بغاوتوں نے نکھارا ہے حسن مستقبل
حیات انگڑائی لے کے اپنا نظام اب خود سنبھالتی ہے
جلی ہوئی بستیوں پہ تعمیر عکس شہروں کا ڈالتی ہے
روش روش کو شگوفہ کاری چمن کے سانچے میں ڈھالتی ہے
کلی کلی رنگ اچھالتی ہے

لہو سے سینۂ گیتی کے داغ دھوئے ہیں
جگا کے خاک کی قسمت شہید سوئے ہیں
کہیں کی فوج سہی اس طرف کا رخ نہ کریں
یہاں زمین میں بم من چلوں نے بوئے ہیں
ابھرتی انسانیت کی توہین ہے تشدد کی حکمرانی
جبین تاریخ پہ ہے اک داغ آج کی مطلق العنانی
تمہارے ہمراہ فتح و نصرت تمہارے قدموں میں کامرانی
مجاہدو! وہ ہے راج دھانی

کرشن چندر

بہار سے پہلے

(طویل کہانی کا اقتباس)

اور پندرہ اگست کی رات کو مالی نے ایک بڑا بھیانک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ غلّے کے انبار آسمان تک اونچے چلے گئے ہیں اور کروڑوں آدمی ان کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ اور جوں ہی وہ لوگ غلے کو اٹھانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ان انباروں کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور انباروں کو اپنی اوٹ میں لے لیتے ہیں اور یہ درخت اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے کھڑے ہیں کہ کوئی غلے کا ایک دانہ بھی نہیں لے جا سکتا۔

پھر اس نے دیکھا کہ ہزاروں سیڑھیوں کے اوپر بڑی بڑی عالیشان ملیں ہیں۔ جو شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ جن کے اندر لاکھوں چرخیاں چل رہی ہیں اور کپڑا بن رہی ہیں اور یہ کپڑا لاکھوں کروڑوں اربوں گز تیار ہو کے اوپر آسمان کی طرف بادل بن کے اڑا جا رہا ہے اور سیڑھیوں پر لاکھوں آدمی ننگے پڑے ہیں اور گھسٹ گھسٹ کر اوپر چڑھ رہے ہیں اور کپڑے کے لئے چیخ رہے ہیں اور جوں ہی یہ لوگ بڑی مشکل سے سیڑھیاں چڑھ کے دروازوں تک پہنچتے ہیں۔ کہ چاروں طرف اونچے اونچے درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے اور ان کی اوٹ میں وہ ملیں اور نہ

کارخانے حبیب جاتے ہیں اور لوگ سیڑھیوں پر نڈھال ہو کے گر پڑتے ہیں۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا باغ ہے۔ میلوں تک پھیلا ہوا اور اس میں ایک بہت بڑا محل ہے۔ ایکڑوں کے قبضے میں پھیلا ہوا۔ اور اس محل کے عالیشان دروازے کے باہر بلند و بالا ستونوں کے پاس ایک دبلا پتلا آدمی کھڑا ہے۔ سیاہ چشمہ لگائے ہوئے اور اس کے سامنے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا مجمع ہے۔ جو مرد ہیں ان کے سر کٹے ہوئے ہیں جو عورتیں ہیں ان کے پستان اور یہ مجمع لاکھوں زبانوں سے پوچھتا ہے

"اس میلوں تک پھیلے ہوئے باغ اور اس کے اندر اس عالی شان محل میں کون رہتا ہے؟"

"میں رہتا ہوں"

"تم کون ہو"

"میں ہندستان کا سب سے بڑا افسر ہوں، تم کون ہو"

ہم ہندستان ہیں، لاکھوں زبانیں۔ سرخ سرخ پیلی زبانیں بولنے لگتی ہیں۔ بھوکا ننگا پیاسا ہندوستان۔ ہم اس محل کے اندر آنا چاہتے ہیں کیوں کہ ہمارے پاس کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی زمین نہیں ہے۔ کوئی روزی کی سبیل نہیں ہے۔

سیاہ چشمہ پہنے ہوئے وہ دبلا پتلا آدمی بڑے دھیمے سروں میں شیریں آواز میں کہتا ہے: "ٹھہرو، ٹھہرو۔ مجھے تاج برطانیہ سے پوچھنا ہوگا۔ تم نہیں جانتے کہ دستوری حکومت کے مطابق . . . . . ."

لیکن لوگ چلا کر کہتے ہیں "دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔"

وہ دبلا پتلا آدمی اندر چلا جاتا ہے۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ پھر بھی نہیں کھلتا۔ اور لوگ ہزاروں، لاکھوں لوگ چاروں طرف سے آگے بڑھتے ہیں اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی نہیں کھلتا۔ . . . . .

اور پھر اس نے دیکھا کہ جیسے یہ منظر آن واحد میں غائب ہوا، اور اس کی جگہ ایک عالیشان کورٹ کے گنبد پر سبز رنگ کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور کورٹ کے چاروں طرف دراز قد بلوچی سپاہی کھڑے ہیں۔ لیکن جیسے وہ پتھر کے بت بنے ہیں۔ ان میں سے کوئی حرکت نہیں کرتا۔ درحالیکہ اس وقت اس وقت چاروں طرف سے سر بریدہ مرد آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ہزاروں عورتیں اپنے زخمی جسموں کو اپنے باہوں میں چھپائے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان عورتوں کے بالوں میں تیل کے کڑاہے ابل رہے ہیں۔ جن میں ان کے بچے تلے جا رہے ہیں۔ اپنے سر اپنے ہاتھوں میں لئے ہیں اور ان کی آنکھوں سے خون جاری ہے۔ اور عورتوں کی آنکھوں سے دودھ کے آنسو پھوٹ رہے ہیں اور جہاں پر اس دودھ کی ایک بوند گرتی ہے۔ وہاں سے گوشت کے جلنے کی آواز سی پیدا ہو رہی۔

اور یہ ہزاروں لاکھوں مرد اور عورتیں آگے بڑھتے ہوئے اس کورٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ مکھیوں کے بھنبھنانے کا سا شور پیدا ہوتا ہے۔ اور بلند ہوتا جاتا ہے۔ اتنے میں کورٹ کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک خوش پوش انسان نمودار ہوتا ہے اور اپنی میٹھی مہربان مسکراہٹ کو اپنے چہرے پر لا کے پوچھتا ہے۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو"

"ہم اندر آنا چاہتے ہیں"

"تم اندر نہیں آسکتے"

"کیوں"

"یہ جگہ میری ہے"

"تم کون ہو"

"میں پاکستان کا سب سے بڑا افسر ہوں۔ اور تم کون ہو؟"

"ہم پاکستان ہیں، ہم مہاجرین ہیں۔ ہم لٹی ہوئی عصمتیں ہیں۔ ہم تیل میں بھنے ہوئے بچے ہیں۔ ہم زندگی کی فریاد ہیں۔ انسانیت کا زخم ہیں، سرمایہ داری کا داغ ہیں۔ جاگیرداری کا ظلم ہیں۔ مذہب کی لاش ہیں۔ ہمیں اپنے کلیجے سے چمٹا لو۔ مرہم کی طرح ہمارے رستے ہوئے ناسوروں سے لگ جاؤ۔"

اسی میٹھی مہرباں مسکراہٹ کے ساتھ انکار سے سر ہلاتے ہوئے وہ آدمی اندر چلا جاتا ہے اور اندر سے دروازے سے جھانک کے کہتا ہے: "مجھے افسوس ہے بھائیو۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"اگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تو یہ کورٹ چھوڑ دو۔ اور ہم میں آملو" لاکھوں آدمیوں کی گونج پیدا ہوتی ہے۔

"افسوس ہے کہ آپ لوگ جاہل ہیں۔ دستوری حکومت کے آداب جن سے گورنر جنرل پاکستان کا براہ راست تاج برطانیہ سے تعلق ہے . . ."

خوش پوش انسان اندر چلا جاتا ہے۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ پھر بھی نہیں کھلتا۔ اور لوگ ــ ہزاروں لاکھوں لوگ چاروں طرف سے آگے بڑھتے ہیں اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی نہیں کھلتا . . .

اور پھر مالی نے دیکھا کہ وہ سب کچھ نہیں ہے صرف ایک کار ہے اور وہ دور تک نئے لگے ہوئے پودوں کو روندتی جا رہی ہے۔ مالی چیختا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ ایسا مت کرو۔ یہ نئے پودے ہیں۔ ایسا مت کرو۔ وہ دوڑتا دوڑتا گر پڑتا ہے۔ ایک کچلے ہوئے پودے کے پاس اور پھر وہ ہاتھ بڑھا کر اس پودے کو اٹھا لیتا ہے۔ اور آن واحد میں وہ پودا۔ اس کے ہات میں ایک لہراتا ہوا سانپ کا پھن بن جاتا ہے اور وہ گھبرا کر اور چیخ مار کر اسے اپنے ہات سے چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

"کیا ہوا؟" مالی کی بیوی نے اس سے پوچھا۔

مالی بولا "اوہ بڑا بھیانک اور عجیب خواب تھا"

وہ آنکھیں ملتا ہوا آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ آزادی کی رات ختم ہو رہی ہے اور سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے وہ نلائی کا سامان اٹھا کے باغیچے میں چلا گیا۔ جہاں صبح اس نے گلاب کے پیڑ پر ایک ننھی سی کلی کو پھوٹتے دیکھا تھا۔ یہ کلی اس وقت گلاب کا ایک ہنستا ہوا شگفتہ پھول بن گئی تھی۔ اور اس کی نازک پتیوں پر شبنم کی بوندیں لرز رہی تھیں

مجروح سلطانپوری

غزل

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا — سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن — دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر — غیر ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

غزل

آخر غم جاناں کو اے دل بڑھ کر غم دوراں ہونا تھا
اس قطرے کو بننا تھا دریا اس موج کو طوفاں ہونا تھا

آتی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلان بہاراں ہونا تھا

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ابھی فردوس و جناں کے شیدائی
تجھ کو تو ابھی کچھ اور حسیں اے عالم امکاں ہونا تھا

وہ جس کے گداز محنت سے پر نور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا

آیا ہے ہمارے ملک میں بھی اک دور زلیخائی یعنی
اب وہ غم زنداں دیتے ہیں جن کو غم زنداں ہونا تھا

اب کھل کے کہوں گا ہر غم دل مجروح نہیں وہ وقت کہ جب
اشکوں میں سنانا تھا مجھ کو آہوں میں غزلخواں ہونا تھا

غزل

اب اہل درد یہ جینے کا اہتمام کریں
اسے بھلا کے غم زندگی کا نام کریں

غم حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

زبوں ہے میکدہ اس فتنۂ تخیل سے
اٹھا کے دوزخ و جنت کو غرق جام کریں

قطعہ

ہیں اس کشاکش پیہم میں زندگی کے مزے
پھر ایک بار کوئی سعئ ناتمام کریں

سکھائیں دست طلب کو ادائے بے باکی
پیام زیر لبی کو صلائے عام کریں

زمیں کو مل کے سنواریں مثال روئے نگار
رخ نگار کی ضو سے فروغ بام کریں

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروان حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

علی سردار جعفری کی گرفتاری

۲۱ر جنوری کو علی سردار جعفری گرفتار کرلئے گئے۔ وہ غالباً قانون تحفظ امن عامہ کے تحت گرفتار کئے گئے ہیں۔ گو وہ ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں کر رہے تھے جس سے تحفظ امن عامہ پر چوٹ پڑتی ہو، بلکہ وہ تو عامۃ الناس کے تحفظ اور بچاؤ ہی کے لئے لڑ رہے تھے، وہ عوام کی روٹی کے لئے۔۔۔۔۔ عوام کے کھانے کپڑے کے لئے۔ عوام کی تہذیبی اور تمدنی ترقی کے لئے اور عوام کی جمہوری آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ یعنی وہ ان تمام باتوں کے لئے لڑ رہے تھے جن کا قانون تحفظ امن عامہ میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن ہونا چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر اس قانون کے زیر تحت صرف وہی لوگ گرفتار ہو سکتے تھے جو (۱) عوام سے ان کی روٹی چھینتے ہیں (۲) عوام سے ان کے گھر چھینتے ہیں (۳) عوام کی اشیائے ضروریات کو چور بازار میں لے جاکے فروخت کرتے ہیں (۴) عوام کی جمہوری آزادی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ (۵) عوام کی پیدا کی ہوئی دولت کو لوٹ کر ملک کے ایک قلیل طبقے کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔

مگر ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ لوگ گرفتار کئے جا رہے ہیں جو عوام کے ان حقوق کے تحفظ اور بقا کے لئے مخالف طاقتوں سے لڑ رہے ہیں۔ علی سردار جعفری گذشتہ پندرہ سال سے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ وہ فرنگیوں کے خلاف لڑتے تھے۔ بدیسی سرمایہ پرستوں کے خلاف لڑتے تھے، اور اب سودیشی مہاجنی نظام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی لڑائی بند نہیں کی ہے۔ کیونکہ انھیں ہندستان سے محبت ہے۔ اس کے عوام سے محبت ہے۔ اس کے مختلف مذہبوں، تہذیبوں سے محبت ہے۔ وہ پوری انسانیت سے پیار کرتے ہیں اور یہی پیار۔ یہی خلوص اور محبت کا بے پناہ جذبہ آج انھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے گیا ہے۔ لیکن شاعر کو کس نے قید کیا ہے۔ شاعر تو قوم کی آواز ہوتا ہے۔ اور اس کی آواز کو آج تک کوئی قید نہیں کر سکا۔ ہمیں امید ہے کہ ملک کی ترقی پسند طاقتیں علی سردار جعفری کی گرفتاری کا مناسب جواب دیں گی۔ اور مجموعی طور پر اور زیادہ مضبوط، طاقتور اور ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گی۔ جہاں جہاں ترقی پسند مصنفین کی شاخیں نہیں ہیں۔ وہاں پر شاخیں قائم ہوں گی۔ اور جہاں جہاں نیا ادب نہیں پہنچا ہے وہاں بھی اب ہماری آواز سنی جائے گی اور جہاں کہیں انتشار تھا۔ تشکک تھا۔ وہاں اب یہ بے عملی کی باتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور ہمارے ادیب ادبی بے باکی اور بے جگری اور دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے صف آراستہ ہو جائیں گے تاکہ علی سردار جعفری کا پیغام پورا ہو سکے۔

علی سردار جعفری کی گرفتاری پر ۲۳ر جنوری کو انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے جلسہ میں یہ تجویز پاس کی گئی جسے کرشن چندر نے پیش کیا اور ساغر نظامی نے جس کی تائید کی۔ عصمت چغتائی، مجروح سلطان پوری، شاہد لطیف، مہدی حسن، ساغر نظامی، رمیش سنہا۔ اور دیگر ادیبوں نے تجویز پر تقریریں کرتے ہوئے حکومت بمبئی کی دست درازیوں پر پرجوش الفاظ میں مذمت کی۔ جلسہ کی مکمل کاروائی مارچ کے پرچہ میں شائع ہوگی۔ (ادارہ)

"صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ بائیکلہ بمبئی۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۴۹ء

"انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ جلسہ حکومت بمبئی کے اس فعل پر سخت احتجاج کرتا ہے کہ اس نے کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے آرگنائزنگ سکریٹری اور اردو کے مشہور شاعر سردار جعفری کو قانون تحفظ امن عامہ کے تحت گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ پولیس نے سردار جعفری پر یہ بے بنیاد اور جھوٹا الزام لگایا ہے کہ وہ فرقہ پرستی کی تبلیغ کرتے تھے۔ اور مذہبی جذبات برانگیختہ کرتے تھے۔ ترقی پسند ادیب اور کمیونسٹ کی حیثیت سے انھوں نے فرقہ پرستی کے خلاف مسلسل جد و جہد کی۔ ان کی نظمیں مضامین اور تقریریں اس بات کی شاہد ہیں۔ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے انھوں نے عوام کے حق میں آواز بلند کی اور حکومت نے عوام کے خلاف جو بھی غیر جمہوری اقدام اٹھایا۔ اس کی انھوں نے ہمیشہ پر زور مذمت کی اور یہی وجہ ہے کہ وہ حکومت کی نظر میں کھٹکنے لگے اور آخر انھیں گرفتار کیا گیا تاکہ انجمن ترقی پسند مصنفین پر ضرب لگائی جائے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے سکریٹری، کیفی اعظمی اور اردو کے ممتاز شاعر نیاز حیدر کے خلاف بھی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ ہم ادیب حکومت کے اس فعل کو ادب اور کلچر پر زبردست وار سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس طرح ادب اور کلچر کو کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ سردار جعفری کو فوراً رہا کرنے یا ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے اور کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ واپس لے۔ ہم انجمن کی تمام شاخوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ حکومت بمبئی کی ادب کش پالیسی کے خلاف احتجاج کریں۔

اسکولوں میں سینما

وی ۔ ساٹھے

فلم نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ تفریح کے علاوہ تعلیم کے لئے موجودہ دور میں اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ۔ دوسرے ملکوں کے اسکولوں اور کالجوں میں کتابوں کے علاوہ فلم کی مدد سے تعلیم دی جاتی ہے ۔ اور تعلیم کا یہ طریقہ بہت مفید ثابت ہوا ہے ۔

ہندوستان میں اب تک اس سلسلے میں کسی نے عملی قدم نہیں اٹھایا تھا ۔ یہ امر بہت مبارک ہے کہ نیشنل ایجوکیشن اینڈ انفرمیشن فلمس لمیٹڈ (دنشی ہاؤس ، اپالو بندر ۔ بندر ۔ بمبئی) نے ایک اسکیم تیار کی ہے ۔ جس کے مطابق یہ ادارہ تعلیمی اور معلوماتی فلموں کی نمائش ہر اسکول اور ملک کے ہر شہر اور دیہات میں کرے گا ۔ ان فلموں کے پیش کرنے ، تقسیم کرنے ، اور دکھانے کا سارا کام اسی ادارہ کے سپرد ہوگا ۔ اس ادارہ کا منظور شدہ سرمایہ ایک کروڑ روپیہ ہے ۔ جس میں سے پچیس لاکھ روپے کے شیرز فروخت کئے جائیں گے ۔

بورڈ آف ڈائرکٹرس بورڈ آف ڈائرکٹرس میں ان مشاہیر کے نام شامل ہیں ۔ جن سے ہندوستان کا ہر فرد واقف ہے ۔ مثلاً سر سیموئل رنگندھن ، ایل ۔ کرم چند تھاپر ، سیٹھ آنندی لال پودار کلکتہ کے سابق میور ، راجہ صاحب آف اودے پور کھیر اگرھ (سی ۔ پی) ، ایس ۔ بی ۔ سردار اجل سنگھ ، راجہ صاحب آف کیلوکونڈے ، خواجہ احمد عباس ، گوردھن داس اگروال

مشیر کار :۔ اس ادارہ کی رہنمائی ہندوستان کی مایہ ناز ہستیوں کے ہاتھ میں ہے جن کے بیش بہا مشورے تعلیمی فلموں کی پالیسی مرتب کرنے میں بے انتہا مفید ثابت ہوں گے ۔ اس شوراتی کونسل میں ذیل کے نام قابل توجہ ہیں :۔

جے پرکاش نرائن ۔ کملا دیوی چٹوپادھیا ۔ یوسف مہر علی ، سیٹھ گووند داس ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر ۔ ڈاکٹر ایچ ۔ سی ۔ مکرجی ۔ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے نائب صدر ، ڈاکٹر ڈی ۔ ایس ۔ جھا سی ۔ پی اور برار کے محکمۂ تعلیم کے سکریٹری ۔ ڈاکٹر ۔ ڈی ۔ ایم سین مغربی بنگال کے محکمۂ تعلیم کے سکریٹری ، ایس ۔ ایس ۔ ماتھر دہلی ، اجمیر ، مارواڑ اور سنٹرل انڈیا کے محکمۂ تعلیم کے سکریٹری ، بی ۔ ایس کیسوان نیشنل لائبریری گورنمنٹ آف انڈیا کے کیوریٹر ۔

چلتے پھرتے یونٹ یہ ادارہ مختلف صوبوں میں اپنے مرکز قائم کرے گا ۔ جہاں پر فلم لائبریریاں قائم کی جائیں گی ۔ یہ مرکز فلموں کی نمائش کا سارا انتظام سنبھالے گا ۔ ہر صوبہ کے مرکز کی متعدد شاخیں ہوں گی ، جو فلموں کی نمائش کے جملہ سامان سے آراستہ ہوں گی ۔ ان کا کام ہوگا کہ جو اسکول خود اپنے پروجیکٹر لگوانا چاہیں وہ اس کا انتظام کرے ۔ اور جن اسکولوں میں پروجیکٹر لگے ہوئے ہیں وہاں فلموں کی نمائش کا انتظام کرے ۔ چلتے پھرتے یونٹ اس سلسلے میں نمایاں عملی کام کر سکتے ہیں ۔

دو آنے میں آٹھ فلم :۔ مشاق حساب دانوں نے تخمینہ لگایا ہے کہ ایک طالب علم دو آنے اور چھ آنے کے درمیان آٹھ فلم دیکھ سکتا ہے اس کے علاوہ "بال تھیٹر" بھی قائم کئے جائیں گے ۔

سال میں سو فلمیں ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مختلف موضوعات پر ہر سال تقریباً ایک سو فلمیں پیش کی جائیں گی ۔ ان فلموں کے بنانے میں بہترین اداکار ، آلات ، اور اسٹوڈیو سے کام لیا جائے گا ۔ ہندوستان میں یہ ادارہ اپنے قسم کا پہلا ادارہ ہوگا ۔ جو تعلیمی فلمیں ہندوستانی پس منظر کے مطابق اور مقامی ضروریات کے لحاظ سے ہندوستانی ۔ اردو ، دیگر صوبجاتی زبانوں میں تیار کرے گا ۔ اس کے علاوہ بیرونی ممالک کی تعلیمی فلمیں جو ہندوستانی حالات کے لئے موافق ہوں گی ۔ اس ادارہ کے ذریعہ ملک کے اسکولوں میں نمائش کے لئے حاصل کی جائیں گی ۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ نیک منصوبہ عملی جامہ پہن کر ملک کی ترقی میں ایک تاریخی کارنامہ ثابت ہوگا ۔

علم و دانش

ادب، فلسفہ، تاریخ، سیاست اور سائنس

کا

مارکسی ماہنامہ

جسے

احتشام حسین   سردار جعفری   محمد مہدی

ترتیب دے رہے ہیں

فروری ۱۹۴۹ء سے شائع ہو رہا ہے

پہلے شمارہ کے بعض اہم مضامین

انقلاب کی منزل	جدلی مادیت
چینی انقلاب	ہندستان کا معاشی بحران
ہندستانی سرمایہ دار	ننھا شاعر (کہانی - گورکی)

سالانہ چندہ . . . . . پانچ روپیہ

ششماہی . . . تین روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

۹۶ والکیشور روڈ۔ ملابار ہل۔ بمبئی

جب ان آزاد بندوں نے آنکھیں کھولیں

تو

- وہ چیخوں، آہوں اور آنسوؤں میں گھرے ہوئے تھے
- وہ بے گھر، بے در اور بیکار ہو گئے تھے
- وہ حسن نغمہ اور رومانس سے محروم ہو گئے تھے

اور

ان اجڑی بچھڑی زندگیوں کے سینے سے دھواں اٹھ رہا تھا

عوام کے محبوب فن کار

فکر تونسوی

نے یہ اندوہناک اور غمگین کہانیاں جمع کیں

دھواں اٹھتا ہے

فکر تونسوی کے دس طنزیہ اور زہریلے مضامین

کا مجموعہ

جس میں

فن کار نے آزاد عوام کی گھناونی سماجی زندگی کو

بے نقاب کیا ہے

قیمت دو روپے   بہت جلد چھپ رہی ہے

ادبی مندر پبلشرز۔ دہلی

کتب پبلشرز لمیٹڈ ۔ بمبئی

ہماری کتابیں

"کتاب بظاہر کتنی معمولی سی چیز ہے مگر در اصل یہ دنیا کا سب سے بڑا اور پر اسرار معجزہ ہے۔ کاغذ کے ان ٹکڑوں سے جن پر سیاہ نقوش ابھرے ہوئے ہیں۔ ہماری آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں یا ہمیں غصہ آنے لگتا ہے۔ کبھی ہم خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں اور کبھی کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں!"

میکسم گورکی

افسانوی ادب

کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، ملک راج آنند، احمد عباس۔ راجندر سنگھ بیدی، اور دوسرے ادیبوں کے شاہکار۔

۱۔ اجنتا سے آگے

(کہانیوں کا مجموعہ) مصنفہ کرشن چندر قیمت دو روپیہ بارہ آنے

اجنتا کے مصوروں نے پتھر کے سینے پر لازوال حسن کے نقش کھینچے ہیں۔ کرشن چندر کہتا ہے۔ یہ نقش نا تمام ہیں۔ ان کا حسن نا تمام ہے۔ انسانیت کو اپنی تکمیل کے لئے ابھی اور آگے بڑھنا ہے۔ کرشن کو اپنی نئی کہانیوں میں اس جہان کی تلاش ہے۔ جس کی تعمیر انسان صدیوں سے کر رہا ہے۔ اس انسان کی تلاش ہے جس کی تکمیل اجنتا کے چابکدست نقاش بھی نہیں کر سکتے۔ "اجنتا سے آگے" کرشن چندر کے جادو بھرے قلم حسین مرقع ہے۔ جس کی ہر کہانی ایک خوبصورت تصویر ہے۔ جس پر اردو ادب ہمیشہ ناز کرے گا۔

۲۔ ہم وحشی ہیں

(کہانیوں کا مجموعہ) مصنفہ کرشن چندر قیمت ڈیڑھ روپیہ

جب بنگال بھوک سے ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ تو کرشن چندر نے "ان داتا" لکھا۔ جب بمبئی میں ملاحوں نے بغاوت کی تو اس نے "تین غنڈے" لکھا۔ اور آج جب سامراجیوں اور سرمایہ داروں کی سازشوں سے ہندستان اور پاکستان خون میں غرق ہو گئے تو کرشن چندر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ پنجاب کی مصیبت پر اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اسے اپنے وطن کے لہلہاتے ہوئے کھیت، ہنستے ہوئے چہرے، اور میٹھے گیت خاک وخون میں لتھڑے ہوئے نظر آئے اور اس نے سات افسانے سپرد قلم کئے۔ یہ وحشت اور درندگی کے خلاف انسانیت کی پکار ہے للکار ہے (تیسرا ایڈیشن)

کرشن چندر کی دوسری زیر طبع کتابیں (۱) کہانی کی کہانی (۲) نیا قاعدہ (۳) ان داتا (۴) تین غنڈے

۳۔ چغد۔

(کہانیوں کا مجموعہ) مصنفہ سعادت حسن منٹو قیمت سوا تین روپے

اردو کے سب سے زیادہ بدنام افسانہ نگار کے نئے افسانے جن میں اس نے ایک بار پھر ان چہروں سے نقاب اٹھا دیا۔ جو بظاہر بڑے گھنونے معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل بڑے تابناک ہیں۔

۴۔ دو ہاتھ بانکیں

(ڈرامہ) مصنفہ عصمت چغتائی قیمت ایک روپیہ

شیشے کی چوڑیاں ہندستانی عورت کا سہاگ ہیں۔ ملک کے موجودہ فرقہ وارانہ فساد میں کتنی ہی نازک اور خوبصورت چوڑیاں ٹوٹ گئیں، اور کتنی ہی مسکراتی ہوئی مانگیں اجڑ گئیں۔ کتنے پہلو سونے ہو گئے، کتنی گودیں ویران ہو گئیں۔ ہر ٹوٹتی ہوئی چوڑی ایک چیخ ہے جسے عصمت کے حساس دل نے سنا ہے۔ آپ بھی اس دلدوز آواز کو سنئے اور دوسروں کو سنائیے۔ اگر آپ نے آج گھبرا کر اپنے کان بند کر لئے تو یہ آواز ہمیشہ آپ کے

روح و دل کا تعاقب کرتی رہے گی۔ کیونکہ یہ انسانیت اور محبت کی آواز ہے جو غم اور اندوہ، مظلومیت اور بیچارگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوئی ہے
عصمت کی نئی کہانیوں کا مجموعہ جو زیر طبع ہے۔ "چھوئی موئی"

۵- زعفران کے پھول (کہانیاں)

از خواجہ احمد عباس — قیمت دو روپیہ بارہ آنے

جب بہت سے افسانہ نگار زندگی کے گرد منڈلا رہے تھے۔ عین اسی وقت عباس خاموشی سے اٹھا اور ٹھوس حقیقتوں پر ٹوٹ پڑا کسی نے کہا وہ اخبار نویس ہے۔ کسی نے کہا وہ ڈھنڈورچی ہے۔ زندگی نے کہا۔ زندگی نے کہا وہ میرا نباض ہے۔ "زعفران کے پھول"، میں عباس کا فن اپنے پورے شباب پر ہے۔ یہ عباس کے تخیل اور فکر ہی کی نہیں اردو افسانہ نگاری کی معراج ہے۔ یہ مجموعہ ترقی پسند ادب کے خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

۶- قلی (ناول)

از ملک راج آنند — قیمت ساڑھے چھ روپیہ

جو ہندستانی ادیب انگریزی میں لکھتے ہیں ان میں ملک راج آنند کا درجہ سب سے بلند ہے۔ آنند نے اپنے ناول میں ہندستان کی سچی اور دکھ بھری تصویریں کھینچی ہیں اور دنیا کو ان مظالم سے آشنا کیا ہے جو فرنگی حکومت نے ہم پر توڑے ہیں۔ "قلی" آنند کا شاہکار ہے جس کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ ہندستانی زندگی کی اتنی سچی اور دلکش تصویر پریم چند کے بعد ملک راج آنند ہی نے کھینچی ہے۔ اردو سے پہلے اس کا ترجمہ روسی، فرانسیسی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ہندستان اس ناول پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

۷- کوکھ جلی (کہانیوں کا مجموعہ)

از راجندر سنگھ بیدی — قیمت تین روپیہ بارہ آنے

"گرہن" اور "دانہ و دام" کے مصنف کی نئی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا قلم بیباک ہے اور انداز فکر اچھوتا۔ اس کی نگاہ اتنی تیز ہے کہ وہ ہزار حجابوں سے گذر کر انسانی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اس فن میں بیدی آپ اپنا جواب ہے۔

بیدی کی دوسری زیر طبع کتابیں (۱) گرہن (۲) دانہ و دام۔

۸- گالی (کہانیوں کا مجموعہ)

از مہندر ناتھ — قیمت :- ڈھائی روپیہ

مہندر ناتھ گالی نہیں بکتا۔ وہ تو بیحد سنجیدہ اور شریف آدمی ہے۔ در اصل یہ وہ گالی ہے جو اس طبقاتی سماج نے انسان اور زندگی کو دی ہے اور مہندر ناتھ ایک سچے فن کار کی حیثیت سے اس گالی کو چھپاتا نہیں بلکہ عام کرتا ہے تاکہ سماج کے اس گھنونے پن کے خلاف انسانی جذبات میں ابال پیدا ہو۔ یہ "چاندی کے تار" اور "نئی بیماری" کے مصنف کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

۹- نراس میں آس (کہانیوں کا مجموعہ)

از صالحہ عابد حسین — قیمت تین روپیہ

جب ہر طرف فرقہ وارانہ فساد کا اندھیر چھایا ہوا تھا۔ اور انسانیت "نراس" ہو رہی تھی۔ اس وقت صالحہ عابد حسین نے "آس" کی خوبصورت کرن دیکھی۔ یہ مجموعہ انھیں چمکدار کرنوں کا ہجوم ہے۔

شعروشاعری

۱- نئی دنیا کو سلام

از سردار جعفری — قیمت :- تین روپیہ

سردار جعفری انسانی عظمت کا شاعر ہے - وہ خوبصورت، شاندار اور بھرپور زندگی کے گیت گاتا ہے - جعفری کی فکر کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر نہیں رہ جاتی - اس کا فن کسی دائرے میں مقید ہو کر نہیں رہ سکتا - اس بار اس نے ادبی دنیا کے سامنے ایک نیا شعری تجربہ، ایک نیا انقلابی تحفہ پیش کیا ہے -

"نئی دنیا کو سلام" میں شاعر نے ہماری نوّے برس کی جنگ آزادی کے سارے جذبات کو سمو دیا ہے - یہ کتاب تاریخ کا نیا تصور، زندگی اور سماج کی نئی تفسیر، انسانی عظمت کا نیا اشارہ، آزادی اور انقلاب کی نئی نوید، سیاست اور آرٹ کا حسین امتزاج ہے - اس میں شاعر کے تخیل نے ان بلندیوں کو چھولیا ہے جو اب تک اچھوتی تھیں -

"نئی دنیا کو سلام" ترقی پسند شاعری کا شباب ہے -

جعفری کی زیر طبع کتابیں (۱) خون کی لکیر - (۲) نئی شاعری کی بنیادیں (۳) ادب اور تہذیب

۲- آخر شب

از کیفی اعظمی — قیمت تین روپیہ

کیفی اعظمی - جدید اردو شاعری کا "سرخ پھول" ہے اور "آخر شب" اس کی تازہ ترین نظموں کا مہکتا ہوا گلدستہ - کیفی کے نغمے شہروں میں، دیہاتوں میں، گلیوں میں اور بازاروں میں گونجے ہیں - ان میں مزدوروں اور کسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں - "آخر شب" میں کیفی نے ڈھلتی ہوئی رات کا کرب اور طلوع ہوتی ہوئی صبح کا نشاط بھر دیا ہے - یہ مجموعہ ترقی پسند شاعری کا جلال و جمال کا آئینہ ہے -

۳- سب رنگ

از اختر الایمان — قیمت ڈیڑھ روپیہ

اختر الایمان اپنے رنگ میں منفرد ہے - یہ طنزیہ منظوم ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ سیاسی اور سماجی زندگی کے لئے ایک تازیانہ ہے - "گرداب" کے شاعر کی یہ دوسری کتاب ہے -

۴- ساز لرزاں

از غلام ربانی تاباں — (زیر طبع)

غلام ربانی تاباں کے نام سے اردو دنیا واقف ہو چکی ہے -

"ساز لرزاں" اس نوخیز شاعر کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے - اس میں درد بھی ہے اور کیف و مستی بھی - وہ شعور بھی ہے جو ایک شاعر کا طرۂ امتیاز ہے اور وہ والہانہ وارفتگی بھی جو آرٹ اور ادب کی جان ہے -

۵۔ فروزاں

از :۔ معین احسن جذبی (زیر طبع)

جذبی کا انتہائی مقبول مجموعۂ کلام کا دوسرا ایڈیشن۔ جو تقریباً ایک درجن نظموں کے اضافے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

علمی اور ادبی کتابیں

۱۔ اسرار الحق مجاز	(نئے ادب کے معمار)	از	عصمت چغتائی	قیمت	پندرہ آنے
۲۔ سعادت حسن منٹو	(نئے ادب کے معمار)	از	کرشن چندر	"	"
۳۔ دیوندر ستیارتھی	(نئے ادب کے معمار)	از	ساحر لدھیانوی	"	"
۴۔ مخدوم محی الدین	(نئے ادب کے معمار)	از	سردار جعفری	"	"
۵۔ ساحر لدھیانوی	(نئے ادب کے معمار)	از	کیفی اعظمی	"	"
۶۔ عصمت چغتائی	(نئے ادب کے معمار)	از	سعادت حسن منٹو	"	"
۷۔ سردار جعفری	(نئے ادب کے معمار)	از	کرشن چندر	"	"
۸۔ کرشن چندر	(نئے ادب کے معمار)	از	خواجہ احمد عباس	"	"
۹۔ کیفی اعظمی	(نئے ادب کے معمار)	از	سردار جعفری	"	"
۱۰۔ احمد ندیم قاسمی	(نئے ادب کے معمار)	از	ساحر لدھیانوی	"	"

۱۱۔ ادب اور سماج (تنقیدی مضامین) از احتشام حسین قیمت چار روپیہ

اردو کے عظیم المرتبت ترقی پسند نقاد احتشام حسین کے شاہکار مضامین کا مجموعہ۔

۱۲۔ شاعر انقلاب

(سوانح اور تنقید) از احتشام حسین (زیر طبع)

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی زندگی اور شاعری کے مختلف دوروں پر سیر حاصل تبصرہ۔ موجودہ دور کے سب سے بڑے شاعر پر یہ پہلی کتاب ہے۔ جو اردو کے سب سے بڑے نقاد نے لکھی ہے۔ متعدد تصویروں اور انتخاب کلام کے ساتھ صاحبان ذوق کے لئے بہترین تحفہ ہے۔

۱۳۔ غالب کی شاعری

از ممتاز حسین (زیر طبع)

ترقی پسند نقادوں میں ممتاز حسین کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اردو کے سب سے بڑے کلاسیکی شاعر غالب کو ترقی پسند انداز سے روشناس کرایا ہے۔

ہمارا کتب خانہ

کتب پبلشرز لمیٹڈ سے آپ کو دوسرے ناشرین کی کتابیں بھی مل سکتی ہیں

۱۔ ایک گرجا ایک خندق	(کہانیاں)	از کرشن چندر	قیمت	ساڑھے تین روپیہ
۲۔ سمندر دور ہے	(کہانیاں)	از کرشن چندر	قیمت	دو روپیہ بارہ آنہ
۳۔ پودے	(رپورتاژ)	از کرشن چندر	قیمت	دو روپیہ
۴۔ پاؤں میں پھول	(کہانیاں)	از احمد عباس	قیمت	ڈھائی روپیہ
۵۔ زادِ راہ	(کہانیاں)	از منشی پریم چند	قیمت	تین روپیہ
۶۔ بیوہ	(ناول)	از منشی پریم چند	قیمت	ڈھائی روپیہ
۷۔ اور انسان مر گیا	(ناول)	از رامانند ساگر	قیمت	چار روپیہ
۸۔ آنکھ مچولی	(کہانیاں)	از شکیلہ اختر	قیمت	ڈھائی روپیہ
۹۔ نئے اور پرانے چراغ	(تنقیدی مضامین)	از آل احمد سرور	قیمت	چار روپیہ
۱۰۔ افادی ادب	(تنقیدی مقالے)	از اختر انصاری	قیمت	سوا روپیہ
۱۱۔ ادب اور انقلاب	(تنقیدی مضامین)	از اختر رائے پوری	قیمت	



وہ سنسنی خیز نام

جو

آج ملک کے لئے عبرت

ہے

کل کے سب سے قابل تحسین

فلمی شاہکار

کا عنوان بن جائے گا

جامنی دیوان

کا

پیش کش





ڈائرکشن

ایم - ایل آنند

میوزک

شیام سندر

گانے اور مکالمے

راجندر کرشن

فوٹو گرافی

چندو

ساونڈ

مکل بوس

کاسٹ

نرگس

کرن دیوان

کلدیپ

پربتا دیوی

بالک رام

گلاب

اوم پرکاش

رندھیر

ریلیز ہونے کا انتظار کیجیے

جامنی دیوان پروڈکشن

ہینس روڈ ، مہالکشمی ، بمبئی

عوامی تھیٹر کی چھٹی کل ہند سالانہ کانفرنس

عوامی تھیٹر کی یہ کانفرنس ۲ سے ۸ فروری تک الہ آباد میں منعقد ہو رہی ہے۔ جس میں بنگال، آسام، آندھرا، احمد آباد، بمبئی، دہلی، مشرقی پنجاب اور دیگر شاخوں سے تین سو سے اوپر نمائندے شرکت کریں گے۔ اس موقعے پر وہ نہ صرف ہندستانی عوام کی زندگی پر مبنی کھیل تماشے، گیت اور رقص ہی پیش کریں گے بلکہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضائے وقت کا جائزہ لینے کے بعد عوامی تھیٹر کی تحریک کے لئے ایک نیا لائحہ عمل بھی مرتب کریں گے۔ عوامی تھیٹر کے دوستوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں مالی امداد کریں۔ اور اپنا اپنا چندہ راما راؤ جنرل سکریٹری عوامی تھیٹر دیو دھر سکول اوف میوزک اوپیرا ہاؤس کے پتے سے ارسال کریں۔









اداکار:-

★ بیگم پارہ
★ مایا بنرجی
★ سنکٹھا پرشاد
★ انصاری
★ آغا
★ مراد

★ گگو
★ موگری
★ پرتما دیوی
★ شیخ مختار
★ شیام
★ منور سلطانہ

عمر خیام فلمس لمیٹڈ

فیمس سائن بلڈنگ، ہینس روڈ، مہالکشمی، بمبئی

اپادھی گون

ستارکار

شانتا آرن ۔ موہن سیگل

کانتی لال ۔ سیما

کیسری ۔ نیام پلی

کہانی
نیام پلی
ناچ
پریم دھون

گانے اور مکالمے
میراجی
میوزک
ملک سردار

اسکرین پلے اور ڈائرکشن :۔ ای سیمین

نیل کمل کلامندر ۔ موشن پکچر پروڈیوسرس اینڈ دسٹری بیوٹرس

سری ساونڈ، ۱۰۔ گوکل داس پستا روڈ ، دادر بمبئی ۱۴

پرنٹر پبلشر خواجہ احمد [illegible] سے شائع کیا